''کہ میری ایک فون کال پر' آدھی رات کو آنا فانا میرے پاس پہنچ جاؤ گے۔''
''بس مجھے نہیں معلوم کیا ہوا؟ آپ نے کہا آجاؤ...... آپ کی آواز سن کر میں فوراً یہاں آ گیا۔''
''اسے جانتے ہو' کیا کہتے ہیں؟'' برکھا نے اس کی طرف ذرا سا جھک کر دیکھا۔
''نہیں جانتا۔''
''اسے محبت کہتے ہیں' تمہیں مجھ سے محبت ہوگئی ہے۔''
''برکھا جی' شاید آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔''
''میں ٹھیک ہی کہتی ہوں' میں کبھی غلط نہیں کہتی۔ چلو گاڑی آگے بڑھاؤ' گاڑی بنگلے کے پیچھے کھڑی کرنی ہے۔'' برکھا نے بڑی ادا سے کہا۔
ساحل عمر نے برکھا کی ہدایت کے مطابق گاڑی بنگلے کے پیچھے جا روکی اور انجن بند کر کے گاڑی سے اتر آیا۔
''ساحل عمر مجھے حیرت ہے کہ تم نے اب تک ورشا کے بارے میں کچھ نہیں پوچھا؟''
''ہاں۔'' ساحل عمر ایک دم چونکا۔ اسے فوراً ورشا یاد آئی۔ ''کہاں ہے ورشا؟''
''ورشا اپنے کمرے میں ہے اور سو رہی ہے۔'' یہ کہہ کر برکھا معنی خیز انداز میں ہنسی۔
ورشا اپنے کمرے میں ضرور تھی' لیکن سو نہیں رہی تھی۔ بارہ بجے کے قریب اس نے اپنے کمرے کی لائٹ بجھا دی تھی اور سونے کی کوشش کر رہی تھی۔ اسے نیند نہیں آ رہی تھی۔ بار بار اس کا دھیان ساحل عمر کی طرف جا رہا تھا۔ وہ یہ بات اچھی طرح جانتی تھی کہ اس کی ماں نے ساحل عمر کو کسی مکڑی کی طرح اپنے جال میں پھنسا لیا تھا۔ اب اس کی ماں کو اس کی ضرورت نہ رہی تھی۔ اسی ادھیڑ بن میں اسے نیند نہیں آ رہی تھی کہ اس نے اپنے دروازے کی کنڈی بند ہونے اور پھر تالا ڈالے جانے کی آواز سنی۔ یہ کام بہت آہستگی سے کیا گیا تھا۔ اگر وہ سو رہی ہوتی تو ہرگز اسے پتا نہ چلتا۔ وہ دم سادھے لیٹی رہی۔ پھر کچھ دیر کے بعد اٹھی۔ اس نے اپنے کمرے کی اندر سے چٹخنی کھولی اور دروازے کو اپنی طرف کھینچا۔ دروازہ نہیں کھلا۔ اس بات کی تصدیق ہوگئی کہ اس کی ماں نے اسے کمرے میں بند کر دیا ہے۔ وہ دوبارہ اپنے بیڈ پر آ گئی اور بڑے کربناک انداز میں سوچنے لگی کہ آج رات اسے کیوں بند کیا گیا ہے۔ اس کی ماں آج کس ''واردات'' میں مصروف ہے؟

☆......☆......☆

ناصر مرزا کا وظیفہ آخری مرحلے میں داخل ہو چکا تھا۔ پانچویں رات تھی۔ ٹارچ کی روشنی میں اس نے دیکھا کہ چار پانچ چمگادڑیں بڑی تیزی سے اس کے سر پر اڑ رہی ہیں۔ ٹارچ کی روشنی پڑتے ہی وہ ایک ایک کر کے دیوار سے ٹکراتیں اور پٹ پٹ کر کے فرش پر آ گرتیں۔ چند لمحوں بعد ان کا وجود عدم وجود ہو گیا۔

ناصر مرزا نے چمگادڑوں کے ہوا میں تحلیل ہونے کے بعد ٹارچ بند کر دی۔ اس کا عمل جاری تھا' اس کی انگلیاں تیزی سے تسبیح کے دانے پھینک رہی تھیں۔ ٹارچ بند ہوتے ہی دوبارہ پروں کی

Urdufans.com

پھڑ پھڑاہٹ شروع ہوگئی۔ اس مرتبہ ناصر مرزا کو احساس ہوا کہ چمگادڑیں تعداد میں بہت زیادہ ہیں۔ کیونکہ پروں کی پھڑ پھڑاہٹ خاصی تیز تھی۔

ناصر مرزا نے فوراً ٹارچ روشن کردی۔ ٹارچ روشن ہوتے ہی کمرے میں روشنی پھیل گئی۔ ناصر مرزا کا اندازہ بالکل صحیح تھا۔ بیشمار چمگادڑیں کمرے میں بھری ہوئی تھیں۔ ناصر مرزا نے بائیں ہاتھ میں چاقو اٹھالیا اور اس کی نوک پر پھونک مار کر چاقو کو اپنے سر پر تیزی سے گھمایا۔ چاقو گھماتے ہی چمگادڑیں اڑتے اڑتے اس طرح غائب ہوگئیں، جیسے کمرے میں تھیں ہی نہیں۔

چمگادڑوں کے غائب ہوتے ہی بدبو پھیل گئی۔ اتنی شدید بدبو تھی کہ اگر ناصر مرزا اپنا سانس نہ روکتا، تو اپنے حواس گم کر بیٹھتا۔ ناصر مرزا کے ہاتھ میں ابھی چاقو موجود تھا۔ اس نے اندھیرے میں مصلے پر جلدی جلدی تین دائرے بنائے۔ وہ بدبو فوراً خوشبو میں تبدیل ہوگئی۔ ناصر مرزا نے پہلے ہلکا سا سانس لیا، جب اس نے محسوس کیا کہ خوشبو پھیل چکی ہے، تو اس نے گہرا سانس لیا۔

اس کے جسم میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ آخری مرحلہ بخیروخوبی گزر چکا تھا۔ تسبیح کے چند دانے رہ گئے تھے۔ بالآخر تسبیح مکمل ہوگئی۔ کمرے میں بہت زبردست خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ یہ عمل کے بخیروخوبی اختتام کی نوید تھی۔

ناصر مرزا خوشی سے جھومتا ہوا اٹھا۔ اس نے سب سے پہلے کمرے کی لائٹ روشن کی، مصلہ سمیٹا، چاقو بند کر کے میز پر رکھا اور ٹارچ اٹھا کر میز کی دراز میں ڈالی۔ پھر اس نے کھڑکیوں سے پردہ ہٹا کر کھڑکیاں کھول دیں۔ باہر گہرا سناٹا چھایا ہوا تھا۔ وہ کھڑکی کے سامنے کھڑا کچھ دیر باہر کا جائزہ لیتا رہا۔ پھر اس نے میز سے چاقو اٹھایا اور اپنے بیڈروم میں جانے کے بارے میں سوچنے لگا۔

☆......☆......☆

رات کے تین بجے تھے۔

برکھا کا بنگلہ وحشت ناک تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا، جیسے بنگلے کے گرد بھوت رقص کر رہے ہوں۔ چڑیلیں ادھر ادھر گھوم رہی ہوں۔ اس بنگلے کی طرف دیکھتے ہی خوف کی لہر دل میں اٹھتی تھی۔

برکھا اپنے بیڈروم میں بے چینی سے ٹہل رہی تھی۔ بار بار اس کی نظر گھڑی پر جا رہی تھی۔ تین بج چکے تھے۔ اب کسی بھی وقت ایک مخصوص آواز سنائی دینے والی تھی۔

تبھی کتے کے رونے کی بھیانک آواز سنائی دینے لگی۔ یہ آواز ایک خاص وقفے سے تین بار سنائی دی۔ برکھا فوراً اپنے بیڈروم سے نکل کر باہر گیٹ پر پہنچی۔ اس نے گیٹ کے اندر سے ہی پوچھا "یہ تم ہو؟"

"جی برکھا جی۔" فوراً ہی باہر سے آواز آئی۔ واسم گیٹ سے لگا کھڑا تھا۔

واسم کی آواز پہچان کر برکھا نے فوراً گیٹ کھول دیا اور واسم سے کہا "آؤ!"

واسم خاموشی سے اس کے پیچھے چل دیا۔

"واسم!" برکھا نے پلٹ کر کہا۔

Urdufans.com

بڑھ کر اس کے برابر چلنے لگا۔

''برکھا جی!'' واسم فوراً دو قدم آگے بڑھ کر اس کے برابر چلنے لگا۔

''جو کچھ میں نے تمہیں بتایا ہے' وہ تم نے اچھی طرح سمجھ لیا ہے ناں؟''

''جی برکھا جی۔'' واسم نے فرمانبرداری سے کہا۔

''ایک بار پھر تنبیہ کر رہی ہوں' اتنا جان لو کہ ساحل میری زندگی کا سرمایہ ہے۔ اس سلسلے میں تمہاری ذرا سی بھی کوتاہی مجھے تباہ کر سکتی ہے۔ تم جانتے ہو کہ اگر میں تباہ ہوئی تو پھر میرے ہاتھوں کوئی بھی نہ بچے گا۔'' برکھا نے یہ بات انتہائی سنگین لہجے میں کہی۔

''میں یہ بات اچھی طرح سمجھتا ہوں' برکھا جی...... آپ بے فکر رہیں۔ مجھ سے اس سلسلے میں کوئی کوتاہی نہیں ہوگی۔'' واسم نے بڑے اعتماد سے کہا۔ ''میں آپ کے سرمائے کی اپنی جان پر کھیل کر حفاظت کروں گا۔''

''شاباش! مجھے تم سے یہی امید ہے۔'' برکھا نے خوش ہو کر کہا۔

بیڈروم کے دروازے پر پہنچ کر برکھا نے دھیرے سے کواڑ کھولے اور پیچھے مڑ کر واسم سے مخاطب ہوئی۔ ''آ جاؤ!''

واسم نے اپنے جوتے اتارے اور پھر بڑے احترام سے اندر داخل ہوا' جیسے بیڈروم میں نہیں' کسی مندر میں داخل ہو رہا ہو۔ سامنے بیڈروم پر ساحل عمر لیٹا ہوا تھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور وہ لمبے لمبے سانس لے رہا تھا۔ اس کے چہرے پر مردنی چھائی ہوئی تھی۔ رنگ زرد تھا اور ہاتھ پاؤں ڈھیلے پڑے ہوئے تھے۔

واسم نے گردن میں ہاتھ ڈال کر ساحل کو اٹھایا' تو اس نے آنکھیں کھول دیں۔ لیکن نقاہت اتنی تھی کہ آنکھیں زیادہ دیر کھلی نہ رہ سکیں۔ وہ اپنے ہوش و حواس میں نہ تھا۔

''سر! کھڑے ہو جائیے' میں آپ کو لینے آیا ہوں۔'' واسم نے اسے سہارا دے کر اٹھاتے ہوئے کہا۔ ساحل عمر نے کھڑے ہونے کی کوشش کرتے ہوئے ایک مرتبہ پھر آنکھیں کھول کر دیکھا اور لڑکھڑاتی زبان میں بولا ''تم کون ہو' بھائی؟''

''سر! میں آپ کا داس ہوں۔ خادم ہوں۔ سرونٹ ہوں۔'' واسم نے بڑے مؤدبانہ انداز میں کہا۔ پھر دھیرے سے بولا ''سر! آپ نے اتنی کیوں پی لی؟''

''ارے بھائی' برکھا نے پلائی ہے۔ اس نے پلائی' ہم نے پی لی۔ اس کے ہاتھوں سے تو زہر بھی پیا جا سکتا ہے۔'' ساحل عمر نے لڑکھڑاتے قدموں سے چلتے ہوئے نشیلے لہجے میں کہا۔

''سر! آپ بہت اچھے آدمی ہیں...... برکھا جی آپ سے بہت خوش ہیں۔''

''معلوم نہیں' وہ ہم سے خوش ہے یا ناراض...... لیکن ہم اس سے بہت خوش ہیں۔ وہ چڑھتی ندی ہے سب کچھ اپنے ساتھ بہا لے جانے والی۔'' پھر چلتے چلتے ایک دم جیسے اسے ہوش آیا۔ اس نے اپنی آنکھوں کو بمشکل کھولا اور پھر بولا ''برکھا ہے کہاں؟''

''میں تمہارے پاس ہوں ساحل' میں بھلا کہاں جاؤں گی؟'' یہ کہہ کر برکھا نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

Urdufans.com

پھر دونوں نے مل کر سڑک پر کھڑی گاڑی میں بٹھایا۔ برکھا نے واسم کو ایک چھوٹی سی شیشی دی، جس میں سرخ رنگ کا پانی تھا۔ واسم نے وہ شیشی ڈیش بورڈ میں احتیاط سے رکھ دی۔

''اس پانی کے دو قطرے بہت ہوں گے۔'' برکھا نے اسے بتایا۔

''ٹھیک ہے۔'' اس نے ہدایت نوٹ کرلی۔

''بس پھر جاؤ۔'' برکھا نے گاڑی کا دروازہ بند کرتے ہوئے کہا' اس کے بعد وہ گھوم کر دوسری کھڑکی کی طرف آئی۔ ساحل آنکھیں بند کیے بیٹھا تھا۔

''اچھا! ساحل تم چلو' میں آتی ہوں...... دیکھو پریشان مت ہونا۔'' برکھا نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔

ساحل عمر نے بمشکل اپنی بند آنکھیں کھولیں۔ اسے دیکھ کر مسکرایا اور پھر فوراً ہی اس کی آنکھیں بند ہوگئیں۔ اس پر نشے کی سی کیفیت طاری تھی۔

پھر واسم نے گاڑی سٹارٹ کی اور اسے تیزی سے نکال لے گیا۔

گاڑی کی لال بتی جب دکھائی دینا بند ہوگئی' تو برکھا نے سکون کا سانس لیا اور گیٹ بند کرکے اپنے بیڈروم کی طرف بڑھنے لگی۔

☆......☆

صبح کا وقت تھا۔ ناصر مرزا رات کو سکون بھری نیند سویا تھا۔ صبح نہا دھو کر گھر سے نکلا تھا۔ اب اس کا رخ ماڈل کالونی کی طرف تھا۔ حافظ موسیٰ نے پانچ دن بعد اسے اپنے پاس بلایا تھا۔ وظیفہ مکمل کرنے کے ساتھ یہ ہدایت بھی کی تھی کہ ساحل عمر کو ہمراہ لانا' اسے دیکھنا چاہتا ہوں۔

ناصر مرزا کو یہ ہدایت یاد تھی۔ اس نے ماڈل کالونی کا رخ کرنے سے پہلے ساحل عمر کو فون کیا۔ ایک تو وہ اسے وظیفے کی کامیابی کی خبر سنانا چاہتا تھا۔ دوسرے وہ اسے حافظ موسیٰ خان سے ملانا چاہتا تھا۔

اماں نے فون اٹھایا۔ ناصر مرزا نے اماں کی خیریت دریافت کرکے ساحل عمر کے بارے میں پوچھنا چاہا' تو اماں کی گھبراہٹ بھری آواز سنائی دی۔ ''ناصر! خیریت نہیں ہے۔''

''کیا ہوا اماں؟'' وہ پریشان ہوکر بولا۔

''ساحل رات سے غائب ہے۔'' انہوں نے بتایا۔

''غائب ہے؟'' ناصر مرزا حیران ہوکر بولا ''اس بات کا کیا مطلب ہے؟''

''وہ رات کو بارہ بجے کے قریب اچانک کہیں اٹھ کر چلا گیا۔'' اماں گویا ہوئیں۔

''آپ کو بتائے بغیر؟'' ناصر مرزا نے سوال کیا۔

''مجھے بتانا تو دور کی بات ہے' وہ گاڑی میں بیٹھا اور گھر کا گیٹ بھی کھلا چھوڑ گیا۔''

''ہیں!'' ناصر مرزا پریشان ہوا۔ ''اتنی کیا ایمرجنسی تھی۔ بعد میں اس کا کوئی فون وون بھی نہیں آیا؟''

''ابھی تک تو نہیں آیا۔'' وہ تشویش بھرے لہجے میں بولیں۔ ''میرے ساحل کو ضرور کچھ ہوگیا

Urdufans.com

ہے۔ اس پر کسی نے جادو کروا دیا ہے۔ وہ ایسا تو کبھی نہ تھا۔ چند دنوں میں اس کی حالت ہی بدل گئی

"اچھا' اماں آپ پریشان نہ ہوں۔ اس وقت میں ماڈل کالونی جا رہا ہوں۔ ضروری کام ہے۔ وہاں سے واپسی پر آپ کی طرف آتا ہوں۔ ساحل کہیں نہیں جائے گا۔ ہو سکتا ہے وہ میرے آنے سے پہلے ہی گھر پہنچ جائے۔" ناصر مرزا نے تسلی دی۔

"اللہ کرے ایسا ہی ہو۔" اماں کے دل سے دعا نکلی۔

ساحل عمر کے اس طرح اچانک چلے جانے کی وجہ سے ناصر مرزا خاصا پریشان ہو گیا تھا۔ دو دن پہلے ساحل کی جو حالت ناصر نے دیکھی' اس سے بخوبی اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ ان جادوگر ماں بیٹی کے پھیر میں آ گیا ہے۔ لیکن ناصر مرزا کو یہ پتا نہ تھا کہ ان جادوگرنیوں کے اثرات اتنے گہرے ہو گئے ہیں کہ وہ بغیر بتائے دیوانوں کی طرح سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر نصف رات کو اس طرح نکل جائے گا۔

آخر اس پر ایسی کیا بیتی کہ وہ نصف رات کو گھر سے نکلنے پر مجبور ہو گیا۔

آخر وہ کہاں گیا؟

اس طرح کے سوالات اس کے دماغ میں چکراتے رہے۔ وہ اس مسئلے کے ہر پہلو پر غور کرتا رہا۔ یہاں تک کہ حافظ موسیٰ خان کا گھر آ گیا۔

ناصر مرزا نے اپنی گاڑی ان کے گھر کے سائے میں کھڑی کر کے بیل کا بٹن دبایا۔ کچھ دیر کے بعد وہی پندرہ سولہ سال کا لڑکا گیٹ پر آیا۔ اس نے ناصر مرزا کو دیکھ کر بڑے مہذبانہ انداز میں کہا

"جی فرمایئے؟"

"مجھے حافظ صاحب سے ملنا ہے۔ انہوں نے مجھے آج کے دن بلایا تھا' میرا نام ناصر مرزا ہے۔" ناصر مرزا نے اپنے بارے میں تمام معلومات ایک ہی جملے میں فراہم کر دیں۔

"آیئے!" اس لڑکے نے راستہ چھوڑتے ہوئے اندر آنے کا اشارہ کیا۔ ناصر مرزا گیٹ میں داخل ہو کر رک گیا۔ لڑکا جب گیٹ بند کر کے پلٹا' تو اس نے ناصر مرزا کو اپنا منتظر پایا۔

"تشریف لے جایئے۔" اس نے مکان کے پچھلے حصے کی طرف اشارہ کیا۔ "وہ وہیں ہیں۔ دروازہ کھٹکھٹا کر اپنا نام بتایئے گا' تو دروازہ کھل جائے گا۔" یہ کہہ کر وہ لڑکا مکان کے اندر چلا گیا اور ناصر مرزا پختہ راستے پر چلتا ہوا بند دروازے کے سامنے آ پہنچا۔ اس نے دروازے پر ہاتھ سے دستک دی۔

"کون ہے بھائی؟" اندر سے ایک کڑک دار آواز سنائی دی۔

"میں ہوں جی ناصر مرزا۔"

"تو بھائی اندر آ جاؤ' دروازہ کھلا ہے۔" اندر سے پھر آواز آئی۔

ناصر مرزا نے دروازے کو آہستہ سے دھکا دیا' تو کواڑ کھل گئے۔ وہ اندر داخل ہوا۔ سامنے درخت کے نیچے کھری چارپائی پر موٹی لاٹھی ہاتھ میں تھامے حافظ موسیٰ خان تشریف فرما تھے۔ وہ گویا ہوئے "بھائی دروازے کی کنڈی چڑھا کر آنا۔"

ناصر مرزا نے فوراً دروازہ بند کردیا اور ان کے نزدیک پہنچ کر سلام کیا۔ انہوں نے سلام کا جواب دیا اور اپنے برابر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ ناصر مرزا خاموشی سے ان کی پالتی کی جانب بیٹھ گیا۔

حافظ موسیٰ نے دونوں ہاتھوں سے لاٹھی پکڑ کر گردن جھکا لی۔ یوں لگا جیسے وہ مراقبے میں چلے گئے ہوں۔ کچھ دیر کے بعد انہوں نے سر اٹھایا اور گویا ہوئے:

''اکیلے آئے ہو' وہ لڑکا کہاں ہے؟ کیا نام ہے اس کا؟''

''ساحل عمر۔'' ناصر مرزا نے فوراً بتایا۔

''میں اسے نہیں لاسکا۔''

''تم اسے لا نہیں سکے یا وہ تمہارے ہاتھ سے نکل گیا؟'' حافظ موسیٰ نے سوال کیا۔

''وہ گھر میں نہیں تھا' میں کیسے لاتا...... رات سے غائب ہے۔''

''بھائی' یہ اچھا نہیں ہوا۔'' محافظ موسیٰ نے کہا۔ ''خیر تم اپنی سناؤ؟''

''میں نے اپنا کام کرلیا ہے۔ آپ کی ہدایت کے مطابق۔''

''لاؤ چاقو کہاں ہے؟ اس پر مہر لگا دوں۔'' حافظ موسیٰ گویا ہوئے۔

ناصر مرزا نے جیب سے چاقو نکال کر ان کے ہاتھ میں دینا چاہا۔

''ابھی اپنے ہاتھ میں رکھو۔'' حافظ موسیٰ نے کہا۔ پھر انہوں نے اپنی لاٹھی سے زمین پر ایک دائرہ بنایا اور ناصر مرزا سے مخاطب ہوکر بولے ''اس دائرے میں چاقو گاڑ دو۔''

ناصر مرزا فوراً نیچے بیٹھ گیا اور چاقو کھول کر گھاس لگی زمین پر دائرے کے درمیان اس چاقو کو گاڑ دیا۔ حافظ موسیٰ نے اپنی لاٹھی اس چاقو کے ہتھے پر رکھ دی۔ پھر انہوں نے کچھ پڑھتے ہوئے اپنی لاٹھی چاقو پر آہستہ آہستہ مارنا شروع کی۔ چاقو لاٹھی کی ہلکی ضربوں سے مزید زمین میں دھنسنے لگا۔ یہاں تک کہ چاقو کا پھل بالکل غائب ہوگیا۔ تب حافظ موسیٰ نے لاٹھی کی آخری ضرب لگائی اور پھر اپنے مخصوص انداز میں لاٹھی کو دونوں ہاتھوں میں تھام کر گردن جھکا لی اور گردن جھکائے جھکائے بولے ''چاقو باہر نکال لو۔''

ناصر مرزا نے فوراً زمین سے چاقو نکال لیا اور بولا ''چاقو نکال لیا۔'' جی!!

''اس کی نوک پر کیا لگا ہے؟''

''ارے' اس کی نوک تو سنہری ہوگئی ہے۔'' ناصر مرزا نے چاقو کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''مبارک ہو' تمہاری محنت رائیگاں نہیں گئی۔ اسے آنکھیں مل گئی ہیں۔''

''حافظ صاحب' میں سمجھا نہیں؟''

''ارے بھائی' یہ میرے جیسا اندھا نہیں رہا۔''

ناصر مرزا کی سمجھ میں بات اب بھی نہ آئی' لیکن اس نے مزید سوال کرنا مناسب نہ سمجھا۔

''یہ چاقو تمہارے بہت کام آئے گا۔ بس اس کی حفاظت کرنا۔''

''جی اچھا!'' ناصر مرزا نے کہا۔ پھر چند لمحے توقف کرکے بولا ''مجھے اپنے دوست کی بہت فکر ہے۔''

"ساحل عمر کی بات کر رہے ہو۔"

"جی!"

"اسے ڈھونڈو...... تلاش کرو۔" حافظ موسیٰ نے کہا۔ "اب جاؤ۔" یہ کہہ کر انہوں نے پھر دونوں ہاتھوں سے لاٹھی پکڑ لی اور اپنی گردن جھکالی۔

ناصر مرزا کچھ دیر بیٹھا رہا۔ وہ ان سے سوال کرنا چاہتا تھا کہ کہاں تلاش کروں؟ مگر وہ یہ سوال باوجود کوشش کے نہ کرپایا۔ حافظ موسیٰ نے بھی سر نہ اٹھایا۔ بالآخر اسے وہاں سے اٹھنا پڑا۔

☆......☆......☆

وہ دونوں ساحل عمر کے گھر میں سر جوڑے بیٹھے تھے۔ ناصر مرزا نے مسعود آفاقی کو تمام صورتحال سے آگاہ کردیا تھا۔ وہ باتیں، جو مسعود آفاقی کے علم میں نہیں تھیں، وہ بھی اس نے بتا دی تھیں۔ دونوں کا ذہن بار بار ورشا اور برکھا کی طرف جا رہا تھا۔ انہیں یقین تھا کہ ساحل عمر ورشا کے گھر کی طرف گیا ہے۔ اس کے علاوہ وہ کہیں نہیں جاسکتا تھا۔ اگر جاتا تو اب تک پلٹ کر آ گیا ہوتا۔ ان کا خیال تھا کہ وہ ورشا کے گھر جا کر کسی مصیبت کا شکار ہوگیا ہے۔

اب مسئلہ یہ تھا کہ ورشا کے گھر جا کر اسے کس طرح چیک کیا جائے۔ دونوں میں سے کسی نے ورشا کا گھر نہیں دیکھا تھا۔ وہ اسی ادھیڑ بن میں تھے کہ ورشا کا گھر کس طرح معلوم کیا جائے کہ مسعود کے ذہن میں ایک ترکیب آئی۔ وہ بولا:

"اگر ورشا کا ٹیلی فون نمبر معلوم ہوجائے، تو پھر اس کا پتا معلوم کرنے کی کوشش کی جاسکتی ہے۔"

اماں نے صبح سے رو رو کر برا حال کر رکھا تھا۔ اب بھی وہ بیٹھی رو رہی تھیں۔ ٹیلی فون نمبر کا ذکر سنا تو انہوں نے فوراً دوپٹے سے آنسو پونچھے اور ساحل عمر کی ڈائری اٹھالائیں، جس میں اس نے ٹیلی فون نمبر لکھے ہوئے تھے۔

مسعود آفاقی نے جلدی جلدی اس ڈائری کے ورق اُلٹے۔ بالآخر ایک جگہ اسے ورشا کا ٹیلی فون نمبر لکھا نظر آ گیا۔ مسعود آفاقی کا ایک دوست ٹیلی فون کے محکمے میں ڈی ای لگا ہوا تھا۔ اس نے ٹیلی فون کرکے اپنا مسئلہ بتایا۔ اس نے جواب میں کہا "پانچ منٹ انتظار کرو۔"

پانچ منٹ کے بعد جب گھنٹی بجی، تو وہ ٹیلی فون کی نہ تھی بلکہ گھر کی تھی۔

اماں فوراً گیٹ کی طرف بھاگیں۔ ناصر مرزا اور مسعود آفاقی بھی ان کے پیچھے چلے۔

اماں نے جلدی سے گیٹ کھولا۔

گیٹ پر جو شخص کھڑا تھا، اس سے وہ دونوں واقف نہ تھے، لیکن اماں اسے پہچانتی تھیں۔

☆......☆......☆

وہ بازغر تھا۔

وہ کچھ عرصہ پہلے ساحل عمر سے ملنے آیا تھا۔ اماں نے اسے ڈرائنگ روم میں بٹھا کر سوتے ہوئے ساحل کو اٹھایا تھا۔ وہ ساحل سے ایک چیتے کی تصویر بنوانے آیا تھا۔ ساتھ ہی وہ رشا ملوک کی

تصویر بھی خریدنا چاہتا تھا۔ ساحل عمر نے اس تصویر کو فروخت کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ وہ جاتے ہوئے اپنا ٹیلی فون نمبر دے گیا تھا کہ جھکال کی تصویر مکمل ہونے پر اسے اطلاع دے دی جائے لیکن ساحل عمر تصویر مکمل کرنے کے بعد اسے اطلاع نہیں دے سکا تھا' کیونکہ پنسل سے لکھا ہوا نمبر کسی طرح مٹ گیا تھا۔ بعد میں وہ تصویر بھی نہ رہی تھی۔

آج وہ آیا تھا تو گھر میں جھکال کی تصویر تھی نہ وہ مصور تھا جس نے جھکال کی تصویر بنائی تھی۔

بازغر کا حلیہ وہی تھا۔ پہاڑی نقوش اور سر پر لگی ٹوپی۔

''جی فرمائیے!'' ناصر مرزا اس سے مخاطب ہوا۔

بازغر نے کوئی جواب دینے کے بجائے گھر کی جانب قدم بڑھائے۔ ناصر مرزا نے یہ سوچ کر کہ شاید یہ شخص گیٹ پر کھڑے رہ کر بات نہیں کرنا چاہتا' اس لیے اس نے اسے اندر جانے کا راستہ دے دیا۔ راستہ ملتے ہی وہ ایک لمحے کے لیے بھی وہاں نہیں رکا۔

ناصر مرزا اور مسعود آفاقی ''جی فرمائیے...... کیا کام ہے؟ کس سے ملنا ہے؟'' پوچھتے رہ گئے۔ وہ بہت تیزی سے آگے بڑھا۔ اتنی تیزی سے کہ ان تینوں کو حیرت ہوئی۔ وہ اس کے پیچھے چلے اتنی دیر میں وہ گھر میں داخل ہو گیا۔

''ارے۔'' مسعود آفاقی حیران ہو کر اس کے پیچھے دوڑا۔ ناصر مرزا بھی بھاگا۔ ان دونوں کے پیچھے اماں بھی لپکیں۔

''یار' یہ عجیب شخص ہے' اپنے ابا کا گھر سمجھ کر اندر داخل ہو گیا۔'' مسعود آفاقی نے غصے میں کہا۔

پھر ان دونوں نے پورا گھر چھان مارا' لیکن وہ اندر آنے والا شخص انہیں کہیں نہیں دکھائی دیا۔ گھر کا اسٹور حتیٰ کہ واش روم تک دیکھ لیے گئے۔ اس گھر کا ایک دروازہ پچھلے حصے کی طرف کھلتا تھا اسے چیک کیا گیا' وہ لاک تھا۔ کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ وہ شخص گھر میں داخل ہونے کے بعد کدھر سے نکل گیا جبکہ وہ دونوں' اس کے گھر میں داخل ہونے کے فوراً بعد اندر آ گئے تھے۔ چند لمحوں بعد اماں بھی ہانپتی کانپتی گھر میں داخل ہو گئی تھیں۔

گھر کی اچھی طرح تلاشی لینے کے بعد گھر کے باہر بھی اگلے پچھلے دونوں حصوں میں اسے تلاش کر لیا گیا لیکن وہ کہیں نظر نہ آیا۔

جب یہ تینوں اس کے پیچھے بھاگے تو گیٹ کھلا ہوا چھوڑ آئے تھے' لیکن اس وقت وہ گیٹ بند تھا۔ باقاعدہ اندر سے کنڈی تو نہ لگی تھی لیکن گیٹ کے دونوں پٹ اس طرح بند تھے کہ دور سے دیکھنے میں ہی احساس ہوتا تھا کہ گیٹ اندر سے بند ہے۔

کیا وہ شخص اندر جانے کے بعد فوراً ہی باہر آ گیا تھا اور باہر آ کر پورے اطمینان سے گیٹ سے نکل گیا تھا اور جاتے جاتے کھلے گیٹ کو بند کر گیا تھا۔

سوال یہ تھا کہ وہ گھر میں کیا کرنے کے لیے داخل ہوا تھا۔

اس سوال کا جواب بھی بہت آسان تھا لیکن ان کے لیے مشکل اس لیے تھا کہ وہ اس بات کی توقع نہ رکھتے تھے کہ ایسا بھی ہو سکتا ہے' وہ شخص محض اس کام کے لیے گھر میں داخل ہوا تھا؟

یہ چوری اماں نے پکڑی تھی۔ جب گھر میں داخل ہونے والے شخص کی تلاشی جاری تھی تو اماں کی ایک دم نظر خالی دیوار پر پڑی تھی۔ ان کا دل دھک سے ہو کر رہ گیا تھا۔

ساحل عمر کے بیڈروم کی وہ دیوار جس پر رشالوک کی تصویر سجی تھی' خالی تھی۔

رشالوک کی تصویر غائب تھی۔ بازغر وہ تصویر لے گیا تھا۔ اسے آتے ہوئے تو سب نے دیکھا تھا' وہ جاتے ہوئے سب کی آنکھوں میں دھول جھونک گیا تھا۔ اس نے کوئی ایسا عمل کیا تھا کہ وہ ان کی آنکھوں کے سامنے سے گزرنے کے باوجود کسی کو نظر نہ آیا تھا۔

وہ تینوں حیران تھے کہ یہ سب کیسے ہوا؟ ان تینوں میں سب سے زیادہ پریشان ناصر مرزا تھا۔ اس کی تو عقل میں ہی نہیں سما رہی تھی یہ بات...... بازغر کے بارے میں اماں کے تفصیل سے بتانے پر یہ بات تو سمجھ میں آ رہی تھی کہ وہ رشالوک کی تصویر کیوں اٹھا کر لے گیا۔ اس کا رشالوک سے تعلق بنتا تھا لیکن یہ بات اس کے گلے سے نہیں اتر رہی تھی کہ وہ انسان نہیں' کوئی اور مخلوق تھا۔

ابھی وہ تینوں بیٹھے اس کے بارے میں باتیں کر رہے تھے جس کے علم میں جتنی بات تھی' وہ سامنے لا رہا تھا اتنے میں ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔

ناصر مرزا نے مسعود آفاقی کو اشارہ کیا "ریسیور اٹھاؤ۔"

اس کا خیال تھا کہ یہ ٹیلی فون مسعود کے دوست کا ہو گا۔ اس کا یہ اندازہ درست ثابت ہوا' ادھر سے وہی بول رہا تھا۔

"ہاں' مسعود تم نے جو ابھی ٹیلی فون نمبر دیا تھا' اس کا ایڈریس لکھ لو۔"

"ایک منٹ یار۔" مسعود آفاقی نے اماں کو کاغذ پنسل لانے کا اشارہ کیا۔ اماں ایک سادہ کاغذ اور بال پوائنٹ ساحل عمر کی میز پر سے اٹھا لائیں۔

ادھر سے ایڈریس لکھوایا گیا۔ پھر اس نے کہا: "مسعود! یہ ٹیلی فون کسی مناف نامی شخص کا ہے۔ ظاہر ہے مناف اس کے باپ کا نام ہو گا تمہارا بہت شکریہ یار' تم نے ہمارا ایک بڑا مسئلہ حل کر دیا۔"

یہ کہہ کر مسعود آفاقی نے ریسیور رکھ دیا اور جو ایڈریس اس نے کاغذ پر اتارا تھا' وہ ناصر مرزا کے سامنے رکھ دیا۔

"گارڈن ایسٹ۔" ناصر مرزا نے پتے پر ایک نظر ڈال کر کہا۔ "پتہ تو زیادہ مشکل نہیں ہے۔ آسانی سے پہنچا جا سکتا ہے۔"

"کیا کرنا چاہتے ہو؟"

"ورشا کے بنگلے پر چل کر دیکھنا ہو گا۔"

"تمہارا کیا خیال ہے کہ اس طرح وہ اسے ہمارے سامنے کر دے گی۔"

"اس سے مل کر یہ اندازہ تو ہو جائے گا کہ آیا وہ اس کے بنگلے پر گیا ہے یا نہیں۔ ورشا اگر

گھر پر ہوگی تو اس سے کچھ نہ کچھ آئیڈیا ضرور ہو جائے گا۔"

"یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ ساحل عمر اس کے گھر میں موجود ہو اور وہ جھوٹ بول دے۔"

"ہاں' ایسا بھی ہو سکتا ہے لیکن میں اس کے گھر جا کر اس سے بات ضرور کرنا چاہتا ہوں۔ اس سے ملنے کے بعد ہی آگے کا لائحہ عمل طے کیا جا سکتا ہے۔"

"ہم اس سلسلے میں پولیس سے مدد کیوں نہیں لیتے؟"

مسعود آفاقی نے رائے دی۔ تمہارے وہاں تعلقات بھی ہیں۔"

"پولیس کیا کرے گی؟" ناصر مرزا بیزاری سے بولا۔

"تعلقات کے باوجود میری بھتیجی کا قاتل آج تک نہیں پکڑا گیا۔ عابد منجم کے قتل کا کوئی سراغ نہیں ملا۔ ساحل عمر کے سلسلے میں وہ کیا کرے گی۔ ابھی تو صورت حال بھی واضح نہیں ہے۔ وہ خود گھر سے گیا ہے۔ ہم پولیس سے کیا کہیں گے' کس کے نام ایف آئی آر میں درج کرائیں گے۔ ابھی میں پولیس کو درمیان میں نہیں لانا چاہتا۔ خود ہی کچھ کرنا ہوگا۔" ناصر مرزا نے سمجھایا۔

"چلو پھر اٹھو' چلتے ہیں۔" مسعود آفاقی اچانک اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

"ارے' ابھی کہاں جا رہے ہو' دوپہر کا کھانا کھا کر جانا۔"

"نہیں اماں کھانے کا تکلف نہ کریں۔ ہم لوگ چلتے ہیں۔ آپ پریشان نہ ہوں۔ تسلی رکھیں۔ انشاء اللہ جلد ہی ساحل عمر مل جائے گا۔"

"اللہ کرے ایسا ہی ہو۔" اماں کے دل سے دعا نکلی۔

تب وہ دونوں اٹھ کر گھر سے باہر نکل آئے اور اپنی اپنی گاڑیوں میں بیٹھ کر آگے پیچھے چل دیئے۔

گارڈن ایسٹ کا علاقہ ناصر مرزا کا دیکھا ہوا تھا۔ اسے ورشا کا بنگلہ تلاش کرنے میں کوئی دقت نہ ہوئی۔ جب وہ دونوں اپنی اپنی گاڑیاں بنگلے کی دیوار کے ساتھ لگا کر گیٹ کی طرف بڑھے تو ناصر مرزا نے اس بنگلے پر ایک نظر ڈال کر کہا۔ "مسعود اس بنگلے پر تو وحشت برس رہی ہے۔"

"صحیح کہہ رہے ہو' واقعی کوئی بھوت بنگلہ محسوس ہو رہا ہے۔" مسعود آفاقی نے تائید کی۔

بنگلے کی کال بیل دبا کر وہ دونوں گیٹ سے ذرا پیچھے کھڑے ہو گئے۔

تھوڑی دیر کے بعد انہیں گیٹ کے پیچھے آہٹ محسوس ہوئی۔ گیٹ کے درمیان خلاء میں ایک آنکھ نظر آئی۔ پھر وہ آنکھ فوراً ہی غائب ہو گئی اور آنے والا واپس چلا گیا۔ اگر ان دونوں میں سے کوئی اخلاقیات کو پرے رکھ کر آگے بڑھ کر گیٹ کے درمیان سے جھانک لیتا تو اسے اندازہ ہو جاتا کہ آنے والا' آنے والا نہ تھا' آنے والی تھی اور یہ آنے والی برکھا کے سوا کوئی نہ تھی۔

اس نے گیٹ پر کھڑے دونوں بندوں کو صاف دیکھ لیا تھا۔ ایک کو اس نے پہچان بھی لیا تھا۔ وہ ناصر مرزا تھا۔ دوسرے شخص کے بارے میں اس نے اندازہ لگا لیا تھا کہ وہ ساحل عمر کا کوئی گہرا دوست ہوگا۔ وہ ان دونوں کے سامنے جانا نہیں چاہتی تھی۔ ابھی وہ کچھ دیر ورشا کی آڑ لینا چاہتی تھی۔ اسے امید تھی کہ ورشا ان دونوں کو اچھی طرح نپٹ کر لے گی۔

تھوڑی دیر کے بعد پھر کوئی گیٹ پر محسوس ہوا۔ اس نے بھی گیٹ سے باہر جھانکا اور پھر ذرا ساہٹ کر مترنم لہجے میں سوال کیا۔ ''آپ کون؟''

''ہم دونوں ساحل عمر کے دوست ہیں۔ ہمیں ورشا صاحبہ سے ملنا تھا۔'' ناصر مرزا نے آگے بڑھ کر کہا۔

''ایک منٹ۔'' ادھر سے آواز آئی۔ پھر چند لمحوں بعد ہی گیٹ کھل گیا۔ ورشا گیٹ سے تھوڑا سا باہر آئی اور بڑے مودبانہ انداز میں بولی۔ ''جی فرمایئے! میرا نام ورشا ہے۔''

ناصر مرزا نے برکھا کو تو دیکھا تھا لیکن ابھی تک اس کا ورشا سے سامنا نہیں ہوا تھا۔ مسعود آفاقی نے تو برکھا کو بھی نہیں دیکھا تھا۔

اب دونوں نے ایک ساتھ ورشا کو دیکھا تو دیکھتے رہ گئے۔

وہ زرد رنگ کی ساڑھی باندھے ہوئے تھی۔ بغیر آستین کا سرخ بلاؤز' کھلے ہوئے بال' شاید وہ کچھ دیر قبل نہائی تھی۔ اس کا چہرہ بے حد فریش تھا۔ آنکھوں میں بے پناہ کشش۔ ہونٹوں پر دل لبھانے والی مسکراہٹ...... وہ ایک قیامت تھی۔ اس لڑکی کے لیے اگر ساحل عمر گھر سے دیوانہ وار نکلا ہے تو ٹھیک ہی نکلا ہے۔ مسعود آفاقی نے اپنے دل میں سوچا اور ایک ٹھنڈا سانس لے کر ناصر مرزا کی طرف دیکھا۔

''یہاں ساحل عمر صاحب تو نہیں ہیں۔'' ناصر مرزا' نے ہچکچاتے ہوئے سوال کیا۔ ''میرا مطلب ہے یہاں آئے تو نہیں؟''

''ساحل عمر صاحب!'' اس نے اپنی مترنم آواز میں دہرایا۔ پھر بے نیازانہ انداز میں بولی۔ ''کیا انہوں نے یہاں آنے کو کہا تھا۔''

''وہ آدھی رات سے گھر سے نکلے ہوئے ہیں۔ کچھ بتا کر نہیں گئے کہ کہاں جارہے ہیں۔ بعد میں فون وغیرہ بھی نہیں کیا۔ ہم لوگ پریشان ہیں۔ ان کی اماں کا برا حال ہے......''

''اماں کا......؟ اچھا ان کی نوکرانی۔'' ورشا نے بات کاٹ کر سوال کیا اور پھر خود ہی جواب دے دیا۔

''ہم انہیں صبح سے ڈھونڈتے پھر رہے ہیں۔ کئی جگہ جا چکے ہیں۔ سوچا آپ سے بھی معلوم کرتے چلیں۔''

''آپ نے ناحق زحمت کی۔ یہ بات تو آپ ٹیلی فون کر کے بھی معلوم کر سکتے تھے۔'' ورشا نے یہ کہہ کر دونوں کو بغور دیکھا۔ پھر مسکرا کر بولی۔ ''خیر کوئی بات نہیں...... آپ ساحل صاحب کے دوست ہیں۔ آیئے اندر تشریف لے آیئے۔ کچھ ٹھنڈا وغیرہ پی کر جایئے گا۔ میں آپ دونوں کے نام جان سکتی ہوں۔''

''مسعود آفاقی ہوں' فوٹو گرافر۔''

''میں ناصر مرزا ہوں' شکاری۔'' ناصر مرزا نے مسعود کے انداز میں جواب دیا اور ہنس پڑا۔

''اوہ۔'' بے ساختہ ورشا کے منہ سے نکلا لیکن ناصر مرزا سمجھ نہ سکا کہ اس نے ''اوہ'' کس

بات پر کی۔
وہ ابھی تک گیٹ پر جمی کھڑی تھی۔ اس نے انہیں اندر آنے کی دعوت ضرور دی تھی۔ لیکن انہیں گھر میں لے جانے کے موڈ میں نہ تھی۔ دوسرے اس نے اتنے سوال جواب کر لیے تھے لیکن ساحل عمر کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔
ناصر مرزا نے تب براہ راست سوال کیا۔ ''جی آپ نے ساحل عمر کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔''
''وہ اگر یہاں آئے ہوتے تو میں ضرور ان کے بارے میں کچھ بتاتی۔'' ورشا نے پھر بھی واضح جواب نہ دیا۔
''آپ کی ساحل سے کب ملاقات ہوئی تھی؟''
''میری ان سے ملاقات پر کوئی پابندی تو نہ تھی۔ ہم جب چاہتے تھے مل لیتے تھے۔'' ورشا نے پھر گول مول جواب دیا۔
''اچھا جی...... ہم چلتے ہیں۔ آپ کو زحمت ہوئی۔ اگر ان کا کوئی فون آ جائے تو ہمارے بارے میں ضرور بتا دیجئے گا۔'' ناصر مرزا نے کہا۔
''جی بہت بہتر۔ میں ضرور بتا دوں گی۔'' یہ کہہ کر وہ واپس پلٹی۔ اس نے ان دونوں کے جانے کا ابھی انتظار نہ کیا فوراً گیٹ بند کر دیا۔
وہ دونوں ہکا بکا گیٹ کو دیکھتے رہ گئے۔
''یار ناصر مرزا' تم یہاں کیوں آئے تھے؟'' مسعود آفاقی نے اپنی گاڑی کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔
''ایک تو میں ان قیامتوں کا گھر دیکھنا چاہتا تھا۔ دوسرے میں ساحل عمر کے بارے میں ان سے براہ راست معلوم کرنا چاہتا تھا۔'' ناصر مرزا نے وضاحت کی۔
''چلو گھر تو تم نے دیکھ لیا۔ ایک مسئلہ حل ہو گیا لیکن ساحل عمر کے بارے میں تو اس نے کچھ نہیں بتایا۔'' مسعود فاقی کے لہجے میں غصہ تھا۔
''اس کے باوجود مجھے یقین ہے کہ ساحل عمر گھر سے نکل کر سیدھا ادھر ہی آیا۔ مجھے تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے وہ گھر کے اندر موجود ہو۔ کیا تم جانتے ہو کہ ورشا سے پہلے گیٹ پر بر کھا آئی تھی۔ اس نے گیٹ پر مجھے دیکھا اور واپس چلی گئی کیونکہ پہلے آنے والی کالے لباس میں تھی۔ لباس کی جھلک میں نے گیٹ کے خلا سے دیکھی تھی۔ اندر جا کر اس نے ورشا کو بھیج دیا کہ وہ گول مول جواب دے کر ہمیں ٹرخا دے' لیکن ہم ٹرخنے والوں میں سے نہیں ہیں۔'' ناصر مرزا پر عزم لہجے میں بولا۔
''اے بھائی' کیا کرنے کا ارادہ ہے۔'' مسعود آفاقی ذرا چونک کر بولا۔
''یار ایک بات ہے' ساحل اپنی گاڑی پر گھر سے نکلا ہے۔ اگر وہ اس وقت گھر میں موجود ہے تو اس کی گاڑی بھی یہاں موجود ہوتی۔'' ناصر مرزا نے قیاس آرائی کی۔
''تم نے یہ بات تو عقلمندی کی کی ہے۔''

"میں ذرا گیٹ سے اندر جھانک کر دیکھ لوں۔ ممکن ہے گاڑی اندر کھڑی نظر آ جائے۔"

"ہاں' دیکھو......" مسعود آفاقی اپنی گاڑی میں بیٹھتا بیٹھتا باہر نکل آیا۔

دونوں نے باری باری گیٹ کے درمیان جو خلا تھا اس سے اندر جھانک کر دیکھا۔ اس سے سامنے کا ایک محدود حصہ نظر آ رہا تھا' وہاں گاڑی نہ تھی۔

"مسعود کیا خیال ہے بنگلے کے پیچھے نہ چلیں۔" ناصر مرزا نے پوچھا۔ "ایک نظر پچھواڑے بھی ڈال لیں۔"

"چلو!" مسعود آفاقی نے اتفاق کیا۔

وہ دونوں اپنی گاڑیاں وہیں چھوڑ کر بنگلے کے پیچھے آ گئے۔ دوپہر کا وقت تھا۔ اچھی خاصی گرمی تھی۔ پچھلی گلی میں کوئی نہ تھا۔ دیوار اونچی تھی لیکن اتنی اونچی نہ تھی کہ اس پر چڑھا نہ جا سکے۔ دیوار میں ایک جگہ بلاک ٹوٹا ہوا تھا۔ ناصر مرزا نے پیر اس میں ٹکایا اور ذرا سا اچک کر دیوار کو دونوں ہاتھوں سے تھام لیا۔

جب اس نے سامنے نظر ڈالی تو اس کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ ساحل عمر کی گاڑی ایک درخت کے نیچے کھڑی تھی۔ وہ فوراً دیوار سے اتر آیا اور مسعود آفاقی کو فوراً اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا' وہ جلد سے جلد یہاں سے ہٹ جانا چاہتا تھا۔

"ساحل کی گاڑی اندر موجود ہے۔" ناصر مرزا نے راستے میں بتایا۔

"پھر کیا کہتے ہو...... گھر میں گھس جائیں۔" مسعود آفاقی کو جوش آ گیا۔

"برکھا بڑے اثر ورسوخ والی عورت ہے' گھر میں زبردستی داخل ہونے کی صورت میں ہم پر کیس بھی بن سکتا ہے۔" ناصر مرزا نے اسے سمجھایا۔ پھر چند لمحے توقف کر کے بولا: "گھر چلو' وہاں کچھ بیٹھ کر سوچتے ہیں۔"

"یار' معاملہ بہت سنگین ہو گیا ہے۔ مجھے یوں لگتا ہے جیسے میرا دوست کسی مشکل میں گرفتار ہو گیا ہو۔" مسعود آفاقی نے بڑے تشویش بھرے انداز میں کہا اور اپنی گاڑی کا دروازہ کھول کر اس میں بیٹھ گیا۔

پھر دونوں گاڑیاں آگے پیچھے اپنے رستے پر ہو لیں۔

دونوں گاڑیوں کے جانے کے بعد وہ شخص درخت کی اوٹ سے نکل آیا۔ قریب ہی اس کی موٹر سائیکل کھڑی تھی۔ موٹر سائیکل کی گدی پر بیٹھ کر اس نے اپنی شرٹ کی جیب سے موبائل فون نکالا اور کسی کا نمبر ملانے لگا۔ مشکل سے تیس سیکنڈ اس نے کسی سے بات کی۔ پھر موبائل فون اپنی جیب میں ڈال لیا۔ وہ اگرچہ ورشا کے بنگلے سے ذرا فاصلے پر کھڑا تھا لیکن اتنی دور نہ تھا کہ اسے بنگلے کا گیٹ دکھائی نہ دے رہا ہو۔

وہ وہاں انجان بنا کھڑا تھا لیکن اس کی نظریں بنگلے کے گیٹ پر تھیں۔ وہ وہاں کئی گھنٹے سے تھا۔ کبھی وہ اپنی موٹر سائیکل چیک کرنے بیٹھ جاتا۔ کبھی بنگلے کے گیٹ تک آ کر واپس اپنی جگہ پہنچ جاتا' کبھی درخت کے سہارے کھڑے ہو کر سگریٹ پینے لگتا۔ وہ ورشا کے بنگلے کی نگرانی کر رہا تھا۔ اس بات

میں کسی قسم کا شبہ نہ تھا۔ وہ نگرانی کیوں کر رہا تھا۔ یہ بات ابھی راز میں تھی۔

پھر یہ بات بھی زیادہ راز میں نہ رہ سکی۔ جیسے ہی بنگلے کے گیٹ سے گاڑی نکلی وہ بجلی کی سی تیزی سے موٹر سائیکل پر سوار ہوگیا۔ موٹر سائیکل پر سوار ہوتے ہوئے اس نے یہ چیک کر لیا تھا کہ گاڑی کون چلا رہا ہے۔

گاڑی میں ورشا تھی۔ زرد ساڑھی اور سرخ بلاؤز میں۔ اس نے اپنے بال سنوار لیے تھے۔ چہرے کی نوک پلک درست کر لی تھی۔

ورشا کی گاڑی آگے نکلتے ہی اس نے موٹر سائیکل پر بیٹھے بیٹھے موبائل فون کا نمبر ڈائل کیا اور بڑے کرخت لہجے میں کہا۔ ''موسم بہت خوشگوار ہے۔''

پھر اس نے فون اپنی جیب میں ڈالا۔ موٹر سائیکل کو کک لگائی۔ گاڑی اسٹارٹ ہوتے ہی وہ کسی گولی کی طرح ورشا کی گاڑی کی طرف چلا۔

ورشا کی گاڑی بڑی سڑک پر آئی تو وہاں سے ایک پجیرو اس کے پیچھے لگ گئی۔ اس جیپ میں چار خونخوار بندے موجود تھے۔

ورشا کی گاڑی برج کراس کر کے تین تلوار والی چورنگی کی طرف بڑھ رہی تھی۔ ورشا کو پتہ نہ تھا کہ اس کی گاڑی کے ساتھ ایک موٹر سائیکل سوار اور اس کے پیچھے ایک جیپ مسلسل تعاقب میں ہے۔ اس نے اپنی پسند کا ایک کیسٹ لگایا ہوا تھا اور وہ برق رفتاری سے اڑی جا رہی تھی۔

آگے جا کر اس کی گاڑی سپر مارکیٹ سے دائیں جانب گھومی۔ اس کے بعد اس نے خرکار چورنگی کی طرف رخ کیا۔ ابھی وہ چورنگی کے قریب پہنچنے والی تھی کہ موٹر سائیکل سوار اچانک اس کی گاڑی کے سامنے آ گیا۔ ورشا نے اپنی گاڑی بچا کر دائیں جانب نکلنے کی کوشش کی تو پجیرو نے اسے دوسری سائیڈ سے گھیر لیا۔

ورشا کو اب گاڑی روکے بنا چارہ نہ تھا۔

گاڑی رکتے ہی پجیرو سے چاروں خونخوار بندے گوریلوں کی طرح باہر نکلے۔ ان کے ہاتھوں میں آتشیں ہتھیار تھے۔ ورشا ابھی مسئلے کو سمجھ بھی نہ پائی تھی کہ اسے اٹھا کر پجیرو میں ڈال دیا گیا اور پجیرو آندھی طوفان کی طرح وہاں سے نکل گئی۔

موٹر سائیکل سوار نے اپنی گاڑی ایک سائیڈ پر کھڑی کر کے ورشا کی گاڑی سڑک کے کنارے کھڑی کی۔ گاڑی لاک کر کے اس کی چابی اپنی جیب میں ڈالی پھر وہیں کھڑے ہو کر موبائل فون کا نمبر ڈائل کیا اور بڑے مودبانہ انداز میں بولا۔

''سر آپریشن کٹی پتنگ بخیر و خوبی پایہ تکمیل کو پہنچا۔''

ٹیلی فون بند کر کے اس نے جیب میں ڈالا اور پھر موٹر سائیکل اسٹارٹ کر کے واپس شہر کی طرف چل دیا۔

☆......☆......☆

ٹیلی فون کی گھنٹی مسلسل چیخ رہی تھی۔ ریسیور اٹھانے والا کوئی نہ تھا۔ برکھا اپنے بیڈروم میں نہ

تھی۔ وہ واش روم میں تھی۔ گھنٹی کی آواز اسے سنائی دے رہی تھی لیکن وہ فوراً نکل نہیں سکتی تھی۔ وہ نہانے میں معروف تھی۔ اس اثناء میں ٹیلی فون کی گھنٹی وقفے وقفے سے بج کر بند ہو چکی تھی۔ کوئی برکھا کو مسلسل فون کر رہا تھا۔ ٹیلی فون کی گھنٹی بار بار بجنے کی وجہ سے وہ جلدی جلدی نہا کر نکل آئی۔ اس نے اپنے جسم کے گرد ایک بڑا سا تولیہ لپیٹا ہوا تھا۔ بالوں سے پانی بوند بوند موتی کی طرح ٹپک رہا تھا۔

اس نے جلدی سے ریسیور اٹھایا۔ ''ہیلو!''

''برکھا جی! اتنی دیر سے ٹیلی فون کر رہا ہوں' کہاں تھیں آپ؟'' ادھر سے بے چینی سے پوچھا گیا۔

''ابھی نہا کر نکلی ہوں۔'' برکھا نے بتایا۔ ''ورشا تو وقت پر پہنچ گئی ناں۔''

''اسی لیے فون کر رہا ہوں۔ صاحب آنے والے ہیں اور ورشا ابھی تک نہیں پہنچی ہیں۔''

''یہ کیا کہہ رہے ہو تم۔'' برکھا ایک دم پریشان ہوگئی۔ ''وہ یہاں سے ٹھیک وقت پر نکلی ہے۔ اسے تو وہاں کب کا پہنچ جانا چاہیے۔''

''وہ یہاں ابھی تک نہیں پہنچیں۔'' اس کے لہجے میں گھبراہٹ تھی۔ ''صاحب کا فون آ چکا ہے۔ وہ آنے والے ہیں' برکھا جی بڑا غضب ہو جائے گا۔ میری نوکری خطرے میں پڑ جائے گی۔''

''ارے بھاڑ میں گئی تمہاری نوکری۔'' برکھا کو ایک دم غصہ آ گیا۔ ''مجھے اپنی بیٹی کی فکر پڑی ہے۔ وہ اب تک وہاں کیوں نہیں پہنچی۔ کہاں رہ گئی وہ۔''

''اب میں کیا کہہ سکتا ہوں۔'' اس نے پریشان لہجے میں کہا۔ ''اب میں صاحب کو کیا جواب دوں گا۔''

''تم پریشان مت ہو' صاحب سے میری بات کرا دینا میں سنبھال لوں گی۔ تم ایسا کرو' فوراً کسی آدمی کو بھیجو۔ کہیں اس کی گاڑی نہ خراب ہوگئی ہو' ویسے ایسا امکان تو نہیں' احتیاطاً کہہ رہی ہوں۔ ٹائر پنکچر نہ ہو گیا ہو۔'' برکھا نے اسے تسلی دینے کی کوشش کی۔

''ٹھیک ہے' برکھا جی' میں آدمی بھیج کر راستہ چیک کراتا ہوں۔'' اس نے کہا ''آپ دس منٹ بعد ذرا فون کر لیجئے گا۔ میں آپ کی صاحب سے بات کرا دوں گا۔ ان کو بس آپ ہی سنبھال سکتی ہیں۔''

''مروت...... میں فون کر لوں گی۔ تم فوراً بندہ بھیجو۔'' یہ کہہ کر برکھا نے ریسیور رکھ دیا۔

☆......☆......☆

ورشا کی آنکھوں پر کس کر پٹی باندھ دی گئی تھی اور اس کے برابر ایک بندہ بیٹھ گیا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ریوالور تھا اور اس ریوالور کی نال اس کی پسلیوں میں چبھ رہی تھی۔ چلتے ہوئے اس سے کہا گیا تھا: ''اگر زندگی چاہتی ہو تو خاموش بیٹھی رہنا۔''

لیکن وہ خاموش نہیں بیٹھی رہ سکی تھی۔ اسے یہ تو اندازہ ہو گیا تھا کہ اسے اغوا کیا گیا ہے لیکن وہ یہ نہیں سمجھ پائی تھی کہ اسے کس کے ایما پر اغوا کیا گیا ہے اور وہ اسے کہاں لیے جا رہے ہیں۔ اس نے پوچھا تھا: ''مجھے صرف اتنا بتا دو کہ اس واردات کے پیچھے کون ہے' یہ معلوم ہونے کے بعد میں ایک

لفظ بھی نہیں بولوں گی۔"

"یہ بات ہم میں سے کوئی نہیں جانتا۔ بس اب سوال مت کرنا۔" اس کے برابر بیٹھے ہوئے شخص نے سخت لہجے میں کہا۔

"کیا تم لوگوں سے کوئی غلطی تو نہیں ہوگئی۔ کیا تم جانتے ہو کہ میں کون ہوں۔ کیا تم یہ بھی جانتے ہو کہ میں جس سے ملاقات کرنے جا رہی تھی' وہ کتنا بڑا آدمی ہے۔ کہو تو اس کا نام بتاؤں۔"

"بس بہت ہوگئی۔ اب تم بولیں تو میں گولی چلا دوں گا۔" یہ بات اس نے کچھ اس انداز میں کہی کہ ورشا نے خاموش ہو جانا ہی بہتر جانا۔

پھر اس کے بعد کوئی نہ بولا۔ گاڑی میں موت کی سی خاموشی چھائی رہی۔ ورشا اندازہ نہیں کر سکی کہ اسے کہاں لے جایا گیا۔ ویسے سفر زیادہ طویل نہیں تھا۔ وہ محسوس کر رہی تھی جیسے وہ ابھی شہر میں ہی ہے۔ گاڑی سے اتار کر اسے کسی اچھے گھر میں لے جایا گیا۔ اس گھر کی سیڑھیاں چڑھنے سے لے کر جہاں تک اسے لے جایا گیا' وہاں اس کے پیروں میں قالین رہا۔

اس نے ایک دروازے کے تالے میں چابی گھومنے کی آواز سنی۔ ہینڈل گھما کر دروازہ کھولا گیا۔ دروازے کی ہلکی سی چرچراہٹ محسوس ہوئی۔ پھر اسے ایک بیڈ پر بٹھا دیا گیا۔ جب اس کی آنکھوں سے پٹی کھولی گئی تو اس نے خود کو ایک عالیشان بیڈروم میں پایا۔ ورشا کو اندازہ تھا کہ آنکھیں کھلتے ہی اسے منحوس چہروں کو دیکھنا پڑے گا لیکن اس وقت کمرے میں کوئی خونخوار چہرہ نہ تھا۔ اس کی آنکھوں کی پٹی جس نے کھولی تھی' وہ کوئی مرد نہ تھا عورت تھی۔ وہ ایک ادھیڑ عمر کی عورت تھی۔ اس کی آنکھوں میں زندگی کے تجربے کی چمک تھی۔ وہ شلوار قمیص میں تھی اور وہ ورشا کو بڑی دلچسپی سے دیکھ رہی تھی۔

☆......☆......☆

برکھا نے نمبر ملا کر ریسیور کان سے لگایا۔

"ہیلو!" ادھر سے بھاری آواز میں کہا گیا۔ اس آواز کو وہ اچھی طرح پہچانتی تھی۔ اسے امید نہ تھی کہ وہ براہ راست فون اٹھالیں گے۔

"اوہ' سر میں برکھا بول رہی ہوں۔" برکھا نے بڑی تھکاوٹ سے کہا۔

"برکھا جی' آپ نے ہم پر بڑا ظلم کیا۔ اب دیکھو ناں' قوم نے ہمارے کاندھے پر کتنی بھاری ذمہ داری ڈال دی ہے۔ اس قومی وقت میں سے ہم نے دو گھنٹے کس مشکل سے نکالے ہیں۔ آپ یہ بات نہیں جانتی ہوں گی۔ ہمارا خیال تھا کہ یہ دو گھنٹے ہم کسی کی حسین رفاقت میں گزاریں گے لیکن یہاں آکر تو بدمزگی ہوگئی۔ برکھا جی' آپ نے ہم پر بڑا ظلم کیا۔"

"سر' میں معذرت چاہتی ہوں۔ آپ یقین کریں ورشا یہاں سے بالکل ٹھیک وقت پر نکلی تھی۔ وہ وہاں ابھی تک نہیں پہنچی' یہ سن کر میں خود پریشان ہوگئی ہوں۔ میں نے کچھ دیر پہلے عرفی سے بات کی تھی۔ پتہ نہیں اس نے راستہ چیک کرنے کے لیے کسی بندے کو بھیجا یا نہیں۔"

"یہ عرفی میرے سامنے بیٹھا ہے۔ اس سے بات کرلیں۔" سر نے کہا اور موبائل فون اس

کے ہاتھ میں دینے کے بجائے آف کردیا اور موبائل میز پر پھینک کر کھڑے ہو گئے۔ ''ناٹک کرتی ہے ہمارے ساتھ۔''

ہر وقت قوم کا درد دل میں لیے پھرنے والے کا دل خراب ہو چکا تھا۔ وہ یہاں اپنا ''غم غلط'' کرنے آیا تھا۔ کسی اور کے غم میں مبتلا نہیں ہونے آیا تھا۔ اس نے جلتی آنکھوں سے عرفی کو دیکھا اور پھنکارتا ہوا بولا۔ ''ڈرائیور سے کہو گاڑی باہر نکالے۔''

''جی سر۔'' عرفی کانپتا ہوا بولا۔ ''مجھے معاف کردیجیے' غلطی ہوگئی۔''

قوم کا درد بانٹنے والے نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ اسے غصے سے دیکھتا ہوا کمرے سے نکل گیا۔

☆......☆......☆

''کیا دیکھ رہی ہو؟'' ورشا نے اس عورت کو اس قدر محویت سے دیکھتے ہوئے پایا تو سوال کر بیٹھی۔

''تمہیں دیکھ رہی ہوں' اتنی سندر' اتنی سوہنی لڑکی میں نے آج تک نہیں دیکھی۔ بالکل ہرنی جیسی ہو۔ تمہیں کہاں سے پکڑا گیا ہے؟'' وہ اسے بدستور دیکھ رہی تھی۔

''مجھے آدمیوں کے جنگل سے پکڑا گیا ہے۔'' ورشا نے ہنس کر کہا۔

''سوہنی ہونے کے ساتھ ساتھ ہمت والی بھی ہو۔'' اس نے رائے دی۔

''کیسے پہچانا!'' وہ متعجب ہوئی۔

''اس کمرے میں جب میں کسی لڑکی کی آنکھوں سے پٹی کھولتی ہوں تو وہ تھرتھر کانپ رہی ہوتی ہے۔ خوف کے مارے زبان نہیں کھلتی۔ تم تو ہنس رہی ہو' کون ہو تم؟'' اس تجربے کار عورت نے اپنا تجربہ بیان کیا۔

''اب تک کتنی پٹیاں کھول چکی ہو۔'' ورشا نے سادگی سے سوال کیا۔

''یہ بتانے سے تمہیں کیا حاصل ہوگا۔'' وہ نرم لہجے میں بولی۔

''میں کہاں ہوں...... کیا یہ بتا سکتی ہو؟'' ورشا نے دوسرا سوال کیا۔

''بتانا چاہوں تو بتا سکتی ہوں لیکن اس سے بھی تمہیں کوئی فائدہ نہ ہوگا۔''

''تم بتا سکتی ہو تو بتا دو۔'' فائدہ نقصان مجھ پر چھوڑ دو۔'' اس نے دوٹوک انداز اختیار کیا۔

''تم ڈیفنس کے ایک بنگلے میں ہو؟'' اس نے انکشاف کیا۔

''اتنی مہربان ہوگئی ہو تو یہ بھی بتا دو کہ مجھے یہاں کس کے حکم پر لایا گیا ہے۔'' اس نے پانسہ پھینکا۔

''یہ بات میں تمہیں نہیں بتا سکتی لیکن یہ بات زیادہ عرصے راز میں رہے گی نہیں۔ تم خود اپنی آنکھ سے دیکھ لوگی کہ کون ہے وہ؟'' اس نے سنجیدگی سے کہا۔

"تم کون ہو؟" ورشا نے سوال کیا۔

"میں ایک خادمہ ہوں اور یہاں تمہاری خدمت کرنے کے لیے حاضر ہوئی ہوں۔ بولو تمہیں کیا چاہیے۔ ٹھنڈا پیو گی یا گرم۔" اس نے بڑے مودبانہ لہجے میں کہا۔

"شکریہ...... فی الحال مجھے کچھ نہیں چاہیے۔"

"ٹھیک ہے پھر تم آرام کرو۔ اگر میری ضرورت پڑے تو یہ بیڈ کے اوپر دیوار میں لگا گھنٹی کا بٹن دبا دینا۔ میں حاضر ہو جاؤں گی۔ میں اب چلتی ہوں۔ جاتے ہوئے باہر سے دروازہ لاک کر جاؤں گی۔ اس بیڈروم میں تم آزاد ہو جو مرضی آئے کرو۔"

"جاتے جاتے اپنا نام بتاتی جاؤ۔" ورشا مسکرائی۔ "اگر بتانا چاہو تو۔"

"میرا نام چندن ہے اور تم؟" اس نے سوال کیا۔

"میں ورشا ہوں۔" ورشا نے اپنا نام بتایا۔

"اچھا نام ہے۔ کم سننے میں آتا ہے۔ کس نے رکھا یہ نام؟" اس نے ایسے ہی پوچھا۔

"میری ممی نے' ان کا نام برکھا ہے۔" ورشا نے بتایا۔

"اوہ۔" برکھا کا نام سن کر چندن ایک دم چونک گئی۔ "تو تم برکھا جی کی بیٹی ہو؟"

"ہاں' کیا تم میری ممی کو جانتی ہو؟" ورشا نے خوشگوار حیرت سے اسے دیکھا۔

"ہاں بہت اچھی طرح...... وہ بڑے صاحب کے پاس آیا کرتی تھیں۔ انہوں نے ان کے بہت کام کیے۔ انہوں نے ایک کام میرا بھی کیا تھا۔ میرا شوہر مجھے بہت تنگ کرتا تھا۔ بات بے بات مارتا تھا۔ انہوں نے مجھے ایک پڑیا دی۔ اس میں راکھ جیسی کوئی چیز تھی۔ وہ میں نے اپنے شوہر کو چائے میں گھول کر پلا دی۔ بس وہ دن اور آج کا دن' پھر کبھی اس نے مجھ پر ہاتھ نہیں اٹھایا۔ بڑے صاحب کی زندگی تک وہ یہاں آتی رہیں۔ اسی بنگلے میں۔ جب ان کا انتقال ہو گیا تو انہوں نے آنا چھوڑ دیا۔" چندن نے بتایا۔

"چندن' میری ماں نے تم پر احسان کیا ہے۔ آج اس کی بیٹی تمہارے سامنے ہے۔ کیا تم اس پر کوئی احسان نہیں کر سکتی ہو۔" ورشا نے امید بھری نظروں سے دیکھا۔

"ورشا بی بی...... مجھے مشکل میں مت ڈالو۔ وہ بڑا جلاد آدمی ہے۔ ایک سیکنڈ میں بندے کی پیشانی پر ریوالور رکھ کر گولی چلا دیتا ہے۔ بی بی مجھے معاف کرنا...... میں تمہارے لیے کچھ نہیں کر سکتی۔" اس نے گھبرا کر کہا اور تیزی سے کمرے سے نکل گئی۔ پھر ورشا نے دروازے کے تالے میں چابی گھومنے کی آواز سنی۔ وہ بند دروازے کو دیکھتی رہ گئی۔

☆......☆......☆

یہ ایک وسیع و عریض فارم تھا۔ اس فارم میں خاصا اندر جا کر کاٹیج بنا ہوا تھا۔ واسم نے اپنی گاڑی کاٹیج کے دروازے سے ملا کر کھڑی کی اور ہارن دیا۔

چند لمحوں بعد کاٹیج کا دروازہ کھلا۔ سوناں مسکراتی ہوئی باہر آئی۔

"واسم تمہیں آنے میں کچھ دیر نہیں ہوگئی۔"

سوناں نے گاڑی میں جھانک کر ساحل عمر کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"راستے میں ایک جگہ چیکنگ ہو رہی تھی۔ راستہ بدل کر آیا ہوں۔" واسم نے بتایا۔

پھر ان دونوں نے ساحل عمر کو سہارا دے کر گاڑی سے اتارا۔ گاڑی سے اترتے ہوئے ساحل عمر نے ایک دم آنکھیں کھولیں۔ خالی نگاہوں سے باری باری دونوں کو دیکھا اور پھر ان کے کندھوں کا سہارا لے کر یوں چلنے لگا جیسے وہ دونوں اس کی مرضی کے مطابق اسے کہیں لیے جا رہے ہوں۔

اسے کچھ ہوش نہ تھا۔ وہ کہاں ہے۔ کیا کر رہا ہے۔

"برکھا جی نے اس کے بارے میں کیا ہدایت کی ہے۔ اسے کہاں رکھنا ہے۔" سوناں نے کاٹیج کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے پوچھا۔

"اندر والے کمرے میں رکھنا ہے۔ سیج پر لٹانا ہے۔"

واسم نے اسے گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"واسم تم بھی خوب ہو' اسے تم سیج کہتے ہو۔" سوناں نے اسے ترچھی نظروں سے دیکھا۔

"اچھا چلو' سیج مت کہو...... موت کی سیج کہہ لو۔ اب تو ٹھیک ہے۔"

"ہاں' وہ کمرہ تو قربان گاہ ہے۔" سوناں نے گہرا سانس لے کر کہا۔

"سوناں' ایک بات کان کھول کر سن لو' کوئی غلطی نہیں ہونی چاہیے۔ برکھا جی نے بہت سخت تنبیہ کی ہے۔ اگر ذرا بھی کوئی گڑبڑ ہوئی تو ہم لوگوں کی خیر نہیں۔" واسم نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے اسے سمجھایا۔

"نہیں کوئی غلطی نہیں ہوگی...... تم بے فکر رہو۔" سوناں نے اسے یقین دلایا۔ پھر توقف کرکے بولی۔ "برکھا جی کب آئیں گی؟"

"ان سے فون پر بات کرنا ہوگی۔ پھر جب وہ کہیں گی' انہیں جا کر لانا ہوگا۔" واسم نے بتایا۔

پھر وہ دونوں اندر والے کمرے کے دروازے پر رک گئے۔ سوناں نے اپنا کندھا اس کے بازو سے نکالا اور واسم سے بولی۔ "واسم ذرا سنبھالو۔"

واسم نے جھولتے ساحل عمر کو مضبوطی سے تھام لیا۔ تب وہ زمین پر بیٹھ کر ساحل عمر کے جوتے اتارنے لگی۔ پھر ان دونوں نے بھی اپنے جوتے اتارے اور دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئے۔

یہ ایک چوکور کمرہ تھا۔ سرخ رنگ کا قالین بچھا ہوا تھا۔ اس کے علاوہ اس میں کوئی سامان نہ تھا۔ اس کمرے کے درمیان میں شاید ایک تخت پڑا ہوا تھا۔ وہ چاروں طرف سے ایک کالی چادر سے

ڈھکا ہوا تھا۔ ساحل عمر کو اس پر احتیاط سے لٹا دیا گیا اور پھر دونوں الٹے قدموں واپس دروازے کی طرف گئے اور باہر نکل کر دروازہ مقفل کر دیا۔

صبح ہو چکی تھی۔ سورج کی روشنی ایک دم ہی اس کی آنکھوں پر پڑی تھی۔ اس کی بند آنکھوں پر تمازت محسوس ہوئی تو اس نے فوراً آنکھیں کھولیں اور پھر فوراً ہی اٹھ کر بیٹھ گیا۔

سورج کی روشنی اوپر بنے روشندان سے آ رہی تھی اور ایک مخصوص جگہ پر پڑ رہی تھی۔ ساحل عمر نے نظریں گھما کر چاروں طرف دیکھا۔ یہ ایک عجیب وغریب کمرہ تھا۔ وہ جس چیز پر بیٹھا ہوا تھا، وہ پتھر کی طرح سخت تھی اور اس پر ایک بڑی سی کالی چادر پڑی ہوئی تھی۔

اس نے کھڑے ہو کر جب یہ دیکھنے کے لیے چادر کھینچی کہ وہ کہاں لیٹا ہوا تھا۔

دکھ کی ایک لہر اس کے اندر اترتی چلی گئی۔

☆.....☆.....☆

وہ کسی کی قبر تھی۔

اور اس قبر کا کتبہ سرہانے کے بجائے درمیان میں لگا ہوا تھا۔ جس پر صاحب قبر کا نام' سن ولادت اور سن وفات لکھا ہوا تھا۔ اسے دکھ اس بات کا ہوا تھا کہ وہ کسی کی قبر پر لیٹا ہوا تھا۔ شاید وہ رات کو سویا بھی اسی قبر پر تھا۔

اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ کہاں ہے؟ یہ کیا جگہ ہے؟ اور اسے یہاں کون لایا ہے؟ اسے بس اتنا یاد تھا کہ رات کو برکھا کا فون آیا تھا۔ اس نے اسے آنے کے لیے کہا تھا۔ اس کی آواز میں جانے ایسا کیا جادو تھا کہ وہ فوراً اس کے پاس جانے کے لیے بے قرار ہو گیا تھا اور ایک منٹ ضائع کیے بغیر گاڑی میں بیٹھ کر اپنے گھر سے نکل گیا تھا۔ اس کے دماغ میں یہ خیال تھا کہ جلد از جلد برکھا کے پاس پہنچ جانا ہے۔ اس کے خیال کے علاوہ سارے خیال اس کے دماغ سے مٹ گئے تھے۔ اس کی نظروں کے سامنے بس برکھا کا چہرہ تھا۔ اس چہرے کے علاوہ اسے کوئی چہرہ یاد نہ رہا تھا۔ حتیٰ کہ ورشا کا چہرہ بھی غبار راہ ہو گیا تھا۔

پھر برکھا نے اسے اپنے بیڈ روم میں لے جا کر جانے کیا پلا دیا تھا کہ اس کے پیتے ہی وہ اپنے ہوش گنوا بیٹھا تھا۔ اس کے بعد اس کے ساتھ کیا ہوا تھا۔ اسے کچھ یاد نہ تھا۔ اس پر خواب کی سی کیفیت چھائی ہوئی تھی۔ اسے یہ احساس تو تھا کہ اس کے ساتھ کچھ ہو رہا ہے۔ کیا ہو رہا ہے اس کا پوری طرح ادراک نہ تھا۔ کبھی وہ برکھا کا چہرہ دیکھتا' کبھی اسے واسم نظر آتا' کبھی وہ خود کو گاڑی میں بیٹھا ہوا پاتا۔ کبھی وہ کہیں لیٹا ہوا محسوس کرتا۔

اس وقت وہ ذرا ہوش میں آیا تھا۔ اس کی آنکھیں پوری طرح کھلی تھیں۔ اسے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے اسے گہری نیند سے جھنجھوڑ کر اٹھا دیا گیا ہو۔ سر چکرا رہا تھا اور جسم سن سا ہو رہا تھا۔ اس نے ورزش کے انداز میں ہاتھ پیروں کو حرکت دی اور سوچنے لگا کہ یہ کیا جگہ ہے؟

یہ برکھا کا بیڈ روم تو نہ تھا۔ یہ بڑا عجیب و غریب کمرہ تھا۔ کمرے میں ایک قبر بھی تھی اور دیوار سے دیوار تک سرخ قالین بچھا ہوا تھا۔ اس کمرے میں دو روشندان تھے جو آمنے سامنے تھے اور خاصے اونچے تھے۔ کوئی کھڑکی نہ تھی۔ سامنے ایک دروازہ تھا۔ وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا دروازے تک گیا۔ چلتے ہوئے اس کے قدم ڈگمگا رہے تھے۔ اس نے دروازے کا ہینڈل نیچے کر کے دروازہ کھولنا چاہا لیکن دروازہ لاک تھا۔

اب اس کا دماغ آہستہ آہستہ بیدار ہوتا جا رہا تھا اور وہ سوچ رہا تھا کہ کسی مصیبت میں گرفتار ہو گیا ہے۔

☆......☆......☆

برکھا کا بنگلہ اس وقت تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔ ناصر مرزا اسی جگہ سے دیوار پھلانگ کر اندر آیا تھا جس جگہ سے اس نے دن کی روشنی میں ساحل عمر کی گاڑی کھڑی دیکھی تھی۔ دیوار کود کر وہ چند لمحے اطمینان سے کھڑا رہا۔ اس نے بنگلے کی پچھلی سائیڈ کو بغور دیکھا۔ عمارت میں کہیں بھی روشنی نہ تھی۔ اسے اس بات کا خدشہ تھا کہ بنگلے میں کوئی کتا نہ ہو۔ اگرچہ وہ پوری تیاری سے بنگلے میں داخل ہوا تھا اور ہر خطرے سے نمٹنے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ پھر بھی وہ چاہتا تھا کہ بنگلے میں کتا وغیرہ نہ ہو تو بہتر ہے۔ خواہ مخواہ اسے ختم کرنا پڑے گا۔ جب اسے یقین ہو گیا کہ بنگلے میں کوئی کتا موجود نہیں ہے تو وہ نپے تلے قدموں سے آگے بڑھا۔ اسٹریٹ لائٹ جہاں تک اندر آ رہی تھی' وہاں تک وہ اس کی روشنی میں آگے بڑھتا رہا اور جب اندھیرا بڑھنے لگا تو اس نے محدود دائرے والی چھوٹی سی ٹارچ روشن کر لی۔

یہ بنگلہ درخت اور بے ترتیب جھاڑیوں سے گھرا ہوا تھا۔ جھینگروں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ بنگلے کی ویرانی اندھیرے میں مزید بڑھ گئی تھی۔ بنگلے کی طرف بڑھتے ہوئے دل میں ہول سی اٹھتی تھی۔ ناصر مرزا مضبوط اعصاب کا مالک تھا۔ وہ بغیر پریشان ہوئے محتاط انداز میں آگے بڑھتا رہا۔

اس وقت اسے حیرت کا جھٹکا لگا جب وہ اس جگہ پہنچا جہاں دن میں ساحل عمر کی گاڑی کھڑی تھی' وہاں اب گاڑی موجود نہ تھی۔ وہ پیچھے سے گھومتا ہوا آگے آ گیا۔ مین گیٹ تک چلا گیا لیکن اسے گاڑی کہیں نظر نہ آئی۔ اس پر مایوسی چھانے لگی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ساحل عمر یہاں سے نکل گیا۔ وہ مین گیٹ سے یہ سوچتا ہوا پھر پچھلی طرف آیا۔ تب اسے ایک جگہ جھاڑیوں کے اندر ایک ہیولا سا محسوس ہوا۔ اس نے ٹارچ کی روشنی ڈالی تو ساحل عمر کی گاڑی پر نظر پڑی۔ وہ ایک دم کھل اٹھا۔

اب سوال یہ تھا کہ اس بنگلے میں بے شمار کمرے تھے اور ایک بھی روشن نہ تھا۔ پھر وہ کیسے اندازہ کرے کہ ساحل عمر کس کمرے میں موجود ہے۔ اسے ایک ایک کمرہ جھانکنا ہوگا۔ اب اس کے علاوہ کوئی چارہ نہ تھا۔ اس نے ٹارچ بائیں ہاتھ میں تھام لی اور جیب سے چاقو نکال کر کھول لیا اور ایک ایک کمرے کو چیک کرتا آگے بڑھنے لگا۔

بیشتر کمرے اندر سے بند تھے اور جو کھلے تھے وہ خالی پڑے ہوئے تھے۔ ان میں کوئی سامان تک نہ تھا۔ اسی طرح کمروں کی تلاشی لیتا جب وہ ایک کمرے کے سامنے آیا تو اس کا دروازہ بھی حسب معمول بند تھا۔ اس نے دروازے کو آہستہ سے دھکا دیا تو وہ کھل گیا۔ ٹارچ روشن کر کے سامنے دیکھا تو اسے اس کمرے میں قالین بچھا نظر آیا۔ پھر ٹارچ کے دائرے نے ایک بیڈ دریافت کیا۔

ناصر مرزا ابھی بیڈ پر ٹارچ کی روشنی ڈال کر یہ دیکھنے ہی والا تھا کہ آیا بیڈ پر کوئی موجود ہے کہ نہیں کہ اچانک کمرہ تیز روشنی میں نہا گیا۔

کمرے میں برکھا موجود تھی۔ بیڈ سے اٹھ کر اسی نے لائٹ روشن کی تھی۔ اپنے سامنے ناصر

اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔
مرزا کو پا کر اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔
''شکاری تو...... تو یہاں کیا سوچ کر آیا ہے۔'' وہ ناگن کی طرح بل کھا کر بولی۔
''میرا دوست کہاں ہے...... میں اپنے دوست کو لینے آیا ہوں۔ اسے میرے حوالے کردے۔ میں یہاں سے خاموشی سے چلا جاؤں گا۔'' ناصر مرزا نے دوٹوک انداز میں بات کی۔
''کس دوست کی بات کرتا ہے...... میں تیرے کسی دوست کو نہیں جانتی۔''
''اس دوست کی جس کی گاڑی تیرے گھر کی جھاڑیوں میں چھپی ہوئی ہے۔'' ناصر مرزا نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔
''اچھا تو تو پورے گھر کی تلاشی لے آیا ہے۔'' برکھا جواب تک کھڑی تھی بیڈ پر بیٹھ گئی اور اسے گھورتے ہوئے بولی۔
''تو نے میرے گھر میں داخل ہو کر اچھا نہیں کیا؟''
''میں نے یہاں آ کر اچھا کیا ہے یا برا کیا ہے اس بات کو چھوڑ...... مجھے باتوں میں الجھانے کی کوشش نہ کر۔ دوپہر کو بھی تو نے یہی کہا تھا خود سامنے آئی نہیں مجھے دیکھ کر ڈر گئی۔ اپنی بیٹی کو بھیج دیا۔ اس نے غلط بیانی سے کام لیا جبکہ ساحل عمر اس گھر میں موجود تھا۔ تو اس لڑکے کے دروازے پر کیوں پڑ گئی ہے۔ وہ میرا بہت پیارا دوست ہے۔ اگر اس کو کچھ ہو گیا تو پھر تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔''
''میرے گھر میں گھس کر مجھے قتل کی دھمکی دیتا ہے۔ ابھی اگر میں پولیس کو کال کرلوں تو تو جانتا ہے تجھ پر کتنے مقدمے بن جائیں گے۔ تو یہ بات اچھی طرح جانتا ہوگا۔ جانتا ہے ناں؟'' برکھا نے ترچھی نگاہوں سے دیکھا۔
''میں تیرے گھر کی دیوار پھلانگ کر آیا ہوں۔ میں اس طرح کود کر اندر آیا ہوں تو کچھ سوچ کر ہی آیا ہوں گا۔ تو اپنا شوق پورا کر پولیس کو کال کر۔ پھر دیکھ تماشا۔'' ناصر مرزا پولیس بلانے کی دھمکی پر تھوڑا پریشان ہو گیا تھا لیکن اس نے اپنی پریشانی ظاہر نہ ہونے دی۔ اس نے اسے الٹی دھمکی دے کر چکرا دیا۔ اگر وہ ڈر جاتا تو وہ اسے اور ڈراتی لیکن وہ ڈرنے والوں میں سے نہ تھا۔
''تو کیا چاہتا ہے؟'' برکھا کا لہجہ تھوڑا نرم ہوا۔
''میں یہاں ساحل عمر کو لینے آیا ہوں۔ اسے میرے حوالے کردے۔''
''اور میری بیٹی کا کیا ہوگا؟'' ایک انوکھا سوال ہوا۔
''کہیں تو ساحل عمر اور ورشا کی شادی کے چکر میں تو نہیں ہے۔ یاد رکھ میں ایسا نہیں ہونے دوں گا۔''
''میں کیا کہہ رہی ہوں تو کیا کہہ رہا ہے؟''
''تو جو کہنا چاہ رہی ہے میں اچھی طرح سمجھتا ہوں۔''
''ورشا کہاں ہے؟'' ناصر مرزا اس سوال پر چونکا۔
''اس سوال کا کیا مطلب ہے؟''

''تمہارے جانے کے بعد سے میری ورشا غائب ہے۔ اس کی گاڑی کلفٹن چورنگی کے نزدیک سے ملی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ تم لوگوں نے اسے اغوا کروایا ہے۔'' برکھا نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

''اوہ' تو ورشا اغوا ہو چکی ہے...... ورشا کے اغوا کا ذکر سن کر ناصر مرزا کے دل میں ٹھنڈک سی پڑ گئی۔ کوئی تو ان ظالموں کو نقصان پہنچانے والا پیدا ہوا جس نے بھی ورشا کو اغوا کیا ہے۔ اس کے لیے اس کے دل سے دعا نکلی۔ واہ بھائی تو نے کمال کیا۔ اللہ تیرا بھلا کرے۔

ناصر مرزا نے ایک سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں یہ بات طے کر لی کہ وہ اغوا کے معاملے کو ہرگز کلیئر نہیں کرے گا۔ برکھا خود بخود جال میں پھنس گئی تھی۔ اب وہ بارگیننگ پوزیشن میں آ گیا تھا۔ وہ اس بات سے فائدہ اٹھائے گا۔

لیکن وہ بھی کچی گولی نہیں کھیلے ہوئے تھی۔ وہ ایک شاطر تھی۔ جب سے اس کے علم میں یہ بات آئی تھی کہ ورشا کی گاڑی کلفٹن چورنگی کے نزدیک کھڑی ہے تب سے اس نے اپنے تمام ہرکارے ادھر ادھر دوڑائے ہوئے تھے۔ جن جن لوگوں پر اسے شبہ تھا' وہاں وہاں وہ چیک کر رہی تھی۔ اس کے ساتھ ہی وہ پورے بنگلے میں اندھیرا کر کے اپنے بیڈ پر بیٹھ کر ایک عمل کر رہی تھی کہ ناصر مرزا اس کے گھر میں آ کودا تھا۔

یہ لوگ اس کی فہرست میں شامل نہ تھے۔ ناصر مرزا کا چہرہ دیکھ کر اچانک اس کے دل میں یہ خیال آیا کہ ہو سکتا ہے یہ کام ان لوگوں نے کیا ہو...... یہ سوچ کر اس نے اندھیرے میں تیر چھوڑ دیا تھا۔ اگر ناصر مرزا کے اشارے پر یہ اغوا ہوا ہے تو یہ فوراً اگل دے گا۔ اس طرح ورشا کے بدلے میں ساحل عمر کو دے دیا جائے گا۔ اور آئندہ وہ ورشا کو محفوظ کر کے ساحل عمر کو دوبارہ اپنے قبضے میں لے گی۔

''تم کسی کو اغوا کر سکتی ہو تو کوئی اور بھی تمہاری بیٹی کو اغوا کروا سکتا ہے۔ سیر کو سوا سیر ملنا کون سا مشکل ہے۔'' ناصر مرزا نے طنزیہ لہجہ اختیار کیا۔

''میں نے ساحل عمر کو اغوا نہیں کیا۔'' برکھا نے کہا۔

''پھر اس کی گاڑی تمہارے گھر میں کیسے موجود ہے؟'' ناصر مرزا نے سوال کیا۔

''ہو سکتا ہے تمہاری بیٹی کو بھی کسی نے اغوا نہ کیا ہو۔ وہ اپنی مرضی سے کسی کے ساتھ گئی ہو۔''

''شکاری میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ جو کچھ کہنا ہے صاف لفظوں میں کہو۔'' یہ کہہ کر اس نے سائیڈ ٹیبل پر رکھا ہوا جگ اور گلاس اٹھایا۔ جگ سے پانی نکال کر پورا گلاس بھرا۔ اتنی دیر میں اس نے کچھ پڑھ کر گلاس پر پھونکا اور بیڈ سے اچانک اٹھ کر دو قدم آگے بڑھی اور اس سے پہلے کہ ناصر مرزا کچھ سمجھتا' اس نے پانی سے بھرا گلاس اس کے اوپر پھینک دیا۔

بظاہر پانی نظر آنے والی چیز اس کے پڑھ کر پھونکتے ہی پانی نہ رہی تھی' تیزاب بن گئی تھی۔ ناصر مرزا کی جگہ اس وقت اگر کوئی اور شخص ہوتا تو وہ جل کر رہ جاتا۔ اس کا چہرہ اور جسم جھلس جاتا۔ مگر یہ پانی ناصر مرزا کا کچھ نہ بگاڑ سکا۔ پانی پڑتے ہی اس کے جسم میں آگ لگنی شروع

ہوئی تھی کہ ناصر مرزا کو فوراً ہوش آ گیا۔ اس کے ہاتھ میں کھلا ہوا چاقو موجود تھا۔ وہ چاقو فوراً اس نے اپنے جسم سے لگا لیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ پانی بھاپ بن کر اڑ گیا۔

برکھا اسے آنکھیں پھاڑ کر حیرت سے دیکھنے لگی۔

☆......☆......☆

ورشا بیڈ پر پاؤں لٹکائے بیٹھی تھی۔ اس کی نظریں دروازے پر جمی تھیں۔ وہ اس شخص کا انتظار کر رہی تھی جس نے یہ سارا کھیل رچایا تھا...... اسے بند دروازے کے کھلنے کا شدت سے انتظار تھا......

یہ وہ بیڈ روم نہ تھا جہاں اس کی چندن نے پٹی کھولی تھی۔ وہ بیڈ روم تو ڈیفنس کے ایک بنگلے کا تھا۔ اس بنگلے میں وہ اندھیرا ہونے تک رہی تھی۔ اندھیرا ہوتے ہی چندن دروازہ کھول کر اندر آئی تھی۔ اس مرتبہ وہ اکیلی نہ تھی' اس کے ساتھ کچھ منحوس شکلیں بھی تھیں اور یہ شکلیں ان سے مختلف تھیں جو اسے بجیرو میں ڈال کر یہاں تک لائے تھے۔

وہ دو تھے اور دونوں کے ہاتھوں میں کلاشنکوفیں تھیں۔

''ورشا بی بی ...... چلنا ہے۔'' چندن نے اس کے قریب پہنچ کر آہستہ سے کہا۔

''یہاں سے کہاں جانا ہے؟'' ورشا نے پوچھا۔

''میں نہیں جانتی...... مجھے حکم ملا ہے کہ میں آپ کو جیپ میں لے آؤں۔'' اس نے بتایا۔

''اچھا' چلو!'' ورشا کھڑے ہوتے ہوئے بولی۔

''ایک منٹ بی بی۔'' چندن نے کہا۔

''اب کیا ہے؟'' ورشا اسے دیکھتے ہوئے بولی۔

''ذرا بیٹھ جائیں۔ آپ کی آنکھوں پر پٹی باندھنی ہے۔'' اس نے وضاحت کی۔

''چندن کاش تم اس شخص کی عقل پر پٹی باندھ سکتیں جس نے مجھے اغوا کروا کے ایک قیامت کو دعوت دے دی ہے۔''

''ایسی قیامتیں ہمارے راجہ سائیں نے بہت دیکھی ہیں۔'' ان میں سے ایک نے کلاشنکوف سیدھی کی اور چندن سے مخاطب ہو کر بولا: ''چل چندن جلدی کر' باندھ پٹی ...... لمبا سفر ہے۔''

ورشا نے ایک نظر اس شخص کو دیکھا سوچا کچھ پوچھے۔ پھر کچھ سوچ کر رہ گئی۔ چندن نے جلدی سے ورشا کی آنکھوں پر کالی پٹی باندھ دی اور اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

پچھلی سیٹ پر ورشا کے ساتھ چندن بیٹھ گئی اور پھر سفر شروع ہو گیا۔ رات کو تین چار بجے تک یہ لوگ اپنے ٹھکانے پر پہنچے۔ گاڑی بڑی سی حویلی کے بڑے سے گیٹ میں داخل ہو گئی اور کافی اندر جا کر اصل عمارت کے سامنے رکی۔ چندن نے ورشا کو گاڑی سے اتارا۔ ہاتھ پکڑ کر اسے مختلف راستوں سے گزارتی ہوئی بالآخر ایک کمرے میں داخل ہوئی اور دروازہ اندر سے بند کر کے ورشا کی آنکھوں سے پٹی کھول دی۔

پٹی کھلنے کے بعد ورشا نے آہستہ سے اپنی آنکھوں کو ملا' آنکھیں میچیں اور کھولیں۔ پھر

کمرے پر ایک طائرانہ نظر ڈالتی ہوئی بولی۔ ''پوری رات سفر میں گزر گئی۔''

''جی بی بی ...... ہم کراچی سے بہت دور نکل آئے ہیں۔''

''یہ کیا جگہ ہے؟'' ورشا نے حسب معمول اپنی معلومات میں اضافہ چاہا۔

''اس جگہ کا نام میں نہیں جانتی...... میں پہلی بار یہاں آئی ہوں۔'' چندن نے دھیرے سے کہا۔ ورشا نے محسوس کیا کہ وہ سفید جھوٹ بول رہی ہے۔ وہ اس کی مجبوری سمجھتی تھی۔ لہٰذا اس نے جگہ سے متعلق کوئی اور سوال نہ کیا۔

''بی بی آپ کچھ پئیں گی۔''

''ہاں' چائے پیوں گی۔'' ورشا نے انگڑائی لیتے ہوئے کہا۔ ''تھکن ہوگئی ہے۔''

''آپ چہرے پر چھینٹے مار لیں...... میں چائے لے کر آتی ہوں۔'' اس نے مشورہ دیا۔

ورشا نے باتھ روم میں جا کر اپنا چہرہ اچھی طرح دھویا۔ سامنے لگے آئینے میں اپنی شکل دیکھی۔ چہرے پر تھکن برس رہی تھی۔ یہ ایک مشکل اور دشوار گزار سفر تھا۔ آخری دس میل انتہائی تکلیف دہ تھے۔ راستہ اونچا نیچا اور کچا تھا۔ آنکھوں پر پٹی ہونے کی وجہ سے وہ بار بار چندن پر گر رہی تھی۔ گاڑی کو خاصے جھٹکے لگ رہے تھے۔

دس منٹ میں چندن چائے لے آئی۔ چائے کے ساتھ کھانے کی کچھ اشیاء بھی تھیں۔ چندن نے یہ بہت اچھا کیا تھا۔ اسے بھوک بھی لگ رہی تھی۔ اس نے چند بسکٹ لیے' تھوڑا سا خشک میوہ چکھا اور پھر چائے پی کر ذرا تازہ دم سی ہوگئی۔

''ورشا بی بی ...... چار بجنے والے ہیں۔ اب آپ سو جائیں اور مجھے بتائیں کہ آپ کو کتنے بجے آ کر اٹھاؤں۔''

''ایک قیدی کو اپنی مرضی سے سونے کی اجازت ہے؟'' ورشا نے مسکرا کر پوچھا۔

''آپ چاہیں تو پورا دن سو سکتی ہیں...... آپ کو مکمل آزادی ہے...... آنے والا تو رات کو آئے گا۔''

''اچھا!'' ورشا نے چندن کو گہری نظروں سے دیکھا۔ ''تم اسے جانتی ہو۔''

''نہیں بی بی ...... میں کسی کو نہیں جانتی۔'' چندن نے پھر سفید جھوٹ بولا۔

''چندن' تمہیں جھوٹ بولنا اچھا لگتا ہے؟'' ورشا نے اس کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھا۔ چندن نے اس کے سوال کا کوئی جواب نہ دیا۔ اس کے چہرے پر یکدم اداسی پھیل گئی۔ پھر وہ مری سی آواز میں بولی:

''ورشا بی' میں کب آ کر اٹھاؤں۔''

''گیارہ بجے تک آ جانا۔'' ورشا نے اسے بتایا۔

''اچھا ٹھیک ہے بی بی۔''

''چندن سنو۔'' جب وہ جانے لگی تو ورشا نے پیچھے سے آواز دی۔

چندن فوراً رک گئی۔ اس نے پلٹ کر دیکھا۔ ''جی بی بی۔''

''چندن میری ماں میرے لیے تڑپ رہی ہوگی' تم ایک کام کر دو۔ میں تمہیں ایک فون نمبر دیتی ہوں۔ اس نمبر پر فون کر کے صرف اتنا بتا دو کہ میں خیریت سے ہوں۔'' ورشا نے کہا۔

''کاش بی بی ...... میں ایسا کر سکتی۔ بی بی یہ حویلی ہے۔ آپ حویلی میں ہیں اور میں اس حویلی کا تنکا ہوں۔ ایک تنکا فون تک کیسے پہنچے گا' اس کا اندازہ آپ بخوبی کر سکتی ہیں۔'' اس نے التجا آمیز لہجے میں جواب دیا۔

''اچھا یوں کرو' میں چند لائنیں تمہیں لکھ کر دے دیتی ہوں' تم یہ خط لفافے میں رکھ کر اس پر پتہ لکھ کر پوسٹ کر دینا ...... یہ تو کر سکتی ہو؟ ورشا نے ایک اور راستہ بتایا۔

''ابھی جب میں یہاں سے باہر نکلوں گی تو میری اچھی طرح سے تلاشی لی جائے گی۔ بی بی اگر آپ چاہتی ہیں کہ میں خط لے جانے کے جرم میں پیشانی پر گولی کھا کر ماری جاؤں تو لائیں دے دیں ...... میں لے جاتی ہوں۔''

چندن نے یہ بات کچھ اس انداز میں کہی کہ ورشا پھر اسے مزید کچھ نہ کہہ سکی۔

اس نے خاموشی سے گردن ہلا کر اسے جانے کی اجازت دے دی' چندن بوجھل قدموں سے باہر نکل گئی اور اس نے باہر سے دروازہ بند کر کے تالا ڈال دیا۔

چندن کے جانے کے بعد ورشا کروٹ لے کر بیڈ پر لیٹ گئی۔ رات بھر کی جاگی ہوئی تھی۔ اس لیے آرام ملتے ہی اس کی آنکھوں میں نیند اترنے لگی۔

وقت مقررہ پر چندن نے اسے آ کر اٹھا دیا۔ دوپہر کے کھانے کے بعد وہ پھر سو گئی۔ شام کو اٹھی۔ چندن نے چائے کی ٹرے مع لوازمات اس کے سامنے رکھی۔ اس نے صرف چائے پی۔

شام کو سات بجے کے قریب چندن پھر آئی۔ اس نے رات کے کھانے کے بارے میں پوچھا۔ ورشا نے کوئی فرمائش نہ کی۔ ساڑھے آٹھ بجے کے قریب اسے کھانا پیش کیا گیا۔

نو بجے کے قریب جب ورشا کھانے اور چائے وغیرہ سے فارغ ہو گئی تو چندن نے ورشا سے کہا: ''بی بی' آپ منہ ہاتھ دھو لیں' میک اپ وغیرہ کر لیں' کپڑے تبدیل کر لیں۔''

''یہ سب میں کیوں کروں؟ تم نے مجھے کیا سمجھ رکھا ہے؟'' ورشا یکدم بپھر گئی۔

''بی بی' مجھ پر غصہ نہ ہوں...... میں نے آپ کو کچھ نہیں سمجھا۔ مجھے جیسے جیسے حکم ملتا جا رہا ہے' میں آپ کو بتاتی جاتی ہوں۔ میں حکم کی غلام ہوں۔''

''تمہیں جو کہا گیا...... وہ تم نے مجھے بتا دیا...... تمہارا کام ختم ہو گیا۔ بس اب تم جاؤ' مجھے جو کرنا ہو گا کر لوں گی۔ آنے والے کو آنے دو۔ میں اسے اچھی طرح سمجھا دوں گی۔ اس نے مجھے کوئی معمولی لڑکی سمجھ لیا ہے۔ شاید وہ نہیں جانتا کہ میں اس پر کس طرح قیامت بن کر ٹوٹوں گی۔''

''بی بی ...... میں آپ کو ایک مرتبہ پھر سمجھائے دیتی ہوں۔ وہ بہت ظالم ہے۔ ایک لمحے میں ریوالور پیشانی پر رکھ کر گولی داغ دیتا ہے۔ کوئی ایسا کام مت کیجئے گا کہ آپ کی ممی زندگی بھر روتی رہیں۔'' چندن نے بہت محبت سے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ انہی محبت بھرے لفظوں میں دھمکی بھی چھپی تھی۔

''تم فکر مت کرو چندن۔ اس ظالم کو آنے دو۔ میں اسے دیکھ لوں گی۔'' وہ کسی دھمکی میں آنے والی نہ تھی۔

چندن کے جانے کے بعد وہ بیڈ سے اٹھی۔ ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑے ہو کر اس نے اپنا جائزہ لیا۔ بہت ہلکا سا میک اپ کیا۔ کئی ڈریس وارڈ روب میں موجود تھے۔ وہ ڈریس بھی تبدیل کر سکتی تھی۔ اس زرد ساڑھی کو پہنے چوبیس گھنٹے سے زائد ہو گئے تھے۔ مسلسل باندھنے سے ساڑھی میں شکنیں پڑ گئی تھیں لیکن وہ اس ساڑھی کو تبدیل کرنا نہیں چاہتی تھی۔ لہٰذا اس نے ڈریس چھوڑ دیا۔ گلے میں ہلکا سا زیور پہن لیا اور پھر پاؤں لٹکا کر بیڈ پر بیٹھ گئی۔ اس کی نظریں بند دروازے پر تھیں اور وہ اس شخص کا بے چینی سے انتظار کر رہی تھی جس نے یہ سارا کھیل رچایا تھا۔ بالآخر اس کا انتظار ختم ہوا۔

دس بجے کے قریب دروازے پر آہٹ ہوئی۔ آہٹ ہوتے ہی ورشا کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ چند لمحوں کے بعد دروازہ کھلا اور ایک نوجوان بڑی تیزی سے اندر داخل ہوا اور پھر اس نے ایک جھٹکے سے دروازہ بند کر دیا۔ دروازہ ایک زوردار آواز کے ساتھ بند ہوا۔

پھر وہ ایک خاص اسٹائل سے چلتا ورشا کی طرف بڑھا اور اس سے چند قدم کے فاصلے پر رک گیا۔

وہ سفید قمیص شلوار میں تھا۔ گہرے نیلے رنگ کی کوٹی پہن رکھی تھی۔ سانولا رنگ، گھنے سیاہ بال، بھاری مونچھیں جو نیچے کو لٹکی تھیں۔ بڑی بڑی نشیلی آنکھیں، چوڑی پیشانی اونچا قد......

ورشا نے اسے اندر آتے ہوئے بڑی دلچسپی سے دیکھا۔ اسے وہ نوجوان کچھ جانا پہچانا سا لگا لیکن وہ اسے پہچان نہ پائی، لیکن اس کی چال ڈھال اور انٹری سے اندازہ لگا لیا کہ کوئی چھوٹے دماغ کا بگڑا ہوا رئیس ہے۔ اس طرح کے لوگ اس نے بہت دیکھے تھے۔ دن رات اس کی ممی کے گرد اسی طرح کے لوگوں کا جمگھٹا رہتا تھا۔ وہ اس سے کیا خوفزدہ ہوتی۔

''مجھے پہچانا۔'' اس کے لہجے میں تکبر تھا۔

''ہاں، ایسا لگا جیسے میں کسی فلم کے سیٹ پر دلہن بنی بیٹھی اپنے شوہر کا انتظار کر رہی ہوں کہ درمیان میں کوئی اور شخص کمرے میں داخل ہو جاتا ہے۔ میرا جی چاہا کہ آپ کے اندر داخل ہونے کے بعد کٹ کہوں اور شاٹ او کے ہونے کی نوید سنا کر آپ کی انٹری پر داد دوں۔ سائیں آپ تو پکے ولن لگتے ہو۔''

ورشا نے کچھ اس انداز سے یہ بات کہی کہ وہ قہقہہ لگائے بنا نہ رہ سکا۔

''بہت خوب...... آپ یہی سمجھو کہ کسی فلم کے سیٹ پر ہو۔ آج ایسی اداکاری کرو کہ ہمارا دل خوش ہو جائے۔ شاید تم نے مجھے پہچانا نہیں۔''

''کچھ پہچان گئی ہوں۔ کچھ اور پہچان جاؤں گی۔ کچھ اور کھل جائیں گے دو چار ملاقاتوں میں۔'' وہ ہنسی۔

''واہ...... تم آرٹ کا شاہکار تو ہو ہی باتیں بھی خوب کرتی ہو۔'' وہ خوش ہو کر بولا۔

''سائیں! آپ نے یہ ظلم مجھ پر کیوں کیا؟ کیا تاوان کے لیے۔''

''ظاہر ہے۔'' وہ ایک کرسی اٹھا کر بیڈ کے نزدیک بیٹھ گیا۔ ''ہماری واردات کا طریقہ ذرا مختلف ہے' ہم تاوان اس کے گھر والوں سے وصول نہیں کرتے' جس کو اٹھاتے ہیں' تاوان اسی سے وصول کرتے ہیں۔''

''اچھا جی...... '' ورشا نے مسکرا کر کہا۔ ''مجھ پر یہ عنایت کس لیے۔'' اس کے لہجے میں طنز تھا۔

''ہم نے تمہیں دیکھا' تمہیں چاہا اور پالیا۔'' اس نے دونوں ہاتھ اٹھا کر ڈرامہ بولا۔

''سائیں اس جملے میں تھوڑی سی ترمیم کر لیں۔ ابھی آپ نے مجھے دیکھا ہے۔ مان لیتی ہوں چاہا بھی ہو گا لیکن ابھی پایا نہیں ہے۔'' یہ کہہ کر وہ ایک خاص انداز میں مسکرائی۔

''پانے میں دو قدم کا فاصلہ ہے۔''

''کبھی کبھی دو قدم کا فاصلہ...... صدیوں کا فاصلہ بن جاتا ہے......'' اس کے لہجے میں بڑا یقین تھا۔

''تم نہیں جانتیں کہ وقت ہماری مٹھی میں ہے۔ زمین ہمارے قدموں تلے اور آسمان ہماری گرفت میں ہے۔''

''بڑے دعوے ہیں صاحب۔'' وہ ہنسی۔

''لگتا ہے کچھ زیادہ چڑھا گئے ہیں۔''

''ورشا...... تم خود ایک نشہ ہو...... تم......''

''بس' بس ...... میرے بارے میں کوئی عامیانہ سا جملہ نہ کہنا۔'' اس نے اسے فوراً روک دیا۔

''چلو نہیں کہتا...... کیا تم جانتی ہو کہ میں نے تمہیں پہلی بار کہاں دیکھا؟'' اس نے بات کا رخ بدلا۔

''نہیں جانتی۔'' ورشا نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''میں نے تمہیں پہلی بار طاہرہ زیدی کے ساتھ دیکھا تھا...... اس کی تصویروں کی نمائش میں۔'' اس نے بتایا۔

ایک دم ورشا کے ذہن میں جھماکا ہوا' وہ اسے فوراً یاد آ گیا۔

''اچھا تو تم وہ ہو؟''

''وہ کون؟'' اس نے حیران ہو کر پوچھا۔

''جس نے طاہرہ زیدی کی ایک شاہکار پینٹنگ کا ستیاناس مار دیا تھا۔ وہ تم تھے جس نے گولی چلا کر اس کی پینٹنگ میں سوراخ کر دیا تھا۔ سائیں آپ تو بڑے بدذوق آدمی ہیں۔''

''یہ مت بھولو کہ میں نے تمہیں پسند کیا ہے' کیا تمہیں پسند کرنے والا کوئی بدذوق ہو سکتا ہے۔''

''ہرگز نہیں...... لیکن اس کی نیت میں فتور تو ہو سکتا ہے۔'' ورشا نے اسے ترچھی نظروں سے

دیکھا۔ ''اچھا خیر پھر ہوا کیا؟ اس شام تو آپ مجھ تک نہیں پہنچے۔''

''بھئی اس شام یہ ہوا کہ جب میں نے آپ کو طاہرہ زیدی کے ساتھ کھڑا ہوا دیکھا تو میں ساری تصویروں کو بھول گیا۔ سوچا کہ اس آرٹ کے شاہکار کو حاصل کرلوں جب میں طاہرہ زیدی کے پاس پہنچا تو تم وہاں نہیں تھیں۔ میں بالکل اس کے سامنے پہنچ چکا تھا۔ تمہیں نہ پا کر میرا دماغ بھنا گیا۔ طاہرہ زیدی اس وقت مجھ سے مخاطب ہو چکی تھی۔ میں نے اس سے ایسے ہی تصویر خریدنے کی بات کردی۔ بات بڑھ گئی۔ مجھے غصہ آگیا۔ بس پھر ایک بار مجھے غصہ آجائے تو میرے ہاتھ سے گولی ضرور چل جاتی ہے اور اس کی پیشانی ضرور داغدار ہو جاتی ہے۔'' یہ بات کہتے کہتے اس کی آنکھوں میں درندگی عود کر آئی۔

''ہائے!'' اس نے فوراً اپنی آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیے۔

''سائیں مجھے ڈرائیں نہیں۔'' یہ کہہ کر اس نے فوراً اپنے دونوں پاؤں اٹھا کر بیڈ پر رکھ لیے۔ وہ ایک دم گھوم گئی تھی۔ اب اس کی طرف ورشا کی پیٹھ تھی۔

ورشا ویسے ہی کسی قیامت سے کم نہ تھی۔ وہ یونہی اچھے اچھوں کے ہوش اڑا دیتی تھی۔ اس وقت تو اس کی پیٹھ پر ساڑھی کا پلو بھی نہ تھا۔ چھوٹا سا بلاؤز' نیم عریاں پیٹھ...... وہ تو پاگل ہو اٹھا۔

''سائیں آپ کا نام کیا ہے؟'' وہ پیٹھ موڑے موڑے بولی۔ اس کی آواز میں ہیجان تھا۔

وہ محو نظارہ تھا۔ ایک دم چونکا اور بولا۔

''میرا نام اختر شاہ ہے......''

کرسی پر مزید بیٹھے رہنا' اب اختر شاہ کے بس سے باہر تھا۔ وہ بے قرار ہو کر اٹھا۔ ورشا یہی چاہتی تھی کہ وہ اٹھ کر اس کے نزدیک آئے۔ وہ زیر لب کوئی منتر پڑھ رہی تھی اور ساتھ ہی کہتی جاتی تھی۔

''اعور آ...... اعور مدد......''

اختر شاہ بالکل اس کے پیچھے کھڑا ہو گیا اور اس کے بے چین ہاتھوں نے وہ کر دیا جس بات کی وہ منتظر تھی۔ بلاؤز کھلتے ہی اختر شاہ کی آنکھیں خوف سے پھیل گئیں۔ ایک خوفناک بچھو اس کی پیٹھ پر حرکت میں تھا۔ وہ اس نظارے کی تاب نہ لا سکا۔ پلٹ کر دروازے کی طرف بھاگا۔ اس نے دھاڑ دھاڑ دروازہ کھٹکھٹایا۔ دروازہ بلا تاخیر کھل گیا۔

ورشا نے اپنا بلاؤز درست کر کے پلٹ کر دروازے کی طرف دیکھا تو وہ اسے تیزی سے نکلتا ہوا نظر آیا۔ فوراً دروازہ بند ہو گیا۔ ورشا نے اس کی اس حالت پر ایک زوردار قہقہہ لگایا۔

''چھوٹے دماغ کا...... آیا تھا مجھے پانے......''

☆......☆......☆

تھوڑی دیر کے بعد دروازہ کھلا۔

وہ دونوں اندر داخل ہوئے۔ اسے دیکھ کر ایک دم پریشان ہو گئے۔ وہ قالین پر بیٹھا ہوا تھا

اور اپنے ہوش و حواس میں تھا۔ کالی چادر قبر پر سے اتری ہوئی تھی۔
واسم نے سوناں کو اور سوناں نے واسم کو سہمی ہوئی نظروں سے دیکھا۔ برکھا نے کہا کہ کوئی غلطی نہ ہو لیکن غلطی ہو گئی تھی۔ وہ شیشی جس میں سرخ پانی تھا' وہ ڈیش بورڈ میں رکھی رہ گئی تھی۔
''سوناں آؤ۔'' واسم نے اس کا ہاتھ پکڑ کر گھسیٹا۔
وہ دونوں تیزی سے باہر نکل گئے اور دروازہ پھر سے بند ہو گیا۔
ان دونوں کو دیکھ کر ساحل عمر کو یہ اندازہ تو ہو گیا کہ وہ کن لوگوں میں ہے' لیکن یہ اندازہ نہ لگا پایا کہ وہ کس جگہ پر ہے۔ اس کمرے میں ایک قبر ہے۔ یہ کس کی قبر ہے؟
قبر پر جو پتھر نصب تھا اس پر صاحب قبر کا نام چتر وبھیل لکھا تھا۔ اس شخص کا پانچ سال پہلے انتقال ہوا تھا۔ پتہ نہیں یہ کون شخص تھا اور اسے بے ہوش کر کے اس کی قبر پر کس مقصد کے لیے لٹایا گیا۔ اس کام کے پیچھے کوئی نیک مقصد تو ہو نہیں سکتا تھا۔
ساحل عمر ابھی اسی طرح کی باتیں سوچ رہا تھا کہ دروازے پر کھڑکھڑاہٹ ہوئی۔ چند لمحوں بعد پھر دروازہ کھلا۔ دروازے پر سوناں نظر آئی۔ اس کے ہاتھ میں ٹرے تھی جس میں چائے اور کچھ کھانے پینے کا سامان نظر آ رہا تھا۔ سوناں چپل اتار کر اندر آئی۔
اس نے خاموشی سے ساحل عمر کے سامنے ٹرے رکھ دی۔ ساحل عمر کو بہت زور کی بھوک لگی تھی۔ سامنے ناشتے کا بھرپور سامان موجود تھا۔ وہ سوناں سے بغیر کوئی بات کیے ناشتے میں مصروف ہو گیا۔

سوناں نے کالی چادر جو قالین پر پڑی تھی دوبارہ قبر پر ڈال دی اور دو زانو ہو کر اس کے سامنے بیٹھ گئی۔ ناشتہ کرتے کرتے جب ساحل عمر نے سوناں کی طرف دیکھا تو اس نے اسے آنکھیں موندے کچھ پڑھتے ہوئے پایا۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھ سر پر رکھے ہوئے تھے اور وہ بہت تیزی سے کچھ پڑھ رہی تھی۔
ساحل عمر اسے دیکھتا رہا اور ناشتہ کرتا رہا۔ سرخ پانی کی دو بوندیں چائے میں اس طرح شیر وشکر ہو گئی تھیں کہ یہ احساس ہی نہیں ہوا کہ چائے میں کچھ ملایا گیا ہے لیکن یہ دو بوندیں اس قدر تیز اثر تھیں کہ چائے کا کپ خالی ہوتے ہوتے اس کے دماغ میں غبار چھانے لگا۔ غنودگی سے آنکھیں بند ہونے لگیں۔

کچھ دیر کے بعد اس نے ایک زوردار جمائی لی اور پھر قالین پر لڑھکتا چلا گیا۔
اسے لڑھکتا دیکھ کر سوناں فوراً اٹھی۔ اس نے ٹرے اٹھائی اور دروازے سے باہر نکل گئی۔
کچھ دیر کے بعد واسم اور سوناں دونوں کمرے میں داخل ہوئے۔ دونوں نے مل کر اسے پھر قبر پر لٹایا۔ اس کے ہاتھ پاؤں ہلا کر دیکھے۔ وہ بے جان ہو چکے تھے۔ ساحل عمر اب ہوش و حواس سے بیگانہ ہو چکا تھا۔ ساحل عمر کی طرف سے اس نے جیب سے موبائل فون نکالا۔ گھڑی پر نظر ڈال کر اس نے برکھا کا نمبر ڈائل کیا اور ادھر سے ریسیور اٹھائے جانے کا انتظار کرنے لگا۔
''کون؟'' ادھر سے برکھا کی آواز سنائی دی۔

''برکھا جی...... واسم بول رہا ہوں۔''

''ہاں واسم ادھر سب خیر ہے۔ جو بتایا تھا اس پر عمل ہو رہا ہے؟'' برکھا نے پوچھا۔

''ہاں، برکھا جی...... آپ کے حکم کے مطابق حرف بہ حرف عمل ہو رہا ہے۔'' واسم نے بڑے یقین سے جھوٹ بولا۔

''اس وقت کہاں ہے وہ؟'' پوچھا گیا۔

''استھان پر لیٹا ہے۔'' جواب دیا گیا۔

''لیٹا نہیں، لیٹے کہو...... تم داس ہو اس کے...... کیا تم نہیں جانتے کہ اس کا مقام کیا ہے؟''

برکھا کی آواز کرخت ہو گئی۔

''برکھا جی، غلطی ہو گئی۔ آیندہ ایسا نہ ہوگا؟'' واسم نے فوراً معافی مانگ لی۔

''سوناں کہاں ہے؟''

''وہ یہیں ہے؟''

''اسے فون دو۔'' برکھا نے حکم دیا۔

''جی اچھا۔'' یہ کہہ کر اس نے موبائل سوناں کے ہاتھ میں دے دیا۔ موبائل سنبھال کر وہ بڑے مودبانہ لہجے میں بولی۔

''جی، برکھا جی......''

''تیرا پاٹھ جاری ہے؟''

''جی، برکھا جی...... پاٹھ جاری ہے۔'' اس نے فوراً کہا۔

''چترو بھیل نظر آیا۔'' برکھا نے پوچھا۔

''ابھی نہیں۔'' سوناں نے جواب دیا۔

''برکھا جی، آپ کب آ رہی ہیں۔''

''میں اب تک وہاں پہنچ جاتی مگر ادھر ایک گڑبڑ ہو گئی ہے...... کسی نے ورشا کو اغوا کرلیا ہے۔''

''ارے...... یہ کس کی کم بختی آئی جو ہماری راجکماری کو اٹھا لیا۔ آپ کہیں تو واسم کو ادھر بھیج دوں۔''

سوناں نے واسم کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''نہیں، اس کو وہیں رہنے دو...... میں دیکھ رہی ہوں۔''

''جب اس کی ضرورت ہوئی بلالوں گی۔'' برکھا نے کہا۔

''دیکھو ایک بات کا خیال رکھنا، فارم کا کوئی ملازم کاٹیج میں داخل نہ ہو۔''

''آپ بے فکر رہیں برکھا جی۔'' سوناں نے اسے یقین دلایا۔ پھر جیسے ہی اس کی نظر قبر پر پڑی تو وہ خوفزدہ ہو کر چیخی۔ ''ارے، یہ کیا ہو رہا ہے؟''

☆......☆......☆

سوناں کی یہ بات سن کر برکھا پریشان ہو گئی۔ اس نے ادھر سے پرتشویش لہجے میں پوچھا۔

''سوناں کیا ہوا؟''

موبائل فون سوناں کے کان سے لگا ہوا تھا اور آنکھیں قبر پر جمی ہوئی تھیں۔ سامنے جو ہو رہا تھا اس نے زبان گنگ اور کان بہرے کر دیئے تھے۔ وہ سن رہی تھی لیکن سمجھ نہیں رہی تھی۔ بولنا چاہ رہی تھی لیکن زبان ساتھ نہیں دے رہی تھی۔

تب برکھا بہت غصے سے چیخی۔ ''کتیا کی بچی بولتی کیوں نہیں؟''

''برکھا جی...... بتاتی ہوں' بتاتی ہوں۔'' وہ بہ مشکل بولی۔

''فون واسم کو دے۔'' برکھا نے حکم دیا۔

سوناں نے فون فوراً واسم کی طرف بڑھا دیا۔ وہ خود پریشان ہو گیا تھا۔ وہ قبر کو بغور دیکھ رہا تھا۔ وہ سمجھا برکھا نے فون بند کر دیا ہے' لہٰذا سوناں نے اسے موبائل فون واپس کر دیا ہے کہ وہ جیب میں ڈال لے۔ واسم نے فون آف کر کے جیب میں ڈال لیا۔ اس کی نظریں قبر پر جمی ہوئی تھیں۔

جو کچھ ہوا تھا آناً فاناً ہوا تھا۔ بس چند لمحوں میں کھیل مکمل ہو گیا تھا۔ قبر اچانک دو حصوں میں تقسیم ہوئی تھی اور ساحل عمر جو قبر پر لیٹا ہوا تھا مع چادر اندر چلا گیا تھا اور وہ پھر قبر اپنی جگہ آ گئی تھی۔

وہ دونوں گم صم حیران پریشان اس قبر کو دیکھ رہے تھے جو ساحل عمر کو نگل گئی تھی۔ اب یہ احساس ہی نہ رہا تھا کہ چند لمحے قبل یہ قبر شق ہوئی تھی۔

فون بند ہونے پر برکھا کو بڑا غصہ آیا۔ اس نے جلدی جلدی دوبارہ ڈائل کیا۔ رنگ ہونے پر واسم نے جلدی سے موبائل فون جیب سے باہر نکالا اور کان سے لگا کر بولا:

''ہیلو!''

''ہیلو کے بچے......تو نے فون کیسے بند کیا؟'' برکھا دھاڑی۔

''برکھا جی...... مجھے سوناں نے فون دیا تو میں سمجھا اس نے مجھے فون رکھنے کو دیا ہے۔'' اس نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

''تم دونوں پاگل ہو گئے ہو کیا؟ آخر ہوا کیا ہے؟''

''برکھا جی......استھان دو حصوں میں تقسیم ہوا اور ساحل صاحب اندر چلے گئے۔''

''یہ کیا بکواس کر رہا ہے تو؟''

''میں سچ کہہ رہا ہوں برکھا جی...... بے شک آپ سوناں سے بات کر لیں۔''

''سوناں' برکھا جی سے بات کرو۔'' واسم نے موبائل فون اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

''ہیلو!'' سوناں نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔

''سوناں...... یہ کیا بکواس کر رہا ہے؟''

''ایسا ہی ہوا ہے برکھا جی...... استھان نے ساحل جی کو نگل لیا۔ چترو بھیل لے گیا انہیں۔'' سوناں نے مزید وضاحت کی۔

''میں دیکھ لوں گی' اس نٹ کی اولاد کو...... یہ سب میری غیر موجودگی کی وجہ سے ہوا ہے۔

میں وہاں ہوتی تو وہ ایسی جرأت نہ کر پاتا۔ میں ادھر ورشا کی وجہ سے پھنس گئی۔ میں نمٹ لوں گی اس سے۔تم لوگ وہیں رہو۔سوناں تو نے استھان ایک منٹ کو خالی نہیں چھوڑنا ہے' تو سمجھ گئی ہے ناں!"

"جی برکھا جی۔" وہ سہم کر بولی۔

"اور سن...... میں تجھے کچھ پاٹھ بتاتی ہوں۔ وہ وہاں بیٹھ کر پڑھ۔ مجھے جیسے ہی ورشا کے بارے میں کچھ معلوم ہوا تو اس معاملے سے نمٹ کر میں فوراً وہاں پہنچ جاؤں گی۔ ٹھیک ہے سوناں۔ دیکھ ذرا ہوشیاری سے رہنا' بس تو استھان سے ضرورت کے وقت نکلے گی۔ تیرا کھانا پینا وہیں ہوگا۔ واسم تیرے کھانے پینے کا بندوبست کرے گا۔" یہ کہہ کر برکھا نے فون بند کردیا اور ایک گہرا سانس لیا۔

وہ خاصی پریشان ہوگئی تھی۔ ہر طرف سے اسے ناکامی کا منہ دیکھنا پڑ رہا تھا۔

ورشا کو اس نے ایک خاص مشن پر بھیجا تھا۔ ورشا وہاں وقت پر نہ پہنچ سکی جس کی وجہ سے برکھا کی ایک بڑے آدمی کے ساتھ ناراضگی ہوگئی۔ چلو ناراضگی تو کوئی اتنا بڑا مسئلہ نہ تھا وہ کسی اور موقع پر اس بڑی شخصیت کو منا لے گی۔ مسئلہ ورشا تھی۔ جانے وہ کہاں غائب ہوگئی۔ جانے اس پر کیا بیتی۔

ابھی وہ ورشا کے غائب ہونے کا معمہ حل نہ کر پائی تھی کہ وہ شکاری ناصر مرزا گھر میں آ کودا۔ اس نے اسے سزا دینا چاہی تو وہ صاف بچ نکلا۔ برکھا کو اپنے وار کی ناکامی پر بڑی حیرت ہوئی۔ وہ شاید کہیں سے کچھ سبق پڑھ کر آ گیا تھا۔ خیر اس سے وہ اچھی طرح نمٹ لے گی۔

اس کا اصل مشن تو ساحل عمر تھا۔ اس کی زندگی کا حاصل ...... جسے اس نے بڑی مشکل سے تلاش کیا تھا اور ایک لمبے عرصے سے اس کے پیچھے لگی تھی۔ اب جبکہ کامیابی نزدیک تھی' وہ اس کی بلی دے کر "مانا" کو حاصل کرسکتی تھی اور مانا کے ذریعے کتاب سحر "ربطول" تک رسائی ممکن تھی کہ درمیان میں یہ حادثہ پیش آ گیا۔

چتر وبھیل آخر رہا جنگلی کا جنگلی۔ یہ ٹھیک ہے کہ وہ صحرا کا بڑا جادوگر تھا اور اس کا استھان ساحل عمر کی بلی کے لیے ایک سیڑھی تھا' لیکن معلوم ہوتا ہے کہ چتر وبھیل کی ساحل عمر کو دیکھ کر خود نیت خراب ہوگئی۔ سوال یہ ہے کہ اسے دنیا سے اٹھے ہوئے پانچ سال ہو چکے ہیں۔ ساحل عمر سے اب وہ کیا فائدہ حاصل کرسکتا ہے۔ وہ اسے کیوں لے گیا؟"

وہ سوچتی رہی اور اپنی ناکامیوں پر پریشان ہوتی رہی۔ بالآخر اس کا دماغ سن ہوگیا۔ اس نے پوری رات جاگ کر گزاری تھی۔ اس کی آنکھوں میں نیند اترنے لگی۔ تھوڑی دیر میں وہ سوگئی۔

وہ جانے کب تک سوتی رہتی کہ کسی نے گیٹ پر لگی کال بیل کا بٹن دبایا۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔ اس نے دیوار پر لگی گھڑی پر نظر ڈالی۔ وہ کئی گھنٹے سو چکی تھی۔ وہ تیزی سے اٹھ کر گیٹ کی طرف بھاگی۔ کال بیل ایک مخصوص انداز میں بجائی جارہی تھی اور یہ وہ انداز تھا جس سے برکھا کے دل کی دھڑکن تیز تر ہوتی جارہی تھی۔

گیٹ پر پہنچنے سے پہلے برکھا نے زور سے آواز لگائی۔

"آرہی ہوں۔"

پھر گیٹ کھولنے سے پہلے اس نے گیٹ کے درمیان سے جھانک کر دیکھا۔ وہ سامنے کی

کھڑی تھی۔ برکھا نے بڑی بے قراری سے گیٹ کھولا۔
گیٹ کھلتے ہی وہ اندر آ گئی اور اس سے لپٹ گئی۔ وہ ورشا تھی۔
''اوہ' میری جان...... تو کہاں چلی گئی تھی۔'' برکھا نے اسے اپنی بانہوں میں سمیٹ لیا۔
''مائی سویٹ ممی......'' کہہ کر وہ آہستگی سے الگ ہوگئی جبکہ برکھا چاہتی تھی کہ وہ اس کے سینے سے لگی رہے تا کہ وہ اسے بھینچ بھینچ کر پیار کر سکے مگر برکھا کے جسم سے اٹھتی بدبو نے اسے مجبور کر دیا کہ وہ فوراً اس کے سینے سے الگ ہو جائے۔
برکھا نے جلدی سے گیٹ بند کیا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر بڑے پیار سے دیکھتی ہوئی اپنے بیڈروم میں لے آئی۔ راستے میں اس نے اس سے کوئی بات نہ کی۔
ورشا انہی کپڑوں میں تھی جن میں گھر سے نکلی تھی لیکن ان کپڑوں کی حالت تباہ ہو رہی تھی۔
برکھا نے اسے فوراً بیڈ پر لٹا دیا اور نرم ملائم تکیے اس کے سر کے نیچے رکھ دیئے اور ورشا کا حسین ہاتھ پکڑ کر اسے پیار بھری نظروں سے دیکھنے لگی۔
''کیا دیکھ رہی ہو ممی؟'' ورشا نے پوچھا۔
''تجھے دیکھ رہی ہوں میری جان...... تو خیریت سے تو ہے ناں!''
''ہاں ممی...... میں خیریت سے ہوں' بس ذرا تھک گئی ہوں...... لمبا سفر کر کے آئی ہوں ناں۔''
''ہوا کیا تھا؟''
''مجھے اغوا کیا گیا تھا۔''
''کون تھے وہ لوگ؟'' برکھا نے غصے سے کہا۔
''ممی تھے نہیں ...... تھا...... اغواء تو مجھے کئی بندوں نے کیا تھا لیکن اغوا کروانے والا ایک تھا۔''
''کون ہے وہ کتے کا بچہ...... میں اس کی سات پشتوں کو جلا کر راکھ کر دوں گی۔'' وہ طیش میں آ گئی۔
''ممی اختر شاہ...... تم اسے ضرور جانتی ہو گی۔''
''اختر شاہ......؟'' برکھا نے اپنی یادداشت کو کھنگالا۔
''ارے' وہ فیروز شاہ کا بیٹا تو نہیں۔''
''جی امی...... وہی۔'' ورشا نے بتایا۔
''باپ کے مرنے کے بعد اب وہ بالکل ہی بے لگام ہو گیا معلوم ہوتا ہے۔ اپنی زندگی میں بھی فیروز شاہ اس کی آوارگیوں پر نالاں رہتے تھے۔ اچھا تو یہ حرکت اس کی تھی۔ کیا چاہتا تھا وہ؟''
''ایک آوارہ نوجوان جس کے پاس بے پناہ دولت ہو' کیا چاہ سکتا ہے؟'' ورشا نے سوال نما جواب دیا۔
''لیکن اس نے تجھے دیکھا کہاں؟'' برکھا حیرت زدہ تھی۔

''میرا فیروز شاہ کے پاس آنا جانا تھا' لیکن میں نے آج تک اختر شاہ کو نہیں دیکھا تھا۔ تو اس نے تجھے کیسے دیکھ لیا۔''

''اس نے مجھے ایک پینٹنگ کی نمائش میں دیکھا تھا۔ اسی نمائش میں جہاں ساحل عمر سے میری پہلی ملاقات ہوئی تھی۔'' ورشا نے بتایا۔

''وہ جاہل پینٹنگ کی نمائش میں کہاں آ پہنچا۔''

''پتہ نہیں ممی...... ویسے وہ ہے بہت وحشی...... ایک لمحے میں بندے کی پیشانی پر ریوالور رکھ کر اسے ختم کر دیتا ہے۔ اس کے لوگوں میں اس کی بڑی دہشت ہے۔ وہاں ایک چندن نام کی عورت بھی تھی' اس کو جب معلوم ہوا کہ میں آپ کی بیٹی ہوں تو اس نے میرا بہت خیال رکھا لیکن وہاں سے نکالنے میں وہ میری کوئی مدد نہ کر سکی۔ وہ اختر شاہ کے نام سے کانپتی تھی۔''

''چندن' وہ گوری سی چھوٹے قد کی عورت تو نہیں۔'' برکھا نے پہچان بتائی۔

''جی وہی۔'' ورشا نے تصدیق کی۔

''وہ فیروز شاہ کی خاص خادمہ تھی' مجھ سے اس نے اپنے شوہر کے لیے ایک پڑیا لی تھی۔''

''ہاں' وہ بتا رہی تھی۔'' ورشا نے کہا۔ پھر مسکرا کر بولی:

''ممی' یہ اختر شاہ تو بہت ڈرپوک نکلا۔''

''کیا ہوا؟'' برکھا نے حیران ہو کر اسے دیکھا۔

''میں نے پیٹھ موڑ کر جب اعور کی ایک جھلک دکھائی تو وہ اس بری طرح بھاگا کہ میں قہقہہ لگائے بنا نہ رہ سکی۔ ممی ایک اتنا نڈر شخص کہ ایک لمحے میں گولی مار کر بندے کو پرے پھنکوا دے' اتنا بزدل بھی ہو سکتا ہے کہ پیٹھ پر حرکت کرتا ہوا بچھو دیکھے اور خوفزدہ ہو کر کمرے سے بھاگ جائے۔ نہ صرف بھاگ جائے بلکہ اپنے قیدی کو آزاد کرنے کا حکم بھی دے دے۔'' ورشا اس وقت کا تصور کر کے پھر ہنس پڑی۔

''ہاں' ایسا ہو سکتا ہے میری جان...... دور کیوں جاؤ' تمہارا باپ ایک انتہائی نڈر شخص تھا لیکن کبھی ٹہلتے ہوئے سڑک پر کوئی کتا دکھائی دے جاتا تو یقین کرو' وہ میرے پیچھے ہو جاتا تھا۔'' یہ کہہ کر وہ مسکرائی۔

''میں ایک اور ایسے شخص کو جانتی ہوں کہ اگر اس کے سامنے کوئی شیر آ جائے تو وہ اس سے نہ ڈرے لیکن لال بیگ کو دیکھ کر اس کی جان نکل جاتی تھی۔ اسے صوفے کے پیچھے سے نکالنے کے لیے مجھے لال بیگ کو مارنا پڑتا۔''

''صوفے کے پیچھے سے نکالنے کے لیے؟'' ورشا نے دہرایا۔ ''میں کچھ نہیں۔''

''لال بیگ کو دیکھ کر وہ صوفے کے پیچھے چھپ جاتا تھا۔'' برکھا نے وضاحت کی۔

''اچھا!'' ورشا نے ہنستے ہوئے کہا۔

''ورشا' تیرے یوں اچانک غائب ہو جانے کی وجہ سے میں بہت پریشان ہو گئی تھی۔ رات بھر میں نے جاگ کر گزاری ہے۔ بس اب تھوڑا سا سوئی تھی۔ اب تو یوں کر کہ نہا دھو لے۔ کپڑے

تبدیل کر لے۔ میں تیرے لیے چائے بناتی ہوں۔ چائے پی کر تم سو جانا۔'' برکھا نے اسے پیار بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے مشورہ دیا۔

''ٹھیک ہے ممی۔'' ورشا نے بڑی فرماں برداری سے کہا اور واش روم کی طرف چلی گئی۔

دس پندرہ منٹ کے بعد جب شاور لے کر نکلی تو برکھا اس کے لیے چائے تیار کر چکی تھی۔ وہ اس کی منتظر تھی۔ سرخ پانی کے دو قطرے اس نے ورشا کے خالی کپ میں ڈال دیئے تھے۔ جب وہ نہا دھو کر نکلی تو اس نے کپ میں چائے انڈیل دی۔ ورشا پاپڑ بہت شوق سے کھاتی تھی۔ برکھا نے دوسرے لوازمات کے ساتھ اس کے لیے چند پاپڑ بھی تل دیئے تھے۔

چائے سے فراغت کے بعد ہی ورشا کو نیند نے آ گھیرا۔ اس نے منہ پھاڑ کر جمائی لی اور اٹھتے ہوئے بولی۔ ''اچھا ممی' میں اپنے کمرے میں چلتی ہوں۔ مجھے نیند آ رہی ہے۔''

''ٹھیک ہے۔ تم سو جاؤ۔'' برکھا نے کہا۔ ''میں رات کا کھانا ہاٹ پاٹ میں تمہارے کمرے میں رکھ دوں گی۔ جب آنکھ کھلے کھا لینا۔ تم کچن میں جانے' کھانا گرم کرنے کی الجھن سے بچ جاؤ گی۔''

''اچھا ممی۔'' ورشا پر نیند طاری ہو رہی تھی' اس لیے اس نے آدھی بات سنی۔ آدھی نہیں سنی اور اپنے کمرے میں آ کر کسی شہتیر کی طرح بیڈ پر گری اور سو گئی۔

برکھا کچھ دیر کے بعد ورشا کے بیڈ روم میں داخل ہوئی۔ وہ بالکل بے خبر بکھری ہوئی بیڈ پر سو رہی تھی۔ برکھا نے اپنی بیٹی کے چہرے پر نظر ڈالی۔ وہ کچھ دیر پہلے نہائی تھی' اس لیے اس کے بال کھلے ہوئے تھے۔ اس کے ریشم جیسے بال تکیے پر ڈھیر تھے۔ چہرے پر جوانی کی چمک تھی۔ گھنیری پلکیں خوبصورت آنکھوں پر پہرہ دے رہی تھیں۔ بھرے ہوئے گلابی لب دو کلیوں کی طرح لپٹے ہوئے تھے۔ برکھا اسے کچھ دیر بڑے غور سے دیکھتی رہی۔ اچانک اسے اپنی جوانی یاد آ گئی۔ کبھی وہ بھی اتنی ہی حسین تھی یا شاید ورشا سے بھی دلکش...... یہ حسن چلا کیوں جاتا ہے؟ جوانی ختم کیوں ہو جاتی ہے؟ جوانی آ کر ٹھہر کیوں نہیں جاتی۔ اگر ایسا ہوتا کہ جوانی آ کر جانے کا نام نہ لیتی تو کس قدر اچھا ہوتا۔ وہ اس مسئلے پر تحقیق کرے گی۔ کوئی ایسا عمل ضرور ہوگا جس کے کرنے سے جوانی ٹھہر جاتی ہوگی یا گزری ہوئی جوانی کو واپس لایا جاسکتا ہوگا۔ اس کا شیطانی ذہن اس مسئلے کی طرف راغب ہو گیا تھا۔

پھر فوراً ہی اسے ساحل عمر کا خیال آیا۔ ابھی تو ساحل عمر فوری مسئلہ تھا۔ وہ ہاتھ سے نکلا جا رہا تھا۔ پہلے اسے حاصل کرنا تھا۔ پھر اس کی بلی دے کر ''مانا'' کا مالک بننا تھا۔ مانا کے مل جانے کے بعد اس سے مدد لی جاسکتی تھی۔ طویل عمر کے ساتھ مستقل جوانی کا راز معلوم کیا جاسکتا تھا۔ برکھا اصل میں ورشا کے کمرے میں یہ دیکھنے آئی تھی کہ وہ گہری نیند سو گئی یا نہیں۔ یہاں آ کر وہ اس کے چہرے میں کھو گئی اور کہاں سے کہاں بھٹک گئی۔ اسے گہری نیند میں دیکھ کر وہ واپس اپنے کمرے میں آ گئی۔ اپنے کمرے میں آ کر وہ ٹیلی فون ملانے لگی۔

''ہیلو!'' ادھر سے واسم نے کال ریسیو کی۔

''ہاں واسم' کیا صورت حال ہے؟'' برکھا نے واسم کی آواز پہچان کر سوال کیا۔

سے صورت حال بتائی۔

''ابھی تو کچھ پتہ نہیں چلا۔'' واسم نے صورت حال بتائی۔

''سوناں کہاں ہے؟''

''اندر استھان پر...... آپ کے حکم کے مطابق وہاں سے ہلی نہیں ہے۔''

''بہت اچھی بات ہے...... ذرا اس کو فون دو۔''

کچھ دیر فون پر خاموشی چھائی رہی' پھر سوناں کی آواز سنائی دی۔ ''جی' برکھا جی۔''

''ہاں' سوناں پاٹھ جاری ہے۔''

''برکھا جی' پاٹھ تو جاری ہے لیکن وہ پکڑ میں نہیں آ رہا۔''

''وہ جنگلی اتنی آسانی سے پکڑ میں نہیں آئے گا۔ ٹھہر میں آتی ہوں۔ سوناں ایسا کر' واسم کو فوراً میرے پاس بھیج دو۔'' اس نے حکم دیا۔

''جی...... اچھا۔'' سوناں نے فرماں برداری سے کہا۔

واسم اس کا حکم سنتے ہی فوراً چل پڑا۔ جب وہ بنگلے پر پہنچا تو برکھا اس کا بے چینی سے انتظار کر رہی تھی۔ اس نے ورشا کے لیے کھانا رکھ دیا تھا اور اس کے کمرے کو باہر سے تالا لگا دیا تھا۔ وہ ورشا پر یہ ظاہر نہیں کرنا چاہتی تھی کہ وہ گھر میں نہیں ہے۔ گھر سے نکل کر اس نے بنگلے کے گیٹ پر بھی تالا لگا دیا اور واسم کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ کر فوراً ہی ''استھان'' کی طرف چل دی۔

کوئی سوا بارہ کا عمل ہو گا کہ اچانک ورشا کی آنکھ کھل گئی۔ کمرے میں گھپ اندھیرا تھا۔ اس نے اٹھ کر لائٹ جلائی۔ گھڑی میں وقت دیکھا تو آدھی رات گزرنے کا احساس ہوا۔

بیڈ کی سائیڈ ٹیبل پر ہاٹ پاٹ موجود تھا۔ اسے بڑی حیرت ہوئی کیونکہ برکھا کچن میں بالکل نہیں گھستی تھی۔ کچن کا زیادہ تر کام ورشا کو کرنا پڑتا تھا لیکن آج وہ اتنی مہربان ہوئی تھی کہ شام کو اس نے نہ صرف چائے مع لوازمات بنا کر پلائی تھی اور اب کھانا بھی تیار کر کے اس کے سرہانے رکھ دیا تھا کہ رات کو جب بھی اس کی آنکھ کھلے تو گرما گرم کھانا مل جائے۔

پھر ایک دم ہی ایک خیال اس کے دماغ میں آیا۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ اسے کھانا دے کر کمرے میں بند کر دیا گیا ہو۔ وہ فوراً دروازے کی طرف بڑھی۔ دروازہ کھول کر دیکھا تو وہ نہیں کھلا۔ اس کا خیال درست نکلا' آج پھر اس کی ممی کسی ''واردات'' میں مصروف تھی۔

اسے بے اختیار ساحل عمر یاد آیا۔ ساحل عمر کے بارے میں برکھا نے صرف اتنا بتایا تھا کہ ساحل عمر بنگلے پر آیا تھا اور اس نے اسے واسم کے ساتھ کہیں بھیجا ہے۔ یہ بات بھی ورشا کو اس وقت بتائی گئی تھی جب ناصر اور مسعود اس کی تلاش میں بنگلے پر آ گئے تھے اور انہیں ٹالنے کے لیے برکھا نے اسے گیٹ پر بھیجا تھا۔

اس نے بیڈ پر بیٹھ کر فون اپنی گود میں رکھا اور ساحل عمر کے گھر کا نمبر ڈائل کرنے لگی۔ اس کی نظریں گھڑی پر تھیں۔ یہ وقت اگرچہ فون کرنے کا نہ تھا' پھر بھی وہ فون کرنے بیٹھ گئی۔ اگر اس نے فون اٹھا لیا تو ٹھیک ہے' ورنہ بند کر دے گی۔

دو گھنٹیوں کے بعد فون تو ادھر سے اٹھا لیا گیا لیکن یہ آواز ساحل عمر کی نہ تھی۔ اماں ''ہیلو''

"چلو" کرتی رہ گئیں۔
درشا نے خاموشی سے فون بند کر دیا۔ اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ فون اماں نے کیوں اٹھایا' کیا
ساحل عمر گھر پر نہیں ہے یا اتنی جلدی سو گیا ہے۔
وہ سویا کہاں تھا' اسے تو سلا دیا گیا تھا اور کوشش یہ تھی کہ وہ سوتا ہی رہے۔ اسے سرخ پانی
کے قطرے مسلسل دیئے جا رہے تھے۔ بیچ میں ذرا وقفہ آیا تو وہ جاگ گیا تھا اور ہوش آنے پر اس نے
خود کو کسی قبر پر لیٹا پایا تھا۔ ابھی وہ حالات کا جائزہ ہی لے رہا تھا اور معاملات کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا
کہ پھر سے اس پر نیند کا غلبہ ہو گیا تھا۔
اس مرتبہ جو اس کی آنکھ کھلی تو اس نے خود کو ریت پر لیٹا ہوا پایا۔ شام کا وقت تھا۔ سورج
آگ کا گولا بنا زمین کے اوپر جھک رہا تھا۔ ساحل عمر کے پیروں کی طرف کوئی بیٹھا تھا۔ وہ جو بھی تھا'
اپنا منہ گھٹنے میں دبائے بیٹھا تھا۔ اس کا سر گنجا تھا۔ وہ گیروے رنگ کے کپڑے پہنے ہوئے تھا۔ اس کے
کندھے پر گیروے رنگ کی ہی چادر پڑی تھی۔ ابھی ساحل عمر اس بیٹھے ہوئے شخص کو حیرت سے دیکھ رہا
تھا کہ اس نے اچانک اپنا سر گھٹنوں کے درمیان سے نکالا اور گردن موڑ کر ساحل عمر کی طرف دیکھا۔
وہ ایک لمبے چہرے کا کرخت صورت شخص تھا۔ وہ کلین شیو تھا حتیٰ کہ اس کی بھنویں تک
صاف تھیں۔ اس کے چہرے میں جو سب سے زیادہ نمایاں چیز تھی' وہ اس کی آنکھیں تھیں۔ انتہائی بڑی
اور بالکل گول اس کی آنکھیں دیکھ کر الو کی آنکھیں یاد آتی تھیں۔
وہ اسے دیکھ کر فوراً کھڑا ہو گیا۔ اس نے کندھے پر پڑی چادر کو اپنے سر پر صافے کی طرح
باندھا اور ساحل عمر کو ایک انگلی سے اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کیا اور یہ دیکھے بغیر کہ ساحل عمر اس کے
پیچھے چل پڑا ہے یا نہیں' وہ ایک طرف چل دیا۔
ساحل عمر فوراً اٹھا اور یہ سوچے بغیر کہ اس کے ساتھ جانا چاہیے یا نہیں' وہ کسی معمول کی
طرح اس کے پیچھے چل دیا۔ وہ دونوں آگے پیچھے چلتے رہے۔ وہ لمبے چہرے والا وقفے وقفے سے
ساحل عمر کو مڑ کر دیکھ لیتا تھا۔ اس کے دیکھنے کے عمل میں جانے کیا بات تھی کہ ساحل عمر کے جسم میں
سنسنی سی پھیل جاتی تھی۔ پھر وہ مزید تیز تیز اس کے پیچھے چلنے لگتا تھا۔
سورج چھپنے تک وہ میدانی علاقے سے جنگل میں داخل ہو گئے۔ جنگل میں گھستے ہی اندھیرا
گہرا ہو گیا۔ تب وہ شخص رکا۔ ساحل عمر دس پندرہ قدم پیچھے تھا۔ ساحل کو اب چلنے میں دشواری ہو رہی
تھی۔ تب وہ اس کے نزدیک پہنچا اور اس نے ساحل عمر کا ہاتھ پکڑ لیا۔ ساحل عمر نے محسوس کیا کہ اس کا
ہاتھ برف کی طرح ٹھنڈا ہے۔
اب گہرا اندھیرا پھیل چکا تھا۔ جنگل میں اتنی تاریکی تھی کہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دے رہا
تھا لیکن اس شخص کی آنکھیں پتہ نہیں بلی کی تھیں یا وہ الو کی نسل سے تھا کہ وہ بڑی تیزی سے آگے چلتا
جا رہا تھا۔ اور ساحل عمر اس کے ہاتھ کے سہارے کھنچا چلا جا رہا تھا۔
ساحل عمر اندازہ نہیں کر پایا کہ وہ اس طرح اندھیرے میں کتنی دیر چلے' لیکن یہ سفر اب اتنا
لمبا ہو گیا تھا کہ اس پر تھکن طاری ہو گئی تھی۔ وہ چاہ رہا تھا کہ کچھ دیر کہیں بیٹھ کر ستا لے لیکن وہ شخص

رکنے کا نام نہیں لے رہا تھا۔

اس سے پہلے کہ ساحل عمر چلنے سے انکار کر دیتا کہ اس شخص کی منزل آ گئی۔

مکمل تاریکی ہونے کی وجہ سے ساحل عمر اندازہ نہیں کر پایا کہ وہ کہاں پہنچا ہے۔ یہ کس قسم کی جگہ ہے۔ ابھی وہ یہ سوچ ہی رہا تھا کہ یہ شخص چراغ روشن کرے گا تو اسے اندازہ ہو گا کہ یہ کیسی جگہ ہے لیکن اس شخص نے چراغ روشن کرنے کے بجائے اپنے ٹھنڈے ہاتھوں سے ساحل عمر کا سر پکڑ کر زور سے دبایا۔ اس عمل کے کرتے ہی اس کا دماغ تاریکی میں ڈوبتا چلا گیا۔ اس کی آنکھیں پہلے ہی تاریکی میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ اسے کوئی ہوش نہ رہا۔

جب اسے ہوش آیا تو اچھا خاصا اجالا پھیل چکا تھا۔ وہ ایک بڑے سے پتھر پر لیٹا ہوا تھا۔ اس پتھر کے اطراف میں کٹے ہوئے درخت تھے۔ یہ درخت چھ فٹ اونچے تھے اور چار فٹ ان کا قطر ہوگا۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ ان درختوں کو ایک سائز میں کسی آرے سے کاٹا گیا ہو۔ کیونکہ یہ درخت محض تنے تھے اس لیے روشنی کے لیے رکاوٹ نہ تھے۔ باقی چاروں طرف جنگل تھا۔

ساحل عمر اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس کے سر میں شدید قسم کا درد ہو رہا تھا۔ وہ شخص جو اسے یہاں تک لایا تھا وہاں موجود نہ تھا۔ اس پتھر کے بائیں جانب ایک بانس گڑا ہوا تھا۔ اور اس بانس میں جو چیز لگائی گئی تھی وہ ایک ہوش مند کے ہوش اڑانے کے لیے کافی تھی۔

وہ چھ عدد کھوپڑیاں تھیں۔ جن کے سر میں سوراخ کر کے اس بانس میں پرو دیا گیا تھا۔ یہ ایک دوسرے پر اس طرح رکھی تھیں کہ مینار بن گیا تھا۔

ساحل عمر پتھر پر بیٹھا اطراف کا جائزہ لے ہی رہا تھا کہ وہ شخص اچانک سامنے سے آتا ہوا دکھائی دیا۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے وہ کسی کٹے ہوئے درخت کی اوٹ سے نکلا ہو۔

وہ ایک اونچے قد کا شخص تھا۔ اس وقت اس کی چادر کندھے پر پڑی تھی اور اس کی کھوپڑی روشنی میں چمک رہی تھی۔ اس شخص نے اپنے ہاتھوں میں ایک تھال اٹھایا ہوا تھا۔ وہ تھال اس نے پتھر پر ساحل عمر کے سامنے رکھ دیا۔ اس تھال میں چھوٹی چھوٹی کٹوریاں رکھی ہوئی تھیں۔ ان میں مختلف قسم کی چٹنیاں تھیں۔ ایک پلیٹ میں آلو کی بھجیا تھی اور گھی میں تربتر پوریاں تھیں۔

ساحل عمر کو سخت بھوک لگی تھی۔ اس نے یہ سوچنے میں اپنا وقت ضائع نہ کیا کہ اس جنگل میں یہ ناشتہ وہ کہاں سے لے آیا۔ وہ فوراً تھال پر ٹوٹ پڑا۔ جلد ہی اس نے تھال میں رکھا ناشتہ اپنے پیٹ میں اتار لیا۔ اسی تھال میں ایک مٹی کا برتن تھا جس میں پانی بھرا ہوا تھا' پانی ٹھنڈا اور میٹھا تھا۔ اس نے خوب سیر ہو کر پانی پیا۔ جب وہ ناشتے سے فارغ ہو چکا تو اس نے اس شخص کی طرف دیکھا جو ایک پتھر کے کونے پر بیٹھا اسے بڑی دلچسپی سے دیکھ رہا تھا۔

اس سے پہلے کہ ساحل عمر اس سے کوئی سوال کرتا' اس سے پوچھتا' آپ کون ہیں' اس نے خود ہی جواب دے دیا۔

وہ بولا: ''میں چتر دبھیل ہوں۔''

''چتر دبھیل۔'' ساحل عمر نے دہرایا۔ بڑا عجیب نام تھا۔ اس نام کو اس نے کہاں سنا تھا۔ پھر

ایک دم اسے یاد آیا کہ اس نے اس نام کو سنا نہیں بلکہ لکھا ہوا دیکھا تھا۔ اس قبر پر اس کے نام کا کتبہ نصب تھا۔

''ہاں چترو بھیل۔ میں تمہیں برکھا کے چنگل سے چھڑا کر لایا ہوں۔'' چترو بھیل نے بتایا۔

''میں برکھا کے قبضے میں تھا' لیکن مجھے تو یاد پڑتا ہے کہ میں قبر والے کمرے میں تھا اور وہاں برکھا نہ تھی۔''

''کیا اس استھان پر برکھا کے بندے نہ تھے؟'' چترو بھیل نے سوال کیا۔

''ہاں' وہ تو تھے۔'' ساحل عمر نے اقرار کیا۔ ''لیکن برکھا کہاں تھی؟''

''میں تمہیں سمجھاتا ہوں کہ برکھا نے تمہارے ساتھ کیا کھیل کھیلا ہے۔'' چترو بھیل نے کہا۔ ''اس نے جادو کے زور پر تمہیں اپنے بنگلے پر بلایا' پھر سرخ پانی کی بوندوں کے ذریعے تمہیں بیہوش کر کے میرے استھان پر پہنچایا۔ میں اپنے وقت کا بہت بڑا جادوگر ہوں۔ اس نے میرے سہارے تمہیں بلی کے لیے تیار کرنا تھا لیکن جب میری نظر تم پر پڑی تو میں نے اس سے تمہیں چھین لیا۔ میں نے تمہاری زندگی بچائی ہے۔ میں تمہیں یہاں ایک خاص مقصد کے لیے لایا ہوں۔ جب میرا کام ہو جائے گا تو میں تمہیں ہمیشہ کے لیے برکھا سے آزادی دلا دوں گا۔ وہ پھر تم پر کبھی قبضہ نہیں جما سکے گی۔''

''آپ مجھ سے کیا چاہتے ہیں' مجھے کیا کرنا ہوگا؟''

''تمہیں کچھ نہیں کرنا ہوگا۔ صرف ایک قتل کرنا ہوگا۔''

''ہیں' کیا کہا؟'' ساحل عمر سنبھل کر بیٹھ گیا۔ ''قتل کرنا ہوگا...... مجھے؟''

''ہاں تمہیں۔'' چترو بھیل نے انتہائی سنجیدگی سے کہا۔ ''تمہیں۔''

''گویا قتل کرنا آپ کے نزدیک کوئی مسئلہ ہی نہیں۔ آپ مجھے قتل کرنے کے لیے اس طرح کہہ رہے ہیں جیسے آئس کریم کھانے کے لیے کہہ رہے ہوں؟'' وہ خفگی سے بولا۔

''ہاں' تم نے ٹھیک سمجھا' قتل کرنا میرے لیے آئس کریم کھانے جیسا لذت آمیز عمل ہے۔ افسوس کہ اب میں اس لذت سے محظوظ نہیں ہو سکتا۔'' چترو بھیل کے لہجے میں بڑی افسردگی تھی۔ کچھ دیر خاموش رہ کر وہ پھر بولا:

''یہ جو تم بانس میں لگی ہوئی چھ کھوپڑیاں دیکھ رہے ہو' یہ سارے بندے میں نے قتل کیے ہیں۔ ان کو میں نے کیسے قتل کیا۔ کس طرح ڈھونڈ کر مارا' یہ ایک طویل داستان ہے۔ اس داستان میں میں تمہیں الجھانا نہیں چاہتا۔ بس اتنا سن لو کہ ان لوگوں نے میری بیوی اور بیٹیوں کو مارا تھا۔ مجھے اپنا انتقام لینے میں سات سال لگے۔ پھر مجھے ایک عورت ملی۔ اس عورت نے میرے دل پر قبضہ کر لیا۔ میں اسے پہچان نہ سکا۔ وہ ان چھ بھائیوں میں سے ایک کی بیوی تھی۔ اس نے اپنے شوہر کی موت پر قسم کھائی تھی کہ وہ مجھے ختم کر کے رہے گی۔ اور پھر اس نے ایسا کر دکھایا۔ میں اپنے علاقے کا بڑا جادوگر تھا۔ جادو کے نشے میں مست۔ اس نشے میں' میں کاویری کو پہچان نہ سکا۔ وہ ایک دن مجھے دریا کنارے بے ہوش ملی۔ بھیگی ہوئی۔ میں روز دریا کنارے پوجا پاٹھ کے لیے جاتا تھا۔ وہ اس بات کو جانتی تھی کہ میں ایک خاص وقت میں دریا کے کنارے آتا ہوں۔ تب اسی وقت اس نے ناٹک کھیلا اور میں اس کے

جال میں پھنس گیا۔ بھیگی ہوئی کاویری نے میرے ہوش اڑا دیئے۔ میں پوجا پاٹھ بھول کر اسے اپنے استھان پر اٹھا لایا۔ اور پھر وہ میرے من مندر کی داسی بن گئی۔ جب اس نے مجھ پر اچھی طرح قبضہ جمالیا۔ اور میرے بارے میں ہر وہ راز جان لیا جو جاننا چاہتی تھی تو ایک رات اس نے اپنا ہاتھ دکھا دیا۔ میرے پاس ایک نایاب سانپ کا زہر تھا جو ایک چھوٹی سی شیشی میں موجود تھا۔ یہ زہر میں نے ایک جوگی سے حاصل کیا تھا۔ یہ زہر مجھے ایک جادو کے عمل میں درکار تھا۔ یہ زہر اتنا تیز تھا کہ اس کا ایک قطرہ انسان کی ہلاکت کا باعث بن سکتا تھا۔ اس نے اس زہر کا ایک قطرہ دودھ میں ملا دیا۔ میں روز رات کو ایک گلاس دودھ پی کر سونے کا عادی تھا۔ کاویری نے اس رات میری طرف دودھ کا گلاس بڑھاتے ہوئے شرارت آمیز لہجے میں کہا:

''چترو! اس دودھ کو سنبھل کر پینا۔''

وہ اس طرح کی شوخیاں اکثر کیا کرتی تھی۔ اور ان شوخیوں کی وجہ سے وہ مجھے اچھی لگتی تھی۔ اس کی طنز آمیز گفتگو، دھمکی آمیز لہجہ، مجھے بہت پسند تھا۔ میں بھی اس کے ساتھ چھیڑ چھاڑ رکھتا تھا۔ میں جب بھی اسے تنگ کرتا، وہ لہجے میں مٹھاس بھر کر کہتی: ''دیکھ چترو، مان جا، ورنہ میرے ہاتھوں قتل ہو جائے گا۔''

اس رات جب اس نے مجھے دودھ کا گلاس پکڑایا تو میں نے گلاس پکڑتے ہوئے اس کا ہاتھ بھی تھام لیا اور ہنس کر بولا: ''کیا اس میں زہر ملا ہے۔''

''ہاں یہی سمجھ۔'' وہ ناک چڑھا کر بولی۔

''کاویری کیا تو مجھے زہر بھی دے سکتی ہے؟'' میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

''ہاں، کیوں نہیں دے سکتی۔ تو کیا سمجھتا ہے کہ میں تجھ سے بہت پیار کرتی ہوں۔'' وہ ہنس کر بولی۔

''ہاں، میں یہی سمجھتا ہوں کہ تو مجھ سے بہت پیار کرتی ہے اور جو پیار کرتا ہے، وہ کبھی اپنے پیار کو نقصان نہیں پہنچا سکتا۔''

پھر میں نے اس کا ہاتھ چھوڑ کر گلاس تھام لیا اور اس کی طرف دیکھتا ہوا بولا:

''کاویری تیرے ہاتھوں سے تو زہر پینا بھی منظور ہے۔'' یہ کہہ کر میں نے گلاس اپنے منہ سے لگا لیا اور چند لمحوں میں بغیر سانس لیے دودھ غٹا غٹ کر کے چڑھا گیا۔

دودھ حلق سے اترتے ہی، مجھے یوں لگا جیسے بھونچال آ گیا ہو۔ میری زندگی کا دروازہ دھڑ سے بند ہو گیا اور میں چل بسا۔

''چل بسا۔'' ساحل عمر نے حیرت سے دہرایا۔ ''تم اس وقت زندہ نہیں ہو۔''

''نہیں، میں زندہ نہیں ہوں، زندگی تو مجھ سے کاویری چھین کر لے گئی۔'' چترو بھیل کے لہجے میں تپش آ گئی۔

''میں مرنے کے بعد اپنی لاش کے نزدیک موجود تھا۔ یہ بات تو مجھے فوراً معلوم ہو گئی تھی کہ

کاویری نے مجھے زہر دے دیا ہے۔ میری زندگی بن کر میری زندگی مجھ سے چھین لی ہے لیکن میں یہ نہیں جان سکا تھا کہ اس نے ایسا کیوں کیا۔ یہ بات بھی مجھے فوراً ہی معلوم ہوگئی۔ اس نے میری لاش کو حقارت سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''چترو! تو نے میرے شوہر اور اس کے بھائیوں کو مارا...... میں نے تجھے مار دیا۔ تو نے میرے شوہر اور اس کے بھائیوں کو گھات لگا کر بے خبری میں مارا' لیکن میں نے تجھے جتا کر مارا۔ میں عورت ہو کر تجھ سے بہادر نکلی۔ لعنت ہے تجھ پر۔''

یہ کہہ کر اس نے میری لاش کو ٹھوکر لگائی' میرے منہ پر تھوکا اور میرے استھان سے نکل گئی۔

''اوہ' وہ عورت تو بڑی چالباز نکلی۔'' ساحل عمر نے بڑی سادگی سے کہا۔

''ہاں ایسی ویسی۔ اس کی اس حرکت نے میری روح تک میں شعلے بھڑکا دیئے۔ اس آگ میں جلتے ہوئے مجھے پانچ سال ہو گئے۔ ان پانچ سالوں میں تم پہلے آدمی تھے جسے میرے حوالے کیا گیا۔ اگرچہ برکھا کا مقصد کچھ اور تھا' لیکن میں نے تمہیں اپنے کام کے لیے چن لیا۔ اب تم نے میری مدد کرنی ہے۔ میری روح کو سکون پہنچانا ہے اور یہ سکون اسی طرح پہنچ سکتا ہے کہ تم کاویری کو قتل کردو۔ میں جانتا ہوں کہ وہ اس وقت کہاں ہے۔ وہ روز دریا پر کپڑے دھونے آتی ہے۔ تم بھی اسی کی طرح دریا کے کنارے بے ہوش ملو گے۔ تمہاری خوبصورتی اس کے دل کی دنیا تہس نہس کردے گی۔ وہ تمہیں اپنے گھر لے جائے گی۔ ہوش میں آنے پر تم اسے خودکشی کی فرضی داستان سناؤ گے' جیسے اس نے مجھے سنائی تھی۔ چند دن تم اس کے ساتھ رہو گے۔ تم اس کے ساتھ محبت کا ناٹک کھیلو گے۔ وہ تمہارے فریب میں آجائے گی۔ پھر میں تمہیں زہر فراہم کروں گا۔ تم اسے دودھ میں ملا کر دو گے اور وہی مکالمے بولو گے جو اس نے بولے تھے۔ وہ تمہارے ہاتھوں انجانے میں زہر پینے پر راضی ہو جائے گی۔ جیسے میں ہو گیا تھا۔ اس کے زہر پینے کے بعد میں تمہیں وہاں پہنچا دوں گا جہاں تمہاری رہائش ہے۔ میں اس بات کی گارنٹی دیتا ہوں کہ برکھا سے تمہیں نجات مل جائے گی۔ تم نہیں جانتے کہ وہ تمہیں قتل کر کے کالی دنیا کی ایک زبردست طاقت ''مانا'' کو حاصل کرنا چاہتی ہے۔

بولو اب تم کیا کہتے ہو۔ میری مدد کر کے زندگی چاہتے ہو یا انکار کر کے برکھا کے ہاتھوں قتل ہونا چاہتے ہو۔ اگر تم نے کاویری کو قتل نہ کیا تو میں پھر تمہیں برکھا کے حوالے کردوں گا۔ اب تم اچھی طرح سوچ لو کہ تم کیا چاہتے ہو۔ قتل کے بدلے زندگی چاہتے ہو یا انکار کے بدلے خود اپنا قتل۔'' یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گیا۔

ساحل عمر کو چترو بھیل نے عجیب مخمصے میں ڈال دیا تھا۔ یہ انکشاف بھی اس کے لیے ہولناک تھا کہ برکھا اپنی ساحرانہ قوتوں میں اضافے کے لیے اسے بھینٹ چڑھانا چاہتی ہے۔ اس کی بلی دینا چاہتی ہے۔ اسے قربانی کا بکرا بنانا چاہتی ہے۔ اب اس کی سمجھ میں آیا کہ وہ یوں آدھی رات کو اس کی ٹیلی فون کال پر کس طرح سب کچھ چھوڑ چھاڑ دیوانوں کی طرح اس کے بنگلے پر پہنچ گیا تھا۔ وہ اس کی ساحرانہ قوتوں کے زیر اثر آ گیا تھا۔ اس کے اثر سے نکلنے کے لیے چترو بھیل اس کی مدد کرنے کو تیار تھا' لیکن اس آزادی کے عوض وہ اسے قاتل بنا دینا چاہتا تھا۔ اب وہ انکار کر سکتا تھا' نہ

اقرار......

''نوجوان تو کب تک سوچے گا۔ جلدی فیصلہ کر' میرے پاس وقت کم ہے۔ میں دھول اڑتی ہوئی دیکھ رہا ہوں۔ برکھا نے میرے استھان پر میری واپسی کا عمل شروع کردیا ہے۔ تو اپنا فیصلہ جلدی سنا۔ میں دس تک گنتی گنتا ہوں۔ ایک......دو......تین۔'' اور اس سے پہلے کہ وہ دس تک پہنچتا۔

ایک آواز گونجی۔ ''میں کاویری کو قتل کروں گا۔''

یہ آواز ساحل عمر کی نہ تھی۔

☆......☆......☆

اسے اپنی آواز بڑی اجنبی لگی۔ اسے اپنی آواز پر یقین نہ آیا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ کسی کے قتل پر راضی ہو جائے گا۔ یہ فیصلہ اس نے دل سے نہیں کیا تھا۔ یہ اس کے دل کی آواز نہیں تھی۔ بس لاشعوری طور پر اس کے منہ سے نکل گیا تھا کہ وہ کاویری کو قتل کرنے پر راضی ہے۔

ساحل عمر کا فیصلہ سن کر چترو بھیل کی باچھیں کھل گئیں۔

"شاباش نوجوان تم نے دل خوش کر دیا۔ اب میں برکھا کو دیکھ لوں گا۔ اسے میری فکر نہیں ہے۔ اسے تمہاری فکر ہے۔ میں اپنے استھان پر جاؤں نہ جاؤں۔ اسے میری واپسی سے کچھ فرق نہیں پڑے گا لیکن اگر تم اسے واپس نہ ملے تو اس کی زندگی بھر کی کمائی منٹوں میں لٹ جائے گی اور ایسا وہ کبھی نہیں ہونے دے گی۔"

"وہ کیا کرے گی؟" ساحل عمر نے فکرمند لہجے میں پوچھا۔

"وہ ہوا کا جال بھیجے گی، تمہاری گرفتاری کے لیے۔" چترو بھیل نے کہا۔

"ہوا کا جال...... میں سمجھا نہیں۔" ساحل عمر حیران ہوا۔

"تم سمجھو گے بھی نہیں...... جب تک تم دیکھ نہیں لو گے سمجھو گے نہیں۔ ویسے وہ دکھائی دینے والی چیز بھی نہیں۔ تم صرف محسوس کر سکو گے۔ تمہیں یوں محسوس ہو گا کہ اچانک ہی کوئی ان دیکھا جال تم پر آ گرا ہے اور اس جال میں تم جکڑتے جا رہے ہو۔ پھر اس جال کی گرفت سخت سے سخت ہوتی جائے گی اور تمہارے پاؤں زمین سے اکھڑ جائیں گے۔ پھر یہ ہوا کا جال تمہیں اڑا لے جائے گا اور تمہیں برکھا کے سامنے جا کر ڈال دے گا۔"

"اوہ، پھر کیا ہوگا......؟ مجھے کون بچائے گا۔"

"میں بچاؤں گا...... میرے سامنے ابھی وہ بچی ہے۔ وہ اگر ہوا کا جال بھیج سکتی ہے تو میں اس ہوا کے جال کی کاٹ تمہیں بتا سکتا ہوں۔ تم پریشان نہ ہو۔"

"تم کہہ رہے ہو کہ وہ جال اچانک ہی مجھ پر گرے گا اور دکھائی بھی نہ دے گا تو ایسی صورت میں میرے پاس بچاؤ کا راستہ موجود ہونا چاہیے۔ پتہ نہیں وہ جال کب مجھ پر آ گرے۔"

"ابھی اس کا عمل ختم ہونے میں کچھ وقت ہے۔ چلو تمہاری تسلی کے لیے تمہیں اس کی کاٹ بتائے دیتا ہوں بلکہ تمہارے حوالے کیے دیتا ہوں، چند لمحے انتظار کرو۔" یہ کہہ کر وہ کٹے ہوئے درخت کے پیچھے چلا گیا۔

چند لمحوں بعد وہ اس کی اوٹ سے مسکراتا ہوا نکلا۔ اس کے ہاتھوں میں ایک چمکتا ہوا استرا تھا۔ وہ اس کے نزدیک آ کر استرا اس کے حوالے کرتا ہوا بولا: "یہ لو۔"

"استرا......!" ساحل عمر نے چمکتے استرے کو ہاتھ میں لیتے ہوئے حیرت سے کہا۔ "اس سے کس طرح کاٹ ہوگی۔"

"میں تمہیں بتاتا ہوں کہ کیا کرنا ہے۔ میری بات پوری توجہ سے سنو۔" یہ کہہ کر چتر وبھیل نے اسے ساری بات تفصیل سے سمجھا دی۔ وہ ساری بات اچھی طرح سمجھ گیا۔ اس نے استرے کو بند کر کے اپنی جیب میں رکھ لیا۔

"اب میرے ساتھ آؤ!" چتر وبھیل نے پتھر سے اٹھتے ہوئے کہا۔

"کہاں؟" وہ بولا۔

"تمہیں دریا کی سیر کروا دوں۔ نزدیک ہی وہ دریا ہے جہاں تم کاویری کو بے ہوش ملو گے۔ تمہیں وہ جگہ دکھا دوں۔" چتر وبھیل اٹھتے ہوئے بولا۔

"چلو......!" ساحل عمر اس کے ساتھ ہولیا۔

"کاویری کہاں رہتی ہے؟"

"وہ دریا کے اس پار رہتی ہے۔" چتر وبھیل نے بتایا اور پھر تیز تیز چلنے لگا۔

اب وہ دونوں آگے پیچھے چل رہے تھے۔ چتر وبھیل اسے مڑ کر دیکھ لیتا تھا۔ جب ان دونوں کے درمیان فاصلہ زیادہ بڑھ جاتا تو وہ ٹھہر جاتا اور جب ساحل قریب آنے لگتا تو چتر وبھیل پھر قدم بڑھانے لگتا۔

اس وقت وہ گھنے جنگل سے گزر رہے تھے۔ اگرچہ آفتاب پوری آب و تاب کے ساتھ چمک رہا تھا' لیکن اس جنگل میں اس کی روشنی کا زیادہ گزر نہ تھا۔ درخت آپس میں اس طرح لے ہوئے تھے کہ روشنی کی کرنیں کہیں کہیں سے چھن کر زمین پر پڑ رہی تھیں۔ یہی حال کچھ ہوا کا بھی تھا۔ اس جنگل میں ہوا کا بھی گزر نہ تھا۔ گرمی نہ تھی بلکہ دھوپ نہ ہونے کی وجہ سے ٹھنڈک کا احساس تھا۔

ابھی وہ زیادہ دور نہ گئے ہوں گے کہ ساحل عمر کو اچانک اپنے گرد تیز ہوا محسوس ہوئی۔ ساحل عمر چلتے چلتے فوراً کھڑا ہو گیا۔ اسے ایک دم خطرے کا احساس ہوا۔ اس نے جیب سے فوراً استرا نکال کر کھول لیا۔ ہوا مزید تیز ہوتی جا رہی تھی اور اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے ہوا اسے اپنی گرفت میں لیتی جا رہی ہے۔

یہی عمل کا وقت تھا۔ اس میں ذرا سی بھی غفلت' ذرا بھی دیر ساحل عمر کو کہاں سے کہاں پہنچا سکتی تھی۔ ساحل عمر فوراً ایکشن میں آ گیا۔ اس نے اپنا بایاں بازو کھول کر جلدی جلدی استرا چلایا جیسے اپنے اوپر پڑے جال کو کاٹ رہا ہو۔ پھر یہی عمل اس نے دائیں بازو کے نیچے بغل کے نزدیک کیا۔ پھر وہ فوراً ہی جھک گیا اور اس نے ٹانگوں کے درمیان بہت تیزی سے استرا چلانا شروع کر دیا۔

چتر وبھیل چلتے چلتے رک گیا تھا۔ اب وہ بڑی دلچسپی سے ساحل عمر کو دیکھ رہا تھا۔ وہ خوش تھا

کر اس نے جس طرح اسے بتایا تھا' وہ بالکل ویسے ہی عمل میں معروف تھا۔
ساحل عمر کو یکایک محسوس ہوا کہ ہوا کی گرفت ڈھیلی پڑتی جا رہی ہے۔ جو بات اس نے ابتداء میں محسوس کی تھی وہ بات اب نہیں رہی تھی۔ وہ ہوا کی رگوں کو کاٹنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ وہ احتیاطاً استرا چلانے کے عمل کو اب بھی جاری رکھے ہوئے تھا۔
تب چتر و بھیل جلدی سے اس کے نزدیک آیا اور زور سے بولا:
"بس...... بس...... کام ہو گیا۔"
چتر و بھیل کی آواز سن کر اس نے فوراً اپنا ہاتھ روک لیا۔ اس نے دیکھا کہ ہوا کا یہ تیز جھونکا اس سے الگ ہو کر سامنے کی طرف بڑھ رہا ہے۔ مٹی کے ذرے اور سوکھے پتے اس کے ساتھ چل رہے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے ہوا کے اس مرغولے میں کوئی چیز ظاہر ہوئی۔ وہ سرخ رنگ کی کوئی چیز تھی جو تیزی سے چھوٹی ہوتی جا رہی تھی۔ پھر وہ زمین پر گری اور ہوا ایک دم ساکت ہو گئی۔ یہ سرخ رنگ کا ریشمیں دھاگوں کا کوئی جال سا تھا جو سمٹتا سکڑتا جا رہا تھا۔ پھر اس کا ایک گولا سا بن گیا اور اس میں اچانک آگ بھڑک اٹھی۔ یہ بہت تیز آگ تھی۔ چند سیکنڈ میں گولا جل کر کوئلہ ہو گیا۔
"دیکھ لیا تم نے۔" چتر و بھیل اس کے قریب آ کر بولا۔
"میں نے جیسا کہا تھا' ویسا ہی ہوا نا۔ اب تمہیں اچھی طرح اندازہ ہو گیا ہو گا کہ برکھا کس طرح تمہارے پیچھے لگی ہوئی ہے۔"
"ہاں واقعی۔"
ساحل عمر اس جلے ہوئے گولے پر نظریں جمائے ہوئے بولا۔ "شروع میں تو یہ سمجھا تھا کہ تم محض ڈرا کر مجھ سے اپنا کام کروانا چاہتے ہو لیکن اب مجھے یقین ہو گیا ہے کہ برکھا واقعی میری جان کی لاگو ہو گئی ہے۔"
"تم فکر مت کرو...... پریشان ہونے کی بالکل ضرورت نہیں ہے' میں تمہیں اس کے چنگل سے نکال دوں گا۔ بس تم میرا یہ کام کر دو۔"
"ٹھیک ہے۔ آؤ دریا کی طرف چلیں۔" ساحل عمر نے کہا اور پھر وہ دونوں ساتھ ساتھ چلنے لگے۔

چتر و بھیل کسی سانپ کی طرح "موذی" تھا۔ انتہائی خبیث' شاطر اور بے وفا شخص۔ وہ اپنے وقت کا ایک بڑا ساحر تھا۔ اس نے چھ قتل کیے تھے۔ خباثت اس میں کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ جس طرح سانپ اپنے دودھ پلانے والے کو بھی نہیں بخشتا' ویسے ہی اس نے ساحل عمر کے بارے میں فیصلہ کر لیا تھا۔

فی الحال تو اس نے اسے کاویری کے پیچھے لگانے کا ارادہ کر لیا تھا۔ کاویری کے قتل کے بعد اس نے آئندہ کا لائحہ عمل سوچ لیا تھا۔ اس نے طے کر لیا تھا کہ وہ ساحل عمر کو کسی قیمت پر آزاد نہیں کرے گا۔

چتر وبھیل اپنے جسم سے محروم ہو گیا تھا۔ اب اسے ایک جسم کی تلاش تھی۔ ساحل عمر سے اچھا جسم اسے بھلا کہاں مل سکتا تھا۔ وہ ایک تیر سے دو شکار کر رہا تھا۔ ساحل عمر سے کاویری کا قتل کروا کر ایک طرف تو وہ اپنی انتقام کی آگ بجھا رہا تھا دوسری طرف وہ اسے قاتل بنا کر گندا کرنا چاہتا تھا۔ وہ اس کے جسم پر اسی صورت میں قبضہ جما سکتا تھا کہ وہ مجرم ہو جائے۔ مجرموں پر ہی اصل میں گرفت کی جاتی ہے۔ کسی بے گناہ اور معصوم شخص کو نہیں پکڑا جاتا۔

ساحل عمر کو کچھ معلوم نہیں تھا کہ آئندہ چند روز میں اس کے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔ کاویری کے قتل پر اگرچہ وہ اوپری دل سے راضی تو ہو گیا تھا لیکن کاویری کے قتل کا تصور کر کے وہ کانپ جاتا تھا۔ اس وقت وہ چتر وبھیل کے رحم و کرم پر تھا۔ وہ اس سے جان چھڑا کر یہاں سے نکل جانا چاہتا تھا۔

فی الحال اس نے یہ طے کیا تھا کہ پہلے کاویری تک پہنچا جائے۔ اگر ممکن ہو سکا تو اسے اعتماد میں لے کر راہ فرار اختیار کی جائے گی۔ وہ اسے اصل حقائق سے آشنا کر دے گا۔ اس انکشاف کے بدلے میں کاویری ضرور اس کی مدد کرے گی۔ وہ اس علاقے سے نکلنے کا ضرور کوئی نہ کوئی بندوبست کر دے گی۔

دونوں اپنے اپنے طور پر منصوبہ بندی میں لگے ہوئے تھے اور قسمت دور کھڑی ان دونوں پر ہنس رہی تھی۔

☆......☆......☆

صبح تڑکے کا وقت تھا۔ سورج ابھی نہیں نکلا تھا لیکن ہلکا ہلکا اجالا پھیل گیا تھا۔ ساحل عمر کٹے ہوئے درختوں کے درمیان اسی بڑے سے پتھر پر لیٹا تھا جہاں کل اس کی آنکھ کھلی تھی۔ چتر وبھیل اسے کھلا پلا کر رات اس پتھر پر گزارنے کا کہہ کر چلا گیا تھا۔ وہ صبح ہی صبح آنے والا تھا تا کہ ساحل عمر کو دریا کے کنارے بے ہوشی کے عالم میں لٹائے اور پھر کسی درخت کے پیچھے چھپ کر کاویری کی آمد اور ساحل عمر کو وہاں سے اٹھا لے جانے کا منظر اپنی آنکھوں سے دیکھ سکے۔ اسے یقین ہو جائے کہ مچھلی نے کانٹا نگل لیا ہے...... اس کے بعد تو اسے محض ڈور کھینچے جانے کا انتظار کرنا تھا۔

رات کو ساحل عمر بہت دیر میں سویا تھا۔ وہ دنیا جہاں کی باتیں سوچتا رہا تھا۔ پھر نرم گداز بستر پر سونے والے شخص کو بستر کی جگہ پتھر فراہم کیا گیا تھا وہ کیسے سوتا۔ کہتے ہیں، نیند تو سولی پر بھی آ جاتی ہے، وہ تو ایک بینچ نما پتھر تھا، وہ اپنے بازو پر سر رکھ کر سوچتے سوچتے جانے کب سو گیا۔

اس وقت بھی وہ سو رہا تھا۔ صبح قریب تھی۔ اندھیرا ملگجے اجالے میں تبدیل ہو رہا تھا۔

چتر وبھیل ابھی تک نہیں پہنچا تھا۔

لیکن وہ چھلانگیں مارتا ہوا کسی راکٹ کی رفتار سے چلا آ رہا تھا۔ پھر وہ بینچ نما پتھر کے قریب آ کر رک گیا۔ اس نے بڑی تیزی سے چاروں طرف گردن گھما کر دیکھا۔ ہر طرف سکون پھیلا ہوا تھا۔

اس نے دو قدم آگے بڑھ کر چہرہ ساحل عمر کے چہرے کے قریب کر دیا۔ جلد ہی ساحل عمر نے اپنے چہرے پر غیر انسانی سانسوں کو محسوس کر لیا۔

فوراً اس کی آنکھ کھل گئی۔ اسے نزدیک پا کر وہ فوراً اٹھ بیٹھا۔ اس کے سامنے ایک چیتا موجود تھا۔ روشنی زیادہ نہ ہونے کے باوجود اس نے پہچان لیا کہ وہ جھکال ہے۔ وہ اسے کیسے نہ پہچانتا' اس نے اس کے جسم کے ہر حصے پر برش چلایا تھا۔ اس نے اسے پینٹ کیا تھا۔

جھکال نے کسی پالتو بلی کی طرح اپنا جسم اس کی ٹانگوں سے رگڑا۔ اسے نزدیک پا کر ساحل عمر نے ذرہ بھر بھی خوف محسوس نہیں کیا بلکہ اسے دیکھ کر اس کے دل میں محبت کے جذبات ابھرے۔ اس نے اس کی گردن میں بانہیں ڈال دیں۔ جھکال تھوڑا سا پیچھے ہوا تو وہ مزید اس پر جھک گیا۔ جھکال مزید پیچھے ہو کر ایک دم اس کے نزدیک آیا۔ اس آگے پیچھے ہونے میں یہ ہوا کہ وہ جھکال کے اوپر سوار ہو گیا۔

جھکال کے لیے اتنا ہی موقع کافی تھا۔ اس نے اپنی کمر ہلا کر ساحل عمر کو اپنی پیٹھ پر سوار کیا اور تیزی سے دوڑ لگائی۔

ساحل عمر نے خود کو گرنے سے بچانے کے لیے اس کی گردن کو مضبوطی سے اپنے ہاتھوں میں لے لیا اور اس کی کمر پر اچھی طرح جم گیا۔

جھکال نے جب دیکھا کہ سوار نے اپنی نشست اچھی طرح سنبھال لی ہے تو پھر اس نے ایک لمبی زقند بھری اور چند لمحوں میں وہ ہوا سے باتیں کرنے لگا۔ ساحل عمر بہت مضبوطی سے اس کی گردن سے چمٹا ہوا تھا۔

چتر و بھیل جھومتا جھامتا بڑی تیزی سے چلا آ رہا تھا۔ وہ بہت خوش تھا۔ وہ آگ جو اس کی روح میں لگی ہوئی تھی' اس آگ کے ٹھنڈی ہونے کے آثار پیدا ہو چلے تھے۔ منزل بہت قریب تھی۔ وہ ساحل عمر کو دریا میں ایک غوطہ لگا کر کنارے پر لٹا دے گا۔ ایک ٹانگ اس کی دریا میں ہو گی باقی جسم خشکی پر ہو گا اور وہ بے سدھ لیٹا ہو گا۔ کاویری جب اسے دیکھے گی تو اس کے چلتے قدم رک جائیں گے۔

ارے...... ! کاویری کے چلتے قدم اسے دیکھ کر پتہ نہیں رکتے کہ نہیں لیکن سامنے کا منظر دیکھ کر چتر و بھیل کے چلتے قدم ضرور رک گئے اور منہ سے بے اختیار حیرت کا کلمہ نکل گیا۔ درختوں کے درمیان اسے وہ بینچ نما پتھر صاف نظر آیا جو خالی تھا۔ اس نے جلدی جلدی چاروں طرف نظریں دوڑائیں۔ اس نے سوچا شاید ساحل عمر ضرورتاً اٹھا ہو لیکن وہ آس پاس کہیں نظر نہیں آیا۔

یہ بات اس کے لیے سوہان رُوح ہو گئی۔ وہ خود روح تھا۔ وقت اور جگہ کی قید سے آزاد...... اس نے جلدی جلدی آس پاس کا علاقہ چھان مارا۔ دریا کے دونوں کنارے خالی پڑے تھے۔ حتیٰ کہ کاویری بھی اپنے گھر میں موجود تھی۔

چتر و بھیل ایک موہوم سی امید پر اسے جگہ جگہ تلاش کرتا رہا۔ اب تو سورج بھی نکل آیا تھا۔ ہر سو سورج کی کرنیں بکھر چکی تھیں لیکن ساحل عمر کا دور دور تک پتہ نہیں تھا۔

کہاں گیا وہ؟ اسے زمین کھا گئی یا آسمان نگل گیا۔ چتر و بھیل سوچ سوچ کر پریشان ہونے لگا۔ اس کی خوشی لمحوں میں غائب ہو گئی۔ ساری منصوبہ بندی دھری کی دھری رہ گئی۔ بنا بنایا کھیل بگڑ گیا۔

تب اسے برکھا کا خیال آیا۔ کہیں یہ کام اس عیار لومڑی نے تو نہیں کر دکھایا۔ اس سے غلطی ہوگئی کہ وہ برکھا کی طرف سے غافل ہوگیا۔ اس نے سمجھ لیا کہ ہوا کے جال کے کٹ جانے کے بعد اب ادھر سے کوئی خطرہ نہیں' اسے جاتے ہوئے کوئی ''نشانی'' لگا کر جانا چاہیے تھا۔ اگر اس کے پاس ''نشانی'' لگی ہوتی تو اس کے بارے میں فوراً نشاندہی ہو جاتی۔ لگتا ہے برکھا ہاتھ دکھا گئی۔ اگر واقعی ایسا ہے تو وہ اسے بخشے گا نہیں۔ وہ غصے سے کھول اٹھا۔

☆............☆............☆

برکھا کے ہوش اڑے ہوئے تھے۔ اس پر پاگل پن کا دورہ پڑنے والا تھا۔ ایک جنون کی سی کیفیت طاری ہو رہی تھی۔ وہ غصے میں چتروبھیل کے ''استھان'' کے چاروں طرف چکر کاٹ رہی تھی۔ سوناں اور واسم دیوار سے لگے بیٹھے تھے۔ وہ پریشان نظروں سے برکھا کو چکر کاٹتا دیکھ رہے تھے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ ایسا کیوں کر رہی ہے۔

''برکھا جی...... کچھ بتائیں تو آخر ہوا کیا؟'' واسم نے ہمت کر کے پوچھا۔

''وہ ہوگیا جو آج تک نہیں ہوا!'' برکھا نے افسردگی سے کہا۔

''میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ اس طرح مجھے ناکامی کا منہ دیکھنا پڑے گا۔ میری کئی راتوں کی محنت یوں اکارت چلی جائے گی۔''

''کچھ بتائیں تو۔'' سوناں نے اس مرتبہ لب کھولے۔

واسم کے بولنے سے اس میں ہمت آ گئی تھی۔

''ہوا کا جو جال میں نے ساحل عمر کی گرفتاری کے لیے بھیجا تھا' وہ جال ساحل عمر نے کاٹ دیا۔''

''کیسے پتہ چلا۔'' سوال ہوا۔

''یہ تم اندھوں کو جلا ہوا گولا نظر نہیں آ رہا' یہ کیا ہے؟ یہ وہی کٹا ہوا جال ہے۔'' برکھا نے اس جلے ہوئے گولے کی طرف اشارہ کیا۔ جو اچانک ہی کہیں سے قالین پر نمودار ہوگیا تھا۔

اس گولے کو ان دونوں نے بھی دیکھا تھا لیکن وہ اس بات کو سمجھ نہ پائے تھے اور برکھا سے پوچھنے کی ان میں ہمت نہ تھی کہ یہ کیا ہے؟ صورت حال سے آگاہی پر دونوں کو افسوس ہوا' سوناں بولی:

''یہ تو بہت برا ہوا؟''

ابھی برکھا جواب دینے کے لیے منہ کھول ہی رہی تھی کہ وہ چکر کاٹتے کاٹتے ایک دم ٹھٹک گئی۔

سوناں اور واسم نے برکھا کو اس طرح رکتے دیکھا تو وہ دونوں فوراً چوکنا ہو کر اس کی طرف دیکھنے لگے۔ سوناں نے گھبرا کر پوچھا۔ ''کیا ہوا؟ برکھا جی!''

''وہ آ رہا ہے؟''

یہ کہہ کر برکھا جہاں کھڑی تھی وہیں آسن جما کر بیٹھ گئی اور تیزی سے منہ ہی منہ میں کچھ منتر پڑھنے لگی۔ منتر پڑھتے پڑھتے اس نے ہاتھ سے دروازے کی طرف اشارہ کیا۔

سوناں اس کا اشارہ سمجھتے ہوئے فوراً اٹھی اور تیزی سے آگے بڑھ کر استھان کا دروازہ کھول دیا۔ دروازہ کھلتے ہی چتر دبھیل کسی آندھی کی طرح اندر داخل ہوا اور اپنے استھان کے نزدیک پہنچ کر برکھا کو قہر آلود نگاہوں سے دیکھنے لگا۔

''کیا دیکھتے ہو مجھے۔'' برکھا ایک دم کھڑی ہوگئی اور غصے سے بولی۔ ''اب یہاں کیا لینے آئے ہو؟''

''بتا کہاں چھپایا ہے تو نے اسے...... اگر تو نے اسے میرے حوالے نہ کیا تو یاد رکھ تیرا استھان بھی یہیں بنے گا۔'' چتر دبھیل کے لہجے میں آگ بھری تھی۔

''ارے الٹی مجھے دھمکی دے رہے ہو...... میں نے اپنا بڑا سمجھ کر اپنی تپسیا کو تمہارے استھان ربھیجا تھا کہ تمہارے ذریعے میری کچھ راہیں آسان ہو جائیں گی۔ مجھے آسانی مہیا کرنا تو درکنا تم میری بلی کو ہی لے اڑے۔ تم جانتے نہیں کہ میں اس پر کب سے محنت کر رہی ہوں، تم نے ایسا کیوں کیا؟ کیوں لے گئے اسے مجھ سے چھین کر۔ بولو، جواب دو۔''

''یہ ٹھیک ہے کہ میں اسے تجھ سے چھین کر لے گیا لیکن تو نے اسے میرے پاس رہنے کب دیا۔ میری غفلت سے فائدہ اٹھا کر اسے اپنے پاس بلا بھیجا۔ مجھے نہیں پتا تھا کہ ہوا کا جال کاٹنے کے باوجود تو اسے اپنے پاس پکڑ بلائے گی۔ تو اتنی طاقتور ہوگئی ہے؟'' اس کے لہجے میں حیرت تھی۔

''چتر دبھیل تم یہ کیا کہہ رہے ہو؟'' برکھا اس سے زیادہ حیران ہوئی۔

''دیکھ برکھا...... میرے پاس وقت نہیں ہے۔ تو بس چند روز کے لیے اسے میرے حوالے کردے۔ میں تجھ سے وعدہ کرتا ہوں کہ میں خود اسے تیرے پاس چھوڑ جاؤں گا اور تیری راہیں بھی آسان کر دوں گا۔'' اس نے چال چلی۔

''ارے چتر دبھیل کیا ساحل تمہارے پاس نہیں...... کیا تم اسے یہاں سے نہیں لے گئے......''

''اسے میں لے گیا تھا، میں اس بات سے کب انکاری ہوں...... لیکن اب وہ میرے پاس نہیں ہے۔''

''یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟'' برکھا کی آنکھیں حیرت سے پھٹ گئیں۔ ''جو کچھ کہہ رہے ہو، سچ کہہ رہے ہو؟''

''ہاں...... کالی دیواہ کی قسم سچ کہہ رہا ہوں۔''

وہ بڑی سنجیدگی سے بولا۔

''لیکن چتر د پھر وہ کہاں گیا...... وہ میرے پاس تو نہیں۔ کالی دیواہ کی قسم وہ میرے پاس نہیں ہے۔''

''نہیں۔''

یہ سن کر چتر وبھیل پر اس قدر صدمہ طاری ہوا کہ وہ اپنے قدموں پر کھڑا نہ رہ سکا۔ اس کی آنکھیں کانپنے لگیں۔ وہ فوراً قالین پر بیٹھ گیا اور بے حد اداس لہجے میں بولا۔ ''پھر اسے کون لے اڑا......''

''اوہ......'' برکھا نے ایک ٹھنڈا سانس بھرا۔ ''چتر! یہ کیا کیا تم نے؟ اسے نہ میرا رہنے دیا نہ اپنا۔''

''وہ کہاں جا سکتا ہے؟'' چتر وبھیل نے سوال کیا۔

''اسے ڈھونڈنا ہوگا۔'' برکھا بولی۔

''ڈھونڈیں گے...... ہم دونوں مل کر اسے تلاش کریں گے۔''

''ہم دونوں مل کر نہیں۔'' برکھا نے فوراً تردید کی۔

''میں اسے تنہا ڈھونڈوں گی۔ اب تم اسے بھول جاؤ۔ تمہارا اس پر کوئی حق نہیں' سمجھے۔ میں یہاں سے جاؤں گی تو تمہیں استھان پر باندھ کر جاؤں گی۔ پھر تم یہاں سے ہل بھی نہ سکو گے۔ تمہاری اس حماقت نے ناقابل تلافی نقصان پہنچایا ہے۔ میں تمہیں بخشوں گی نہیں۔''

''تم ایسا نہیں کرو گی برکھا...... ورنہ مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا۔''

''یہ بات تو نے ٹھیک کہی' تجھ سے برا واقعی یہاں کوئی اور نہیں...... لے دیکھ' میں نے باندھ دیا۔ اب تو اس کمرے کی دیواروں سے باہر نہیں نکل سکتا۔ اگر تو نے یہاں سے نکلنے کی کوشش کی تو تیری روح میں شعلے بھڑک اٹھیں گے۔ اتنی بات تو تو خود بھی سمجھتا ہوگا۔ تو نے کالی دنیا کا اصول توڑا ہے تو نے جادوگر ہو کر ایک دوسری جادوگر کو دھوکا دیا ہے۔ میں تیری شکایت کالی دیواہ سے کروں گی۔ تجھے دوسرے جنم میں ضرور کتا بنایا جائے گا۔'' یہ کہہ کر برکھا اٹھ کر کھڑی ہوگئی۔

چتر وبھیل نے جب چاروں طرف نظریں گھمائیں تو اسے ہر طرف آگ بھڑکتی ہوئی دکھائی دی۔ یہ ایسی آگ تھی جو صرف اسے ہی دکھائی دے رہی تھی اور صرف اسی کے لیے تھی۔

''واسم ......سوناں......'' برکھا غصے سے چیخی۔

''جی' برکھا جی۔'' وہ دونوں بھاگ کے اس کے قدموں میں آگرے۔

''آؤ' چلو...... نکلو یہاں سے...... دروازے کو تالا لگاؤ اور چابی مجھے دو۔'' یہ کہہ کر وہ دروازے سے باہر آگئی۔ اس نے پلٹ کر بھی نہ دیکھا کہ چتر وبھیل پر اس عمل کا کیا ردعمل ہوا۔ باہر نکل کر سوناں نے دروازے کو لاک کیا اور چابی برکھا کی طرف بڑھا دی۔ برکھا نے چابی کو ہاتھ میں لے کر کوئی منتر پڑھا اور پھر اسے اپنی ساڑھی کے پلو میں باندھ لیا۔

اور کاٹیج سے باہر نکل آئی۔

☆............☆............☆

اماں' ناصر مرزا کے سامنے بیٹھی ہچکیوں سے رو رہی تھیں۔ ناصر مرزا کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ انہیں کیسے چپ کروائے۔ انہیں کیا کہہ کر تسلی دے۔

وہ آج حافظ موسیٰ سے ملاقات کے لیے نکلا تھا۔ اس نے سوچا کہ اماں کو بھی دیکھتا چلے۔''

جب یہاں آیا تو اسے دیکھتے ہی اماں کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔
"ارے اماں کیا ہوا؟ آپ کیسی ہیں۔" ناصر مرزا نے فکرمندی سے کہا۔
بس اتنا سننا تھا کہ وہ پھپک کر رو پڑیں۔ ان کی ہچکیاں بندھ گئیں۔ وہ اس طرح رو رہی تھیں جیسے خدانخواستہ ساحل عمر چل بسا ہو۔ وہ ڈائننگ ٹیبل پر اس کرسی پر بیٹھی تھیں جس پر بیٹھ کر ساحل عمر ناشتہ کیا کرتا تھا۔ گھر میں مرجینا بھی موجود تھی۔ اب وہ اماں کے ساتھ چوبیس گھنٹے رہ رہی تھی۔ ساحل عمر کے لاپتہ ہونے کے بعد مرجینا نے ان کے ساتھ مستقل رہنا شروع کر دیا تھا۔ یہ بات ناصر مرزا نے اس سے کہی تھی کیونکہ اماں کا اس عمر میں تنہا رہنا ٹھیک نہ تھا۔ ناصر مرزا نے تو انہیں اپنے ساتھ اپنے گھر لے جانے کا کہا تھا لیکن وہ مانی نہیں۔ کہنے لگیں۔ "نہیں بھیا...... میں اپنے ساحل کا گھر نہیں چھوڑ سکتی۔"
تب مجبور ہو کر ناصر مرزا نے مرجینا کو ہدایت کی تھی کہ ساحل عمر کے آنے تک وہ اس گھر میں مستقل رہنا شروع کر دے۔ اس نے خوشی سے یہ بات مان لی تھی۔
اماں روئے جا رہی تھیں اور ناصر مرزا خاموشی سے انہیں تکے جا رہا تھا۔ رونے کی آواز سن کر مرجینا بھی کام چھوڑ کر ان کے پاس آ گئی تھی۔ وہ انہیں تسلیاں دے رہی تھی۔ صاحب کی واپسی کا یقین دلا رہی تھی لیکن اماں پر کوئی اثر نہیں ہو رہا تھا۔
تب ناصر مرزا نے مرجینا سے ایک گلاس پانی لانے کو کہا۔ وہ فوراً ہی پانی لے آئی۔ ناصر مرزا نے گلاس پکڑ کر کچھ پڑھا اور پھر تین بار پانی میں پھونکیں ماریں۔ پھر بولا: "اماں...... پانی پی لیں۔"
ان کے دل میں جو غبار تھا وہ آنسو بہہ جانے کی وجہ سے خاصا دب گیا تھا۔ انہوں نے ناصر مرزا کی آواز سن کر سر اٹھایا۔ دوپٹے سے اپنے آنسو پونچھے اور پھر پانی اس کے ہاتھ سے لے کر گھونٹ گھونٹ پینے لگیں۔ اس پانی کو پی کر اماں کو خاصا سکون ملا۔
"بھئی...... میں نے اپنے ساحل کو خواب میں دیکھا ہے۔" یہ کہہ کر وہ پریشان سی ہو گئیں۔
ناصر مرزا نے ان کا چہرہ دیکھ کر اندازہ لگا لیا کہ اماں نے ساحل عمر کے بارے میں ضرور کوئی الٹا سیدھا خواب دیکھ لیا ہے۔ اس نے کہا: "اماں، خوابوں کا کیا بھروسہ...... آپ نے ساحل کے بارے میں ضرور کوئی برا خواب دیکھ لیا ہے۔"
"ناصر جب سے میں نے ساحل کو خواب میں دیکھا ہے، میرا دل پریشان ہے۔ کسی طرح بہلتا ہی نہیں۔ میرا ساحل ضرور کسی مصیبت میں مبتلا ہے۔"
"آپ نے کیا دیکھا؟" ناصر مرزا نے پوچھا۔
"میں نے ایک جنگل بیابان دیکھا...... اس جنگل میں میرا ساحل ننگے پاؤں، ایک کالی چادر اوڑھے مارا مارا پھر رہا ہے۔ میں اسے دیکھ کر اس کے پیچھے بھاگتی ہوں۔ اسے آوازیں دیتی ہوں لیکن وہ کچھ سنتا ہی نہیں۔ میں چیخ چیخ کر اس کا نام پکارتی ہوں لیکن اس پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ اتنے میں مرجینا مجھے اٹھا دیتی ہے۔ اماں اٹھ جاؤ، کوئی خواب دیکھ رہی ہو کیا؟ فوراً ہی میری آنکھ کھل جاتی ہے۔" اماں اپنا خواب سنا کر پھر پریشان ہو گئیں۔ ناصر مرزا کو محسوس ہوا جیسے وہ پھر رونے والی ہیں۔ ناصر مرزا

فوراً بولا: ''اماں آپ بالکل پریشان نہ ہوں۔ خواب کی تعبیر ہمیشہ الٹی ہوتی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ساحل عمر جہاں ہوگا آرام سے ہوگا۔ آپ بے فکر رہیں۔ میں ابھی حافظ موسیٰ کی طرف جا رہا ہوں۔ ان سے اس سلسلے میں بات کرتا ہوں۔ چلو ٹھیک ہے۔''

ناصر مرزا اٹھنے لگا تو اماں نے مرجینا کو اشارہ کیا۔ ''چائے لاؤ۔''

''اچھا' اماں جی' ابھی لائی۔'' یہ کہہ کر وہ تیزی سے کچن کی طرف بڑھی۔

''ارے' مرجینا رکو...... میں چائے نہیں پیوں گا۔ ابھی ناشتہ کر کے آ رہا ہوں۔'' وہ اماں سے مخاطب ہو کر بولا۔

''اچھا اماں میں چلتا ہوں۔ جو بھی بات ہوگی میں آپ کو فون پر بتا دوں گا۔''

''اچھا بھیا...... اللہ تمہیں خوش رکھے۔''

اماں ناصر مرزا کو گھر کے دروازے تک چھوڑنے آئیں اور جب تک وہ گاڑی میں بیٹھ کر روانہ نہیں ہو گیا گیٹ پر کھڑی رہیں۔

☆............☆............☆

ناصر مرزا جب حافظ موسیٰ کے گھر میں داخل ہوا تو اسے امید تھی کہ وہ حسب معمول چارپائی پر لاٹھی تھامے بیٹھے ہوں گے لیکن آج ناصر مرزا کو گھر کے پچھلے حصے میں جانے کی ضرورت نہ پڑی۔ وہ اسے گیٹ کے اندر آتے ہی نظر آ گئے۔ وہ املی کے درخت کے نیچے ایک مونڈھے پر بیٹھے تھے ہاتھ میں لاٹھی تھی۔ وہ لاٹھی کو دونوں ہاتھوں میں تھامے سر جھکائے بیٹھے تھے۔

ناصر مرزا نے نزدیک جا کر انہیں سلام کیا۔ سلام کا جواب دے کر انہوں نے پوچھا:

''ناصر مرزا کیسے ہو؟''

''حضرت میں تو ٹھیک ہوں لیکن ساحل عمر ابھی تک واپس نہیں آیا۔'' ناصر مرزا نے وقت ضائع کیے بنا فوراً ساحل عمر کا تذکرہ چھیڑ دیا۔

''میں نے تم سے کہا تھا کہ اسے ڈھونڈنا ہوگا' تم نے اسے کہاں تلاش کیا؟''

''حضرت میں نے اسے ڈھونڈا تھا۔ میں تو برکھا کے گھر میں بھی کود گیا تھا۔ وہ وہاں بھی نہیں تھا' البتہ اس کی گاڑی ضرور وہاں کھڑی تھی۔ میں اس کی گاڑی وہاں سے نکال لایا۔ اس دن میں اس چاقو کی وجہ سے بچ گیا ورنہ برکھا نے مجھے جلانے میں کوئی کسر نہ چھوڑی تھی۔'' ناصر مرزا نے ساری روداد سنائی۔

''اچھا' وہ سفلی والی...... اللہ اس سے بچائے۔ وہ پکی شیطان کی خالہ ہے۔'' وہ مسکرائے اور پھر لاٹھی میں بنی آنکھ سے اپنی آنکھ لگا لی۔

''حضرت پھر ساحل عمر کا کیا کروں...... مجھے یقین ہے کہ وہ برکھا کے چنگل میں ہے۔'' ناصر مرزا نے پوچھا۔

''ہاں' وہ تھا اس کے چنگل میں...... سفلی والی نے اس پر قبضہ کرنے کی کوشش کی تھی لیکن اب وہ اس کے چنگل سے نکل گیا۔'' حافظ موسیٰ لاٹھی سے اپنی آنکھ لگائے لگائے بولے۔

''اب وہ کہاں ہے؟'' ناصر مرزا نے پھر سوال کیا۔

''اب وہ محفوظ ہاتھوں میں ہے...... اچھے لوگوں میں ہے۔'' گول مول سا جواب ملا۔

''مجھے بتائیں...... وہ کہاں ہے' میں جا کر اسے لاؤں...... اماں نے رو رو کر برا حال کر رکھا ہے۔''

''اماں!'' انہوں نے حیرت آمیز لہجے میں دہرایا۔

''اصل میں وہ ان کی گود میں پلا بڑھا۔ آپ آیا سمجھ لیں اس کی......'' ناصر مرزا نے وضاحت کی۔

''اچھا...... میں اس کے لیے تمہیں ایک چیز بتا دیتا ہوں۔ ایک بوتل پانی پر پڑھ کر دے دینا۔ اسے پیتے ہی قرار آ جائے گا۔ اسے میرے حوالے سے بتا دینا کہ ساحل عمر کی طرف سے بالکل پریشان نہ ہو۔ اسے آنے میں تھوڑا وقت لگے گا۔''

''حضرت...... میں ساحل سے ملنا چاہتا ہوں...... کیا وہ اسی شہر میں ہے؟''

''نہیں...... وہ یہاں سے بہت دور جا چکا ہے۔ میں اگر بتا بھی دوں کہ وہ کہاں ہے...... تو تم اس سے مل نہ پاؤ گے۔ یوں سمجھو کہ وہ کسی اور دنیا میں' اور لوگوں میں چلا گیا ہے۔ میں ہوں اس کی دیکھ بھال کے لیے۔ تم پریشان مت ہو۔'' انہوں نے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

''اب آپ کی زبان سے سن لیا ہے کہ وہ جہاں ہے' ٹھیک ہے تو میرے دل کو قرار آ گیا ہے۔ اب میں اس سفلی والی کی خبر لیتا ہوں۔''

''کوشش کر دیکھو...... ویسے وہ تمہارے قابو میں آئے گی نہیں...... وہ بہت عیار عورت ہے۔''

''اس نے میری بھتیجی کو مارا ہے۔ اس نے عابد منجم کو قتل کیا ہے۔'' ناصر مرزا کے لہجے میں تپش آ گئی۔

''تو کیا تم اسے قتل کر کے خود قاتل بننا چاہتے ہو؟''

حافظ موسیٰ نے تنبیہ کی۔

''جی تو یہی چاہتا ہے۔'' ناصر مرزا نے کہا۔

''تو پھر اس میں اور تم میں کیا فرق رہے گا۔ تم بھی قاتل وہ بھی قاتل...... تم بھی مجرم وہ بھی مجرم۔ تم بھی سزا کے مستحق' وہ بھی سزا کی مستحق۔''

''پھر میں کیا کروں...... میرے اندر انتقام کی آگ بھڑک رہی ہے۔''

''صبر کرو...... وقت کا انتظار کرو۔ میں بھی یہیں ہوں۔ تم بھی یہیں ہو۔ میں بھی دیکھوں گا' تم بھی دیکھو گے۔''

''جی بہت بہتر۔'' ناصر مرزا نے یہ بات بڑی مایوسی سے کہی۔

''بہت بہتر کہا ہے...... تو میری بات کو بہتر سمجھو بھی۔'' حافظ موسیٰ نے اچانک اپنی آنکھ لاٹھی سے ہٹالی اور اسے اپنی بے نور آنکھوں سے دیکھا۔

ناصر مرزا کو یوں محسوس ہوا جیسے وہ واقعی اس کو دیکھ رہے ہوں۔ ناصر مرزا نے فوراً اپنی

آنکھیں نیچی کر لیں۔ انہوں نے اس کے دل کا چور پکڑ لیا تھا۔

"اماں کے لیے آپ جو چیز بتانے والے تھے' وہ بتا دیں' میں پڑھ کر پانی کی بوتل ان کے حوالے کر دوں گا۔"

"ہاں...... دیکھو ایسا کرنا۔" پھر ایک لمحے انہوں نے توقف کیا اس کے بعد بتا دیا کہ کیا پڑھ کر پھونکنا ہے۔ اس کے بعد بولے: "ٹھیک ہے ناصر مرزا تم جاؤ۔"

"اچھا حضرت...... میں چلتا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ اٹھا اور خاموشی سے ان کے گھر سے نکل آیا۔

☆............☆............☆

تہکال نے تھوڑی ہی دیر میں ساحل عمر کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔ اس کی گردن کو مضبوطی سے تھامتے ہی اس پر غنودگی کی سی کیفیت طاری ہوگئی تھی۔ جب ذرا اسے ہوش آیا تو اس نے خود کو ایک دریا کے کنارے پایا لیکن یہ دریا میدانی علاقے کا نہ تھا' پہاڑی علاقے کا تھا۔ چاروں طرف خوبصورت مناظر پھیلے ہوئے تھے۔

وہ چھوٹے مگر گول پتھروں پر لیٹا ہوا تھا۔ اس کے برابر سے ٹھنڈے اور شفاف پانی کا دریا جھاگ اڑاتا بہہ رہا تھا' سامنے پانی میں تہکال بیٹھا تھا۔ وہ اپنے پاؤں کسی بلی کی طرح چاٹ رہا تھا۔

ساحل عمر اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس نے دریا کے کنارے بیٹھ کر ٹھنڈے میٹھے پانی سے اپنا منہ دھویا۔ پھر چلو میں پانی لے کر خوب سیر ہو کر پیا۔ پانی بہت لطیف تھا۔ کوئی آدم نہ آدم زاد۔

اس نے تہکال کی طرف دیکھا۔ تہکال نے اپنا پاؤں چاٹنا فوراً چھوڑ دیا اور اپنی خوبصورت آنکھوں سے اسے دیکھا۔ اٹھ کر آیا اور اس کی پیٹھ سے پیٹھ لگا کر بیٹھ گیا۔

ساحل عمر نے اپنا ایک ہاتھ پیچھے کر کے اس کے سر پر پھیرا اور بولا: "تم مجھے کہاں لے آئے ہو؟"

"اس وقت آپ کاغان میں ہیں؟"

"ہیں...... وہ کون بولا۔ کیا تہکال؟ اس نے فوراً مڑ کر اس کی طرف دیکھا۔ تہکال بڑے آرام سے لیٹا ہوا تھا۔ ساحل عمر نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا: "یہ کاغان ہے؟"

"جی' یہ کاغان ہے۔" فوراً جواب ملا لیکن یہ جواب تہکال نے نہیں دیا تھا۔ یہ جواب اس شخص نے دیا تھا جو تہکال کی انتہائی بائیں جانب دم کے نزدیک کھڑا تھا اور اسے دیکھنے کے لیے ساحل عمر کو اپنی گردن خاصی گھمانا پڑی اور جب اس شخص پر نظر پڑی تو وہ حیران ہو کر ایک دم کھڑا ہو گیا۔

☆......☆......☆

"بازغر تم...... یہ تم ہو؟" ساحل عمر نے کہا۔

"جی ساحل صاحب...... یہ میں ہوں۔ آپ کا خادم!" بازغر کے لہجے میں بڑی فرمانبرداری تھی۔

"تم میرے کب سے خادم ہو گئے...... اور یہ سب کیا ہے؟"

''کچھ نہیں ہے..... یہ تہکال ہے۔ اس علاقے کا نام کاغان ہے۔ اب ہمیں یہاں سے نکلنا ہے۔ آگے چلنا ہے۔ ابھی ہماری منزل نہیں آئی۔'' اس نے مسکرا کر کہا۔

''ہماری منزل کہاں ہے؟''

''زیادہ دور نہیں ہے..... چند گھنٹوں کا سفر ہے..... آیئے چلیں۔ پہلے چل کر کچھ کھا پی لیں۔ پھر سفر اختیار کریں گے۔''

ان دونوں کے چلتے ہی تہکال بھی اٹھ کھڑا ہوا اور پھر وہ دریا میں اتر گیا۔ کچھ دیر تو وہ پانی میں نظر آیا پھر اچانک ہی غائب ہو گیا۔ یوں محسوس ہوا جیسے وہ پانی میں غوطہ لگا گیا ہو۔

ساحل عمر نے اس منظر کو بڑی حیرت سے دیکھا۔

''کیا دیکھ رہے ہیں؟'' بازغر نے ساحل عمر کو دریا کی جانب حیرت آمیز انداز میں دیکھتے ہوئے پایا تو پوچھا۔

''تہکال کو دیکھ رہا تھا۔'' ساحل عمر نے جواب دیا۔ ''دیکھتے ہی دیکھتے غائب ہو گیا۔''

''اب تو آپ کو اس بات کا عادی ہو جانا چاہیے۔ وہ آپ کو کہاں سے کہاں لے آیا..... اور کتنے کم وقت میں اس بات کا اندازہ ہے آپ کو..... تہکال بہت زبردست چیز ہے۔ اس کا کوئی جواب نہیں۔'' بازغر نے دریا کی طرف دیکھتے ہوئے تہکال کی تعریف کی۔

''مجھے اس بات کا بخوبی اندازہ ہے۔ واقعی تہکال کوئی انوکھی شے ہے۔'' ساحل عمر بولا۔

''آپ ننگے پاؤں ہیں..... یہ لیجئے میرے چپل پہن لیجئے۔'' بازغر نے اپنے سینڈل اتارتے ہوئے کہا۔ ''ابھی آپ کو پیدل چلنا پڑے گا۔ اوپر کاغان کے بازار میں پہنچ کر آپ کے لیے کچھ انتظام کرتا ہوں۔''

ساحل عمر کو یاد آیا کہ جب وہ قبر والے کمرے میں تھا' اس کے پاؤں میں جوتے نہ تھے۔ وہاں سے چترو بھیل اسے لے اڑا۔ چترو بھیل کے ساتھ اس نے جتنا سفر کیا' ننگے پاؤں ہی کیا' اب اسے پھر ننگے پاؤں چلنا تھا۔ یہ پہاڑی علاقہ تھا۔ یہاں ننگے پیر چلنا آسان نہ تھا۔ اس لیے اس نے بازغر کے چپل پہن لینے میں ہی عافیت جانی۔ اگرچہ وہ سینڈل اس کے پاؤں میں تھوڑے سے بڑے تھے لیکن ننگے پاؤں چلنے سے کہیں بہتر تھا کہ بڑے سینڈل پہن لیے جائیں۔

بازغر نے کاغان کے ایک اچھے ہوٹل میں اسے ٹھہرایا اور کمرے میں پہنچا کر بولا۔ ''آپ اتنی دیر میں نہا دھو لیں' میں ذرا بازار گھوم کر آتا ہوں۔''

ساحل عمر جب نہا دھو کر باہر نکلا تو اس نے دیکھا کہ بیڈ پر شلوار قمیض کا ایک جوڑا رکھا ہے اور بیڈ کے ساتھ نئے سینڈل نما چپل رکھے ہیں۔ اس نے فوراً کپڑے تبدیل کر لیے اور بیڈ پر نیم دراز ہو کر بیٹھ گیا۔

چند لمحوں بعد دروازے پر دستک ہوئی۔ ساحل عمر نے دروازے کی طرف منہ کر کے زور سے کہا۔ ''آ جاؤ بھئی۔''

اس کا خیال تھا کہ ہوٹل کا کوئی بیرا ہوگا۔ کچھ کھانے پینے کا پوچھنے آیا ہوگا لیکن جب دروازہ

کھلا تو اسے سامنے بازغ نظر آیا جس کے ہاتھ میں لوازمات سے بھری ٹرے تھی۔
''ارے یہ آپ کیوں لائے؟ ہوٹل کے کسی بندے سے کہہ دیا ہوتا۔'' ساحل عمر اٹھتا ہوا بولا۔
''یہ سب چیزیں میں اپنی نگرانی میں تیار کروا کر لایا ہوں۔ آپ کو بھوک لگی ہوگی۔''
''ہاں، بھوک تو شدید لگی ہے۔'' ساحل عمر نے ناشتے کے سامان سے بھری ٹرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
''بس تو پھر شروع ہو جایئے۔ میں جب تک جیپ کا انتظام کر کے آتا ہوں۔ آپ کچھ دیر آرام کریں گے یا فوراً ہی چلیں گے۔'' جاتے جاتے اس نے پوچھا۔
''ناشتہ کرنے کے بعد مجھے بس ایک گھنٹے کا ریسٹ دے دیں۔ پھر جہاں کہیں گے، چلوں گا۔ ویسے جانا کہاں ہے؟'' ساحل عمر نے پوچھا۔
''آپ کبھی اس علاقے میں آئے ہیں؟'' بازغ نے سوال کیا۔
''نہیں، آج تک نہیں...... ویسے سوات، گلگت، کشمیر اور مری وغیرہ میں نے دیکھ رکھے ہیں۔'' اس نے بتایا۔
''بس تو پھر اب اس علاقے کا حسن دیکھئے، میں آپ کو جھیل سیف الملوک تک لے چلوں گا۔''
''وہ جھیل سیف الملوک جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ اتنی حسین ہے کہ وہاں پریاں اترتی ہیں۔ کیا واقعی ایسا ہے؟'' ساحل عمر نے بڑے اشتیاق بھرے لہجے میں پوچھا۔
''کیا آپ پریوں پر یقین رکھتے ہیں؟'' وہ جاتے جاتے ٹھہر گیا اور ایک کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گیا۔
''میں نے آج تک کوئی پری نہیں دیکھی۔'' ساحل عمر نے ہنس کر جواب دیا۔ ''پھر یقین کیونکر آئے۔''
''کیا آپ نے کوئی جن دیکھا ہے؟'' بازغ نے سوال کیا۔
''نہیں، میں نے کوئی جن بھی نہیں دیکھا۔'' وہ بولا۔
''کیا آپ ان کے وجود کے قائل ہیں؟'' بازغ نے پوچھا۔
''ہاں، بالکل...... جنات کا ذکر اللہ کی آخری کتاب میں موجود ہے۔''
''گویا آپ کا ان چیزوں پر بھی یقین ہے جو آپ نے اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھیں؟''
''جی بالکل...... میں اپنے خالق پر یقین کامل رکھتا ہوں۔ حالانکہ میں نے اسے نہیں دیکھا۔''
''اللہ کی بات کر رہے ہیں؟'' بازغ نے وضاحت چاہی۔
''جی ہاں، اسی عظیم ہستی کی بات کر رہا ہوں جو ازل سے ہے اور ابد تک رہے گی۔''
''آپ کیا سمجھتے ہیں...... میرے اور آپ کے اللہ نے بس یہ دنیا ہی بنائی ہے؟'' بازغ نے ایک نیا سوال اٹھایا۔

''نہیں...... ہماری دنیا کے علاوہ بھی بہت کچھ ہے اس کائنات میں...... چاند' سورج' ستارے' سیارے۔ یہ ایک ہمارا نظام شمسی ہے۔ جانے ایسے کتنے نظام شمسی ہوں گے۔ ہمارے سائنسدان تحقیق میں لگے ہیں۔ مریخ پر انہوں نے زندگی کے آثار تلاش بھی کر لیے ہیں۔'' ساحل عمر نے بات آگے بڑھائی۔

''آپ کا کیا خیال ہے۔ ہمیں اور آپ کو تخلیق کرنے والے نے یہ چاند' یہ سورج' یہ ستارے' یہ سیارے' بس یونہی بنا کر چھوڑ دیئے...... بے مقصد...... میں سمجھتا ہوں کہ جب اللہ کوئی چیز بناتا ہے تو ساتھ ہی اس چیز کو دیکھنے والا بھی بناتا ہے۔ یہ حسین دنیا اس نے تخلیق کی تو ساتھ ہی اس دنیا کو دیکھنے والے بھی بنائے۔ چاہے یہ انسان کی صورت میں ہوں یا جنات کی صورت میں یا کسی اور مخلوق کی صورت میں ہوں۔ عرض کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ اپنا اظہار چاہتا ہے۔ اپنے وجود کا اقرار چاہتا ہے۔ اپنی وحدت کو تسلیم کروانا چاہتا ہے۔ یہ دنیا ہوتی لیکن دنیا والے نہ ہوتے تو پھر دنیا میں بکھرے ہوئے حسن کو کون دیکھتا...... اور جب کوئی دیکھنے والا نہ ہوتا تو تخلیق والے کو کون پہچانتا۔ میں اصل میں کہنا یہ چاہتا ہوں کہ اللہ نے دنیا کے علاوہ جو کچھ پیدا کیا ہے' وہاں ان کو دیکھنے والے بھی پیدا کیے ہوں گے۔ ممکن ہے کسی سیارے پر شیشے کے انسان بستے ہوں۔ ہو سکتا ہے کسی اور سیارے پر اسٹیل کے انسان پیدا کیے گئے ہوں۔ ممکن ہے سورج پر بھی کوئی مخلوق آباد ہو۔ آپ دور کیوں جائیں' اپنی دنیا کو ہی لیں۔ ممکن ہے اس دنیا میں انسان اور جنات کے علاوہ بھی جانے کتنی مخلوق آباد ہو۔ انسان کی نظر محدود ہے۔ ممکن ہے وہ دوسری مخلوق کو دیکھ نہ پاتا ہو۔ ممکن ہے پریوں کا بھی وجود ہو۔ ہمیں سوچنا چاہیے' تفکر کرنا چاہیے۔ جب آدمی سوچتا ہے' تفکر کرتا ہے تو چیزیں وجود میں آنے لگتی ہیں۔ ایجادات ہونے لگتی ہیں۔ ہم جو کچھ ایجاد کرتے ہیں' اس کا وجود پہلے سے موجود ہوتا ہے۔ وہ ''موجود'' تفکر کے ذریعے ہمارے خیال کی گرفت میں آ جاتا ہے۔ اس کائنات میں جتنی بھی مخلوق ہے' اس کے دماغ ایک دوسرے سے خیال کی لہروں کے ذریعے جڑے ہوئے ہیں۔ یہ انسان نے جو کمپیوٹر ایجاد کیا ہے اور ان کمپیوٹروں کو دنیا میں پھیلے ہوئے کمپیوٹروں کو انٹرنیٹ کے ذریعے جو جوڑا ہے تو یہ خیال کہاں سے آیا؟ یہ سوچنے کی بات ہے۔ جس طرح کمپیوٹر کو ایک عام آدمی نہیں چلا سکتا' ایسے ہی کائنات میں پھیلی دوسری مخلوق سے ہر شخص رابطہ نہیں کر سکتا۔ یہ رابطہ ایک تربیت یافتہ ذہن ہی کر سکتا ہے۔ یہ دماغ کسی خاص انسان کا ہی ہو سکتا ہے۔ ایسا انسان جسے اللہ کا قرب حاصل ہو۔'' یہ کہہ کر بازغر خاموش ہو گیا۔

کچھ دیر کمرے میں گہری خاموشی چھائی رہی۔ ساحل عمر بازغر کو حیرت بھری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ وہ بازغر کو ایک عام سا آدمی سمجھ رہا تھا لیکن اس نے ابھی جو کچھ کہا تھا' وہ ایک عام آدمی کی سمجھ میں آنے والی باتیں نہ تھیں۔

''آپ کون ہیں؟'' ساحل عمر نے بالآخر پوچھ ہی لیا۔

''میں...... اللہ کی مخلوق ہوں۔'' بازغر نے غیر واضح جواب دیا۔

''انسان ہیں؟'' ساحل عمر نے وضاحت چاہی۔

''انسان ہونا کتنا مشکل ہے۔ کاش میں انسان بن سکتا۔'' بازغر نے بڑی ذہانت سے جواب

دیا۔ اس جواب سے کسی قسم کا اندازہ کرنا مشکل تھا۔

ساحل عمر نے اسے مسکرا کر دیکھا' بولا کچھ نہیں۔ وہ بھلا اس سے اب اور کیا پوچھتا۔

تب بازغر فوراً اٹھ کھڑا ہوا اور بولا۔ ''اچھا' میں چلتا ہوں۔ آپ کو خوانخواہ باتوں میں الجھا لیا۔ آپ اطمینان سے ناشتہ کیجئے۔''

یہ کہہ کر وہ کمرے سے نکل گیا' اس نے ساحل عمر کے جواب کا بھی انتظار نہ کیا۔

ناشتہ کرنے کے بعد ساحل عمر پر نیند کا سا غلبہ ہونے لگا۔ وہ بیڈ پر پاؤں پھیلا کر لیٹ گیا۔ لیٹے لیٹے اس کا دھیان برکھا کی طرف چلا گیا۔ برکھا اپنی ساحرانہ صلاحیتوں میں اضافہ کے لیے اسے قربان کرنا چاہتی تھی۔ وہ اس کی جان کے درپے تھی۔ ساحل اس کے سحر میں مبتلا ہو کر اس کے بنگلے پر پہنچ گیا تھا۔ برکھا نے اسے چترو بھیل کے استھان پر پہنچا دیا۔ چترو بھیل صحرا کا ایک بڑا ساحر تھا۔ اس کی موت واقع ہوئے پانچ سال کا عرصہ ہو چکا تھا۔ چترو بھیل کی روح کاویری سے اپنی موت کا انتقام لینا چاہتی تھی۔ اس نے ساحل عمر کو برکھا سے چھین لیا۔ وہ اسے لے اڑا۔ ابھی وہ چترو بھیل کے چنگل میں پھنسا اس کے انتقام کا ذریعہ بننے والا تھا کہ تہکال اسے وہاں سے نکال لایا۔ فضا اور مقام بدل گیا' لوگ بدل گئے۔ اب وہ ایک پہاڑی مقام پر بازغر کی تحویل میں تھا۔

ساحل عمر سوچ رہا تھا کہ شاید وہ کوئی سونے کی چڑیا ہے جسے ہر شخص حاصل کرنے کے چکر میں ہے۔ برکھا اور چترو بھیل کا معاملہ تو اس کی سمجھ میں آ گیا کہ ایک اپنی ساحرانہ قوتیں بڑھانے اور ایک اپنے انتقام کا ذریعہ بنانا چاہتا تھا۔ اب یہ بازغر کس پھیر میں ہے اور وہ اسے جھیل سیف الملوک کیوں لے جانا چاہتا تھا' یہ بات اس کی سمجھ سے بالاتر تھی۔ ابھی تک اس کے رویئے سے یہ تاثر نہیں ملا تھا کہ وہ اس کی قید میں ہے۔ وہ اس کے ساتھ نہایت پروقار طریقے سے پیش آ رہا تھا۔ اسے انتہائی اہم شخص سمجھ رہا تھا۔ ساحل کے ساتھ اس کا برتاؤ ایک غیر معمولی شخص جیسا تھا۔

حالات کا تجزیہ کرتے کرتے اس کی آنکھوں میں نیند اترنے لگی۔ چند لمحوں بعد وہ نیند میں ڈوب گیا۔

دروازے پر دستک کی آواز سے اس کی آنکھ کھلی تو اسے اندازہ ہوا کہ وہ دو گھنٹے سے زائد سو چکا ہے۔ وہ فوراً اٹھ کر دروازے پر پہنچا۔ اس نے دروازہ کھولا تو بازغر کھڑا مسکرا رہا تھا۔

''آپ کو میں نے نیند سے تو نہیں اٹھا دیا۔ آپ نے مجھ سے ایک گھنٹہ آرام کی بات کی تھی' میں تو ڈھائی گھنٹے کے بعد واپس آیا ہوں۔ میں جیپ لے آیا ہوں۔ جیپ ہوٹل کے باہر کھڑی ہے۔ آپ منہ ہاتھ دھو کر باہر آ جائیے۔ تب تک میں ہوٹل والوں کا حساب چکاتا ہوں۔'' اور پھر وہ دروازے سے ہی واپس چلا گیا۔

ساحل عمر نے باتھ روم میں جا کر منہ ہاتھ دھویا۔ اس کی ساری تھکن دور ہو چکی تھی۔ وہ اس وقت خود کو تازہ دم محسوس کر رہا تھا۔ کمرے میں اس کا کوئی سامان نہ تھا۔ بس وہ کپڑے تھے جو اس نے اتارے تھے۔ اس نے ان کپڑوں کو باتھ روم میں ہی چھوڑ دیا اور کمرے سے باہر نکل آیا۔

جب وہ ہوٹل کے دروازے سے باہر نکلا تو بازغر کو اپنا منتظر پایا۔ بازغر نے جیپ کا اگلا

دروازہ کھول کر اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود وہ پیچھے چلا گیا۔ جیپ کا ڈرائیور ایک نوجوان تھا اور اپنے چہرے مہرے سے کشمیری دکھائی دیتا تھا۔

''چلو بھائی!'' بازغر نے پیچھے سے گرین سگنل دیا۔ جیپ چل پڑی۔

کاغان سے ناران تک سفر ایک کچی سڑک پر طے ہوا۔ درمیان میں متعدد بار گلیشیر آئے۔ جیپ ہچکولے کھاتی ان گلیشیروں کے اوپر سے گزری۔ بالآخر ناران آ گیا۔

ناران کے سب سے اچھے ہوٹل میں بازغر نے ساحل عمر کو ٹھہرایا۔ کھانا کھانے تک بازغر ساحل عمر کے ساتھ رہا۔ پھر یہ کہہ کر چلا گیا کہ اب وہ کل صبح اس کے پاس آئے گا۔ ناشتہ کرنے کے بعد وہ جھیل سیف الملوک کا سفر اختیار کریں گے۔

ساحل عمر اسے ہوٹل کے گیٹ تک چھوڑنے آیا۔ اس کے جانے کے بعد ساحل عمر نے اطراف کا جائزہ لیا۔ یہ ہوٹل بہت خوبصورت جگہ واقع تھا۔ ساحل عمر یونہی ٹہلتا ہوا ہوٹل کی حدود سے باہر نکل آیا۔

پھر وہ تختوں والا چھوٹا سا پل کراس کر کے ناران کے بازار میں آ گیا۔ ایک لمبا اور دور تک پھیلا ہوا بازار تھا۔ اس نے بازار کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک چکر لگایا اور پھر اپنے ہوٹل واپس آ گیا۔

ہوٹل کے دروازے سے ایک فیملی باہر نکل رہی تھی۔ دو تین لڑکیوں کے ساتھ ایک بزرگ خاتون تھیں۔ ان خاتون میں ''اماں'' کی بڑی شباہت تھی۔ انہیں دیکھ کر اسے اپنی اماں یاد آ گئیں۔ اسے گھر سے نکلے کئی دن ہو گئے تھے۔ وہ گھر سے نکلا بھی کس قدر عجلت میں تھا۔ اس نے اماں سے بھی بات نہ کی۔ بس گاڑی میں بیٹھ کر گھر سے نکل آیا۔ اس کے آنے کے بعد جانے اماں کا کیا حال ہوا ہو۔ انہیں اس کی اس حرکت پر کس قدر صدمہ ہوا ہوگا۔ ناصر مرزا اور مسعود آفاقی الگ پریشان ہوں گے۔ اسے چاہیے کہ وہ یہاں سے اماں کو ٹرنک کال کرے۔ انہیں فون پر بتا دے کہ وہ کہاں ہے۔

یہ سوچ کر اس نے ہوٹل کے ٹیلی فون آپریٹر کو اپنے گھر کا نمبر دیا اور ارجنٹ کال ملانے کی ہدایت کی۔ اس کی قسمت اچھی تھی کہ کوئی دس پندرہ منٹ بعد ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ ریسیور اٹھایا تو آپریٹر کی آواز سنائی دی۔ ''سر کراچی بات کیجیے۔''

''اچھا!'' ساحل عمر نے بے قراری سے کہا۔ ''ہیلو!''

''آپ کون؟'' ادھر سے مرجینا کی آواز سنائی دی۔

''مرجینا' میں ساحل بول رہا ہوں...... اماں کو بلاؤ۔'' ساحل نے اس کی آواز پہچان کر کہا۔

''ارے صاحب جی آپ...... اوہ...... اماں جی' جلدی آئیں۔'' مرجنیا اس کا نام سن کر خوشی سے دیوانی ہو گئی۔ وہ زور سے چیخی۔ ''صاحب جی کا فون ہے۔''

اماں اپنے کمرے میں عصر کی نماز پڑھ کر مصلے پر بیٹھی ساحل عمر کے لیے دعا مانگ رہی تھیں کہ مرجینا کی بے تابانہ آواز کان میں پڑی۔ وہ مصلہ سمیٹ کر فوراً اٹھ کر بھاگیں۔ ''میرے اللہ نے میری سن لی۔ میرے ساحل کا فون آ گیا۔''

''صاحب جی' اماں جی آ گئیں۔ بات کریں۔'' مرجینا نے یہ کہہ کر ریسیور اماں کے ہاتھ میں دے دیا اور وہیں کھڑے ہو کر اماں کی گفتگو سننے لگی۔

''میرے ساحل' میری جان تم کہاں ہو؟'' اماں بے قراری سے بولیں۔

''اماں' اس وقت میں ناران میں ہوں۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔ مجھ سے غلطی ہو گئی کہ آپ کو بتائے بغیر گھر سے نکل آیا۔ آپ پریشان نہ ہوں۔ میں جلد ہی کراچی واپس آ جاؤں گا۔'' ساحل عمر نے جلدی جلدی اپنے بارے میں بتا کر اماں کو تسلی دی۔

''شکر ہے اللہ کا کہ تمہارا فون آ گیا۔ تم جہاں ہو' خیریت سے ہو۔ بس اتنا جاننا میرے لیے کافی ہے۔ ناصر اور مسعود بھی تمہارے لیے پریشان تھے۔ اب میں فون کر کے انہیں تمہاری خیریت بتائے دیتی ہوں۔ تمہارے یہ دونوں دوست بہت اچھے ہیں۔ انہوں نے نہ صرف میرا خیال رکھا بلکہ تمہارے لیے تو یہ بھائیوں کی طرح پریشان تھے۔'' اماں نے کہا۔

''صاحب جی! اماں جی نے خود اپنا رو رو کر برا حال کیا ہوا ہے۔'' مرجینا نے ریسیور کے قریب اپنا منہ کر کے کہا۔

''اماں! یہ مرجینا...... کیا کہہ رہی ہے۔ آپ اپنا خیال رکھیں۔ بس اب بالکل رونے دھونے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں کل جھیل سیف الملوک جاؤں گا۔ یہاں بازغر میرے ساتھ ہے۔ اماں آپ کو وہ شخص یاد ہے ناں جو ایک چیتے کی تصویر بنوانے آیا تھا؟'' ساحل عمر نے اماں کو یاد دلایا۔

''ہاں' اسے میں کیسے بھول سکتی ہوں۔ وہ تمہاری غیر موجودگی میں یہاں آیا تھا۔ کیا تم نے اسے بھیجا تھا۔'' اماں کو فوراً بازغر کا گھر میں آنا یاد آ گیا۔

''نہیں اماں...... میں نے تو اسے نہیں بھیجا۔ وہ کیا کہنے آیا تھا۔'' ساحل عمر نے سوال کیا۔

''اے بھیا...... اس نے کہا وہا تو کچھ نہیں...... اس وقت گھر میں ناصر اور مسعود دونوں موجود تھے۔ وہ ہم تینوں کو گھر میں چھوڑ کر گھر میں گھستا چلا گیا۔ جب ہم لوگ اس کے پیچھے گھر میں آئے تو وہ ہمیں کہیں نہیں ملا۔ جانے وہ کدھر سے نکل گیا اور ساتھ میں تصویر بھی لے گیا۔''

''تصویر!'' ساحل عمر نے حیرت سے پوچھا۔ ''اماں! کون سی تصویر؟ کہیں وہ رشا ملوک کی تصویر' میرا مطلب ہے وہ دلہن والی تصویر تو نہیں لے گیا جو میرے بیڈ روم میں لگی تھی۔'' ساحل عمر نے پریشان ہو کر کہا۔

''ہاں' ساحل وہی تصویر...... وہ لے اڑا۔'' اماں نے شکایتی انداز میں کہا۔ ''بھیا' مجھے تو وہ کوئی جن ون لگتا ہے۔ گھر میں گھستے تو سب نے دیکھا' تصویر لے کر گھر سے نکلتے کسی نے نہ دیکھا۔ وہ کوئی جادوگر ہے کہ سب کو اندھا کر کے نکل گیا۔ اب تم بتا رہے ہو کہ وہ تمہارے ساتھ ہے تو کیا اس نے یہاں آنے اور تصویر اپنے ساتھ لے جانے کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔''

''نہیں اماں! اب وہ صبح آئے گا تو اس سے بات کروں گا۔'' ساحل عمر نے فکرمند ہو کر کہا۔

''اچھا اماں! اب آپ پریشان مت ہونا' میں بہت جلد آپ کے پاس پہنچ جاؤں گا۔ اچھا خدا حافظ!''

''اللہ تمہیں حفظ و امان میں رکھے...... خدا حافظ!''

ساحل عمر ریسیور رکھ کر سوچ میں پڑ گیا۔ بازغر اس کے گھر جا کر رشا ملوک کی تصویر کیوں لے آیا؟ اسے یاد آیا کہ وہ رشا ملوک کی تصویر خریدنا چاہتا تھا۔ ساحل عمر کو یہ بھی یاد آیا کہ وہ اس تصویر کے ایک کروڑ سے زائد دینے کو تیار تھا۔ بالآخر وہ اس تصویر کو گھر میں موجود لوگوں کی آنکھوں میں دھول جھونک کر اڑا لایا اور اس نے ساحل عمر کو اس سلسلے میں کچھ بتایا بھی نہیں۔ بازغر کے بارے میں وہ پہلے ہی مشکوک تھا۔ اسی لیے اس نے اس سے پوچھا تھا کہ آپ کون ہیں؟ اور وہ اس بات کا جواب غیر واضح انداز میں دے کر اپنا پہلو بچا گیا تھا۔ اب اماں نے جس طرح اس کے گھر میں داخل ہونے کی تصویر کشی کی ہے۔ اس سے تو ظاہر ہوتا ہے کہ وہ انسان نہیں ہے' کوئی اور مخلوق ہے یا پھر کوئی بڑا ساحر ہے اور آج اس نے جس انداز کی باتیں کیں' اس سے اندازہ ہوا کہ وہ نہ صرف ایک ذہین شخص ہے بلکہ جدید معلومات بھی رکھتا ہے۔

وہ اس سے کیا چاہتا ہے۔ اسے جھیل سیف الملوک کیوں لے جانا چاہتا ہے۔ رشا ملوک کی تصویر اس نے کیوں اڑائی۔ وہ اسے اس قدر اہمیت کیوں دے رہا ہے؟ اس کا میزبان کیوں بنا ہوا ہے؟ ان ساری باتوں کے پیچھے کیا سازش چھپی ہوئی ہے؟ برکھا اور چتر و بھیل کی طرح کیا یہ بھی کوئی مذموم مقاصد رکھتا ہے۔

وہ بازغر کے بارے میں سوچتا رہا اور الجھتا رہا لیکن کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکا۔

ساحل عمر کی آنکھ کسی آواز پر کھلی تھی۔ آنکھ کھلنے پر احساس ہوا کہ کوئی دروازے پر بڑے مہذبانہ انداز میں دستک دے رہا ہے۔ کمرے میں روشنی ہو رہی تھی۔ اس سے اس نے اندازہ لگایا کہ صبح ہو چکی ہے۔ پھر اس نے تکیے کے نیچے سے اپنی رسٹ واچ نکال کر ٹائم دیکھا۔ صبح کے آٹھ بج رہے تھے۔

وہ جلدی سے اٹھا۔ اٹھ کر دروازہ کھولا تو سامنے ہنستا مسکراتا بازغر نظر آیا۔ وہ شلوار قمیض پر کڑھی ہوئی کوٹی پہنے ہوئے تھا۔ سر پر گول ٹوپی تھی اور اس ٹوپی کے سامنے ایک چھوٹا سا رنگ برنگا پر لگا ہوا تھا۔ وہ اس وقت خاصا ترو تازہ نظر آ رہا تھا۔

''آپ ابھی تک سو رہے ہیں؟'' اس نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے پوچھا۔

''رات کو ذرا دیر سے نیند آئی۔'' ساحل عمر نے اس کا چہرہ بغور دیکھتے ہوئے کہا۔ اس کے دماغ میں کل شام اماں سے ہونے والی گفتگو گونجنے لگی۔ یہ شخص کس قدر معصوم بنا ہوا ہے۔ اس کے گھر جا کر اس کی غیر موجودگی میں پینٹنگ چرا لایا اور اس بات کا ذکر ابھی تک نہیں کیا۔

ساحل عمر کو بڑا غصہ تھا۔ وہ چاہ رہا تھا کہ اس کے کمرے میں داخل ہوتے ہی اس پینٹنگ کے بارے میں سوال کرے۔ پھر کچھ سوچ کر رک گیا۔ ابھی کچھ دیر انتظار کرنا چاہیے' ہو سکتا ہے وہ خود ہی ذکر کر دے۔

''کیوں کیا سوچتے رہے؟'' بازغر نے پوچھا۔

''بازغر صاحب! میں آپ کے بارے میں سوچتا رہا۔'' وہ واش روم جاتے جاتے رک گیا۔ اس نے اسے ترچھی نظروں سے دیکھا۔

''میرے بارے میں سوچتے رہے۔ میں بھی کوئی سوچنے کی چیز ہوں۔'' اس کے لہجے میں بڑی انکساری تھی۔

''کیوں نہیں..... کل آپ نے بہت اچھی باتیں کیں، میں آپ کی باتوں سے خاصا متاثر ہوا۔''

''آپ کیوں مجھے بنا رہے ہیں۔''

''میں بنا رہا ہوں یا آپ مجھے بنا رہے ہیں؟'' یہ بات اس نے کہنا چاہی لیکن ضبط کر گیا۔

''میں ذرا منہ ہاتھ دھو لوں۔ آپ اتنی دیر میں اپنی پسند کا ناشتہ منگوا لیجیے۔ آپ نے ابھی تک ناشتہ تو نہیں کیا ہوگا؟''

''میں تمام کاموں سے فارغ ہو کر آ رہا ہوں۔'' وہ خوشدلی سے بولا۔

''رات کو آپ کہاں رہے؟'' ساحل عمر نے سوال کیا۔

''ارے ساحل عمر صاحب! ہم غلاموں کا کیا ہے۔ جہاں جگہ ملی، سو گئے۔'' بازغر نے گول مول سا جواب دیا۔ پھر فوراً ہی بولا۔ ''آپ جلدی سے منہ ہاتھ دھو لیجیے، میں ناشتہ منگوا رہا ہوں۔ ذرا جلدی نکلنا ہے۔''

''اچھا ٹھیک ہے۔'' یہ کہہ کر ساحل عمر واش روم میں گھس گیا۔

ناشتے سے فارغ ہو کر بازغر نے کہا۔ ''آیئے اب چلیں..... جیپ والا ہمارا انتظار کر رہا ہوگا۔''

ساحل عمر فوراً کھڑا ہو گیا۔ وہ دونوں کاؤنٹر پر آئے۔ بازغر نے کمرے کی چابی واپس کی۔ ہوٹل کا حساب کتاب کیا اور ساحل عمر کی طرف مسکرا کر دیکھا اور آنکھ سے باہر نکلنے کا اشارہ کیا۔

بازغر نے ہوٹل کا حساب کر دیا تھا۔ چابی بھی واپس دے دی تھی۔ اس سے ساحل عمر نے اندازہ لگایا کہ اب ادھر لوٹ کر نہیں آنا یا اگر آنا ہے تو اس ہوٹل میں واپس نہیں آنا۔ ساحل عمر کو یہ بات معلوم تھی کہ جھیل سیف الملوک پر کوئی ہوٹل نہیں۔ لوگ وہاں صبح جاتے ہیں اور شام تک ناران واپس آ جاتے ہیں۔ ہو سکتا ہے۔ بازغر کا واپسی پر ناران رکنے کا ارادہ نہ ہو۔ وہ سیدھا کاغان نکل جانا چاہتا ہو۔ اس نے اس مسئلے پر بازغر سے کوئی بات نہ کی۔ وہ اس کے پیچھے پیچھے ہوٹل سے باہر نکل آیا۔

پھر وہ جیپ میں بیٹھ کر جھیل سیف الملوک کی طرف چل دیئے۔

ان کی جیپ کچے اور پتھریلے راستے پر چل رہی تھی۔ یہ ایک خطرناک راستہ تھا۔ کبھی اونچائی، کبھی ڈھلان، جیپ موڑ کاٹتی تو سینے میں دم اٹکتا۔ یوں محسوس ہوتا کہ جیپ اب کھائی میں گری، تب گری۔ جیپ کا ڈرائیور ایک ماہر شخص تھا۔ وہ بڑی مشاقی سے جیپ چلا رہا تھا۔ پھر بھی دل لرز رہا تھا۔

جیپ میں خاموشی چھائی تھی۔

خدا خدا کر کے یہ سفر ختم ہوا۔ گلیشیئر آ گیا تھا۔ اس ایک فرلانگ لمبے گلیشیئر کو پیدل طے کرنا تھا۔ یوں گلیشیئر کے اس پار پہنچانے کے لیے گھوڑے بھی یہاں موجود تھے لیکن ساحل عمر نے پیدل چلنے کو ترجیح دی۔ یہ ایک خطرناک برفانی راستہ تھا۔ سیمنٹ کی طرح جمی ہوئی برف۔ اس پر اس طرح سنبھل

سنبھل کر چلنا کہ پاؤں نہ پھسلے۔ ایک طرف برف کی دیوار' دوسری طرف کھائی اور مشکل سے ایک ڈیڑھ فٹ چوڑا راستہ۔

شروع میں ساحل عمر کو تھوڑی سی دقت ہوئی لیکن پھر اسے اس گلیشیر کو پار کرنے میں مزہ آنے لگا۔ ابھی صبح کا وقت تھا' اس لیے لوگوں کا زیادہ رش نہیں تھا۔ پھر بھی کئی فیملیاں ان کے آگے پیچھے تھیں اور جھیل سیف الملوک جانے والوں میں عورتیں بھی تھیں' بچے بھی تھے' جوان بھی تھے۔ سبھی اپنی اپنی ہمت اور جرات کا مظاہرہ کرتے گلیشیر پار کر رہے تھے۔

برف کا تنگ اور پھسلواں راستہ طے کرنے کے بعد ایک مرتبہ پھر جیپ کا سفر شروع ہوا۔ اچانک تیز اور ٹھنڈی ہوا چلنے لگی۔ بادل گھر آئے اور بارش کے آثار پیدا ہو گئے۔ ساحل عمر کو ہلکی سی سردی لگنے لگی۔

بازغر نے اپنے کندھے سے اتار کر ایک گرم چادر اس کے کندھے پر ڈال دی۔ ساحل عمر نے شکریہ کہہ کر اس چادر کو کھول کر اوڑھ لیا۔ پھر وہ ایک جیپ میں سوار ہو گئے' ابھی اور بلندی پر جانا تھا۔

یہ سب سے خطرناک راستہ تھا۔ بے حد تنگ' پتھریلا اور جان لیوا۔ یہاں چلنے والی جیپیں بھی خاص تھیں۔ طاقتور انجنوں والی' ان کو چلانے والے بھی انتہائی ماہر ڈرائیور تھے۔ موت کے کنویں میں شاید جیپ چلانا آسان ہو لیکن ان راستوں پر جہاں ہر فٹ کے فاصلے پر موت کا جال بچھا ہوا تھا' جیپ چلانا آسان نہ تھا۔ ایک تو راستہ اتنا خطرناک اوپر سے بارش شروع ہو گئی۔ ایک قیامت پر دوسری قیامت۔ ساحل عمر دم سادھے بیٹھا تھا۔ ہر موڑ پر' ہر چڑھائی پر' ہر ڈھلان پر اللہ یاد آتا تھا اور موت سامنے کھڑی دکھائی دیتی تھی۔

ساحل عمر کیونکہ ڈرائیور کے برابر والی سیٹ پر بیٹھا تھا۔ اس لیے راستے کی ہولناکی پوری طرح اس کی نظر میں تھی۔ جب بارش اور تیز ہو گئی تو اس نے پیچھے مڑ کر بازغر سے کہا۔ ''بارش رکنے کا انتظار نہ کریں۔ راستوں پر پھسلن ہو گئی ہو گی۔''

اس سے پہلے کہ بازغر کچھ بولتا' برابر بیٹھا ہوا ڈرائیور بولا۔

''صاحب ڈرو مت' یہ بارش ابھی رک جائے گی۔ راستوں پر پتھر پڑے ہیں۔ اس لیے راستوں پر پھسلن نہیں ہوتی۔ آپ آرام سے بیٹھے رہیں۔ یہ ہمارا روز کا کام ہے' آپ بے فکر ہو جائیں۔''

ڈرائیور کے بیان سے ساحل عمر کو تسلی نہ ہوئی۔ اس نے بازغر کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ تب بازغر بولا۔ ''آپ پریشان نہ ہوں' کسی قسم کا کوئی خطرہ نہیں ہے۔''

''اچھا!'' یہ کہہ کر ساحل عمر سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ اس کی تھوڑی سی تسلی ہو گئی۔ بارش کی وجہ سے جیپ کے پھسلنے کا جو خوف اس کے دل میں پیدا ہوا تھا' وہ ڈرائیور کی وضاحت اور بازغر کی تائید کے ساتھ کم ہو گیا لیکن راستے کی خطرناکی اپنی جگہ موجود تھی۔

خدا خدا کر کے یہ سفر ختم ہوا' آگے راستہ بند تھا۔ جیپ اس سے آگے نہیں جا سکتی تھی۔ بارش

رک چکی تھی۔ اب جھیل سیف الملوک تک جانے کے لیے پیدل سفر کرنا تھا۔ چاروں طرف اونچے اونچے پہاڑ تھے جن پر برف جمی ہوئی تھی۔ ہر طرف سحرانگیز مناظر تھے۔ اللہ نے یہ حسن کہاں لا کر بکھیرا تھا۔

وہ دونوں خاموشی سے کبھی ایک ساتھ اور کبھی آگے پیچھے چلے جا رہے تھے۔

پھر اچانک وہ لمحہ آیا۔ لمحہ حیرت' سانس جہاں ہو وہیں رک جائے۔

ایک موڑ مڑتے ہی جیسے ہی سامنے نگاہ اٹھی تو آنکھیں پلک جھپکنا بھول گئیں۔ سانس اوپر کا اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا۔ روح پر ایک دم سرشاری سی چھا گئی۔ سبحان تیری قدرت۔

سامنے جھیل سیف الملوک تھی۔

ساحل عمر آرٹسٹ تھا۔ نازک دل اور حساس دماغ رکھنے والا۔ وہ تو اس منظر کو دیکھ کر مبہوت رہ گیا۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے ہر چیز ایک لمحے کو ساکت ہو گئی ہو۔ اس نظارے کے علاوہ ہر نظارہ مٹ گیا ہو۔ اس جھیل کے حسن کے بارے میں اس نے جو کچھ سنا تھا' اس سے بڑھ کر پایا تھا۔

یہ جھیل تخلیق کرنے والے کی نادر پینٹنگ تھی۔ ایک ایسی پینٹنگ جسے دیکھ کر قدم چلنا بھول جائیں۔ آنکھیں پلکیں جھپکانا بھول جائیں' دل دھڑکنا بھول جائے اور روح کو سانس لینا یاد نہ رہے۔

اے اللہ تیرا کوئی جواب نہیں۔ تو نے کہاں لا کر یہ پینٹنگ نصب کی اور پھر اسے نمائش کے لیے انسانوں کے لیے کھولا۔ وہ پہلا شخص کون ہوگا جس نے جھیل سیف الملوک کو دریافت کیا۔ پھر پہاڑوں کا سینہ چھلنی کر کے ان پر راستوں کا جال بچھایا گیا۔ یہ راستے اگرچہ بے حد خطرناک اور جان لیوا ہیں لیکن اس جھیل کی کشش انسانوں کو اپنی طرف کھینچ لیے جاتی ہے۔ بازغر نے ٹھیک ہی کہا تھا' جب اللہ کوئی چیز تخلیق کرتا ہے تو اس کی نمائش کا انتظام بھی کرتا ہے۔ وہ خود کو چھپا کر نہیں رکھنا چاہتا۔ کائنات کا ذرہ ذرہ اس کا مظہر بن جاتا ہے۔ وہ ہر طرف دکھائی دینے لگتا ہے۔ بس ذرا سی توجہ چاہیے' دیکھنے والی آنکھ چاہیے۔

جھیل سیف الملوک جہاں سے اچانک دکھائی دیتی ہے اور بندے پر سحر طاری کر دیتی ہے' وہ مقام اونچائی پر ہے جبکہ جھیل سیف الملوک گہرائی میں ہے اور اس مقام سے ایک ڈیڑھ فرلانگ کے فاصلے پر ہے۔ تھوڑا سا آگے بڑھ کر یہاں چند دکانیں اور ایک چھوٹا سا ریستوران ہے۔ اس کے بعد ڈھلان شروع ہو جاتی ہے۔ جھیل پر کسی قسم کا کوئی ہوٹل وغیرہ نہیں۔

جھیل سیف الملوک برف پوش پہاڑوں میں گھری ہے۔ ان پہاڑوں کے دامن میں یہ پیالہ نما جھیل ہے۔ یہ ہے وہ جھیل جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہاں پریاں اترتی ہیں۔ ساحل عمر نے سوچا کہ اگر یہ بات مشہور ہے تو اس میں ضرور صداقت ہوگی کیونکہ پریوں کو اترنے کے لیے اس سے کم حسین جگہ نہیں چاہیے۔ اگرچہ ساحل نے پریاں نہیں دیکھی تھیں لیکن بچپن میں جو کہانیاں سنی تھیں' ان سے یہ تصور ہی ابھرتا تھا کہ پریاں بہت خوبصورت ہوتی ہیں۔ ہر خوبصورت چیز کے لیے خوبصورت جگہ ہی درکار ہوتی ہے۔

ساحل عمر نے جھیل کے کنارے کنارے دور تک چکر لگایا۔ پھر وہ برف پوش پہاڑ پر چڑھا۔ موسم بہت خوشگوار تھا۔ جھیل پر اب خاصے لوگ آ چکے تھے۔ بازغر اور ساحل عمر نے اوپر آ کر کھانا کھایا' چائے پی۔ کچھ دیر بیٹھ کر ادھر ادھر کی باتیں کیں۔ پھر وہ دونوں جھیل پر آ گئے۔

ساحل عمر جھیل کے نظاروں میں محو تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اگر اس کے پاس کاغذ اور پنسل ہوتی تو وہ مختلف منظروں کو اسکیچ کر لیتا۔ اس کے پاس تو کیمرہ بھی نہیں تھا۔ اگر کیمرہ بھی ہوتا تو وہ ان منظروں کی عکسبندی کرنے کے بعد انہیں دیکھ کر پینٹنگ بنا لیتا۔ ابھی وہ انہی سوچوں میں غلطاں تھا کہ اچانک اس نے محسوس کیا کہ بازغر اس کے آس پاس نہیں ہے۔ اس نے جلدی جلدی آس پاس نظریں دوڑائیں۔ لوگوں کے ہجوم میں اسے دیکھا لیکن وہ کہیں نظر نہ آیا۔ پھر اس کی نظر سامنے اونچائی پر پڑی۔ وہ اونچائی پر برف پر چلتا ہوا دکھائی دیا۔ پھر وہ پہاڑ کے پیچھے گم ہو گیا۔ اسے بڑی حیرت ہوئی کہ وہ پہاڑ کے پیچھے اتنی آسانی سے کیسے چلا گیا۔

ابھی وہ سوچ ہی رہا تھا کہ کیا کرے کہ اتنے میں ایک چھوٹی سی بچی نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر زور سے ہلایا اور بولی۔ ''انکل' انکل۔''

وہ پانچ سال کی پیاری سی بچی تھی۔ ساحل عمر نے سوچا کہ اس بچی نے کسی غلط فہمی میں اس کا ہاتھ پکڑ لیا ہے۔ اس نے حیرت سے اسے دیکھا۔

''انکل......انکل!'' اس نے پھر کہا۔

''جی!'' ساحل عمر اس کی طرف متوجہ ہوا۔

''آپ کو ہماری باجی بلا رہی ہیں۔''

''کہاں ہیں آپ کی باجی؟''

''وہ سامنے۔'' لڑکی نے ایک طرف اشارہ کیا۔

ساحل عمر نے نظر اٹھائی تو قریب ہی ایک فیملی موجود تھی۔ ان میں تین چار لڑکیاں آگے کھڑی تھیں۔ ان چاروں لڑکیوں میں ایک لڑکی سب سے آگے تھی۔ وہ حیرت زدہ ہو کر اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ ساحل عمر اس لڑکی کو یا ان لڑکیوں میں سے کسی کو نہیں جانتا تھا۔ بچی ہاتھ پکڑ کر اسے آگے کی طرف کھینچنے لگی تو وہ اس کے ساتھ چلا۔

کچھ یہ آگے بڑھا' کچھ وہ لڑکیاں اس کی طرف بڑھیں۔ قریب ہونے پر وہ لڑکی بولی۔ ''معاف کیجئے گا......میں یہ پوچھنا چاہ رہی تھی کہ کیا آپ ساحل عمر ہیں؟''

''جی! میں ساحل عمر ہوں لیکن آپ نے مجھے کیسے پہچان لیا۔'' ساحل عمر حیرت زدہ ہو کر بولا۔

''ایک رسالے میں پینٹنگ کے ساتھ آپ کی تصویر چھپی تھی۔ اس تصویر سے آپ کو پہچانا۔ میں نے اپنی بہنوں کو بتایا تو یہ لوگ شک و شبہ میں پڑ گئیں۔ انہیں یقین نہیں آیا لیکن مجھے یقین تھا کہ آپ ضرور ساحل عمر ہیں۔ اس لیے میں نے گڑیا کو آپ کے پاس بھیجا۔ آئیے میں آپ کو اپنے ڈیڈی

اور بڑے بھائی سے ملاؤں۔'' یہ کہہ کر اس نے پیچھے دیکھا۔
ساحل عمر نے دس بارہ قدم کے فاصلے پر دو مردوں کو کھڑے ہوئے پایا۔ وہ ادھر ہی دیکھ رہے تھے۔

''میرا نام شگفتہ ہے۔'' پھر اس نے اپنی بہنوں کے نام بتائے اور آگے بڑھی۔

''آپ کے ساتھ کون ہے؟'' شگفتہ نے آگے چلتے ہوئے سوال کیا۔

''میرے ساتھ میرے ایک دوست ہیں۔ وہ ابھی اس پہاڑ کے پیچھے گئے ہیں۔''

''کس پہاڑ کے پیچھے؟''

''وہ سامنے۔'' ساحل نے ادھر اشارہ کیا۔

''لیکن وہاں وہ کیا کرنے گئے ہیں اور وہاں تک چلے کیسے گئے۔ کسی بندے کا وہاں جانا آسان نہیں۔'' وہ لڑکی حیرت زدہ رہ گئی۔

''تو وہ بندہ ہے کب..... وہ تو جن ہے جن۔'' ساحل عمر نے ہنس کر کہا اور اس طرح بات ہنسی مذاق میں اڑ گئی۔

شگفتہ نے اپنے ڈیڈی کے نزدیک پہنچ کر ساحل عمر کا تعارف کرایا۔ شگفتہ کے ڈیڈی اور بڑے بھائی ساحل عمر سے اچھی طرح ملے۔ انہوں نے اسے اپنے ساتھ چائے پینے کی دعوت دی جو ساحل عمر نے فوراً قبول کر لی۔

شگفتہ فائن آرٹس کی طالبہ تھی۔ وہ کراچی کے ایک اسکول سے فائن آرٹس میں ڈپلومہ کر رہی تھی۔ اس کے علاوہ وہ ایک بولڈ اور بولنے والی لڑکی تھی۔ اس لیے زیادہ وہی اس سے سوال جواب کرتی رہی۔

ساحل عمر ان لوگوں کے ساتھ دری پر بیٹھ گیا اور گپ شپ میں مشغول ہو گیا۔ وہ تھوڑی تھوڑی دیر بعد اپنے دائیں بائیں اور سامنے نظریں اٹھا کر دیکھ لیتا تھا لیکن بازغر کا کہیں پتہ نہ تھا۔ پتہ نہیں وہ کہاں چلا گیا تھا اور کہیں گیا تھا تو اسے بتا کر کیوں نہیں گیا تھا۔

خیر کوئی بات نہیں، اگر اسے اکیلے واپس جانا پڑا تو وہ اس فیملی کے ساتھ واپس چلا جائے گا پریشانی کی اب کوئی بات نہ تھی۔ یہ لوگ بھی کراچی کے تھے۔

اب شام ہونے کو تھی، بہت سے لوگ واپس جا چکے تھے، کچھ راستے میں تھے اور کچھ جھیل سے اٹھنے کی تیاری میں تھے۔ ساحل عمر اب بازغر کی طرف سے مایوس ہو چکا تھا، لہٰذا اس نے اس فیملی کے ساتھ ہی واپسی کا سفر کرنے کی ٹھان لی تھی۔

جب یہ لوگ واپس جانے کے لیے اٹھے تو وہ بھی ان کے ساتھ باتیں کرتا چل پڑا۔ ابھی ساحل عمر اوپر ان دکانوں تک ہی پہنچا تھا کہ کسی نے اس کے کندھے پر بڑی نرمی سے ہاتھ رکھ دیا۔

ساحل عمر نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو بازغر شرمندہ سا کھڑا تھا۔

''میں معافی چاہتا ہوں، مجھے دیر ہو گئی۔''

بازغر کو دیکھ کر اس کی جان میں جان آئی۔ خوامخواہ اس فیملی کا احسان لینا پڑتا۔ اس کی جیب میں ایک پیسہ نہ تھا۔ اس کی کلائی پر ایک قیمتی گھڑی ضرور تھی۔ اس گھڑی کو فروخت کرنا پڑتا یا ان لوگوں سے پیسے ادھار مانگنے پڑتے، تبھی کراچی واپسی ممکن تھی۔

''کوئی بات نہیں...... آیئے واپس چلیں۔'' ساحل عمر نے نرم لہجہ اختیار کیا۔

''ہم ابھی یہاں رکیں گے۔'' بازغر نے یہ بات اتنی زور سے کہی کہ وہ لوگ بھی سن لیں۔

''اچھا' ٹھیک ہے۔ ساحل صاحب آپ رکیں' ہم چلتے ہیں۔ اب آپ سے ناران میں ملاقات ہوگی۔ آپ ہمارے ہوٹل آجایئے گا۔ دیکھئے آیئے گا ضرور۔'' شگفتہ نے اپنے ہوٹل کا نام اور کمرہ نمبر بتایا۔

''جی ٹھیک ہے...... میں ضرور آؤں گا۔'' ساحل عمر نے ایسے ہی وعدہ کر لیا۔

اس فیملی کے آگے بڑھ جانے کے بعد اس نے بازغر کو آڑے ہاتھوں لیا۔

''صاحب' آپ بغیر بتائے کہاں غائب ہو گئے تھے؟''

''میں اس سلسلے میں آپ سے معذرت کر چکا ہوں۔'' بازغر نے دوٹوک انداز میں کہا۔ ''میں سمجھتا ہوں کہ آپ نے مجھے معاف کر دیا ہوگا۔ آیئے اب میرے ساتھ جھیل پر چلیے۔''

''اب جھیل پر کیا ہے؟ اندھیرا ہونے والا ہے۔ سب لوگ واپس جا رہے ہیں۔ اب ہم وہاں کیا کریں گے؟''

''ساحل عمر صاحب! اصل نظارہ تو اب شروع ہوگا۔ آج چودھویں رات ہے اور چودھویں کی بھی ایک خاص رات ہے۔ چاند اس قدر روشن ہوگا کہ آپ چاندنی میں جھیل کو دیکھ کر پتھر کے ہو جائیں گے۔''

''کیا مطلب ہے۔ آپ رات یہاں گزارنا چاہتے ہیں؟'' ساحل عمر نے حیران ہو کر سوال کیا۔

''اسی لیے تو میں آپ کو یہاں لایا ہوں...... اس رات کا بڑی بے قراری سے انتظار تھا۔''

''آپ کا کیا خیال ہے کہ یہ رات ہم کسی پتھر پر بیٹھ کر ٹھٹھرتے ہوئے گزاریں گے۔'' ساحل عمر نے پوچھا۔

''ارے نہیں جناب...... یہ آپ کا خادم آپ کے ساتھ ہے۔ آپ کو ذرا بھی تکلیف پہنچ جائے تو میرے سر پر سات جوتے ماریئے گا۔''

چاندنی رات میں جھیل سیف الملوک کا نظارہ...... ساحل عمر کا اندر کا آرٹسٹ ایک دم مچل اٹھا۔ یہ ایک نیا تجربہ ہوگا۔ یہ نظارہ بہت کم لوگوں نے کیا ہوگا۔ چلو ایک رات یہاں ٹھہر کر دیکھتے ہیں۔ جو ہوگا دیکھا جائے گا۔

جب وہ جھیل پر واپس پہنچے تو وہاں سے سب لوگ جا چکے تھے۔ ایک شخص بھی وہاں موجود نہ تھا۔ البتہ جھیل کے دوسرے کنارے پر ایک چھوٹا سا سرخ خیمہ ضرور نظر آ رہا تھا۔ ساحل عمر نے اس

طرف اشارہ کر کے پوچھا۔ ''اس خیمے میں کون ہے؟''

چند لمحوں تک جب کوئی جواب نہ آیا تو اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ اس نے فوراً اپنے دائیں بائیں پھر پیچھے دیکھا۔ بازغر کا کہیں پتہ نہ تھا۔

ساحل عمر کے ہوش اڑ گئے۔ اب واپسی کا وقت نہیں رہا تھا۔ ساری جیپیں واپس جا چکی ہوں گی۔ سامنے ایک خیمہ تھا اور وہ تھا۔

ابھی تھوڑا سا اجالا باقی تھا۔ وہ دھڑکتے دل کے ساتھ اس خیمے کی طرف بڑھنے لگا۔

☆......☆......☆

بازغر کے اچانک اس طرح غائب ہو جانے پر ساحل عمر کو شدید غصہ تھا۔ دوپہر کو بھی اس نے یہی کیا تھا۔ ساحل عمر کسی نظارے میں محو ہوا تو بازغر اس کے برابر سے غائب ہو گیا۔ خیر وہ تو دن کا وقت تھا۔ کسی نہ کسی طرح وہ یہاں سے واپس چلا جاتا لیکن اس وقت تو اس کی کیفیت ایسی تھی جیسے اس کے ہاتھ پاؤں باندھ کر کسی اندھے کنویں میں پھینک دیا گیا ہو۔ واپسی کے تمام راستے بند ہو چکے تھے۔ اسے ہر قیمت پر رات گزارنی تھی۔ اب وہ رات کیسے گزرے گی' اس کے بارے میں اسے کوئی اندازہ نہیں تھا۔

اب وہ اس خیمے کے نزدیک پہنچ چکا تھا۔ یہ سرخ رنگ کا خیمہ چھوٹا سا تھا۔ اتنا چھوٹا کہ اس میں ایک دو آدمیوں سے زائد کی گنجائش نہ نکلتی۔ خیمے کے دروازے پر پردہ پڑا ہوا تھا۔ وہ خیمے کے نزدیک پہنچ کر رک گیا۔ ایک مرتبہ اس نے چاروں طرف نگاہ دوڑا کر بازغر کو تلاش کیا۔ بازغر کا دور تک پتہ نہ تھا۔ اندھیرا تیزی سے پھیل رہا تھا۔ دور پہاڑوں کی برف پوش چوٹیوں پر سنہری دھوپ سنولاتی جا رہی تھی۔

اس نے اندھیرا بڑھتے دیکھ کر گھبرا کر سوچا۔ کیا کرے؟ پردہ اٹھا کر خیمے میں جھانکے یا آواز دے کر معلوم کرے کہ خیمے میں کون ہے؟ اس نے آواز دینا ہی مناسب سمجھا۔

"اندر کوئی ہے کیا؟" ساحل عمر نے جھک کر آواز لگائی۔ پھر چند لمحے انتظار کیا۔ کوئی جواب نہ آیا تو پھر آواز لگائی۔ "اندر کون ہے؟"

اندر سے پھر کوئی جواب نہ آیا۔ اسے خیمے پر سناٹا طاری نظر آیا۔ خیمے میں شاید کوئی نہیں تھا۔

اب اس نے آگے بڑھ کر پردہ ہٹا کر اندر جھانکنے کا فیصلہ کیا۔ اس نے سامنے پردے کو ہاتھ لگایا تو وہ نہیں کھلا۔ دونوں پردوں کو بڑے بڑے سوراخوں میں سفید رسی پرو کر بند کیا گیا تھا۔ اس رسی کو اندر کی طرف سے بھی کھولا جا سکتا تھا اور باہر کی طرف سے بھی۔

ساحل عمر نے اکڑوں بیٹھ کر پردے کی رسی کھولی۔ پھر رسی ڈھیلی کر کے پردے کو نیچے سے تھوڑا سا اوپر اٹھایا۔ اندر جھانک کر دیکھا۔ اندر کوئی نہ تھا۔ اس نے خیمے کے اندر گھسنے کا فیصلہ کر لیا۔

اندر جانے سے پہلے اس نے کھڑے ہو کر ایک مرتبہ پھر چاروں طرف نظریں گھمائیں لیکن اسے کہیں بازغر نظر آیا نہ اس خیمے کا مالک۔ اس نے برف پر بیٹھ کر اپنے جوتے اتارے اور ہاتھوں کے بل گردن جھکا کر اندر داخل ہو گیا۔ اندر بیٹھ کر اس نے اپنے جوتے اٹھائے اور اندر ایک کونے میں رکھ

دیئے۔

پھر اس نے خیمے کا جائزہ لیا۔ اس خیمے میں ضرورت کی ہر چیز موجود تھی۔ آرام دہ بستر، زبردست اونی کمبل، پہننے کے لیے گرم کپڑے، کھانا، چائے، ایمرجنسی لائٹ، کیا چیز ایسی تھی جو وہاں نہیں تھی۔

اس خیمے میں بڑے آرام سے رات گزاری جاسکتی تھی۔ بشرطیکہ خیمے والے نے اسے آکر باہر نہ نکال پھینکا۔

آج کا پورا دن ساحل عمر نے جھیل پر گھومتے پھرتے گزارا تھا۔ اس پر تھکن طاری ہو رہی تھی۔ ایسا پرآسائش خیمہ دیکھ کر مزید دل مچل گیا تھا۔

اس نے ایمرجنسی لائٹ جلا کر ہاٹ پاٹ پر رکھی اور اس کے برابر رکھا ہوا تھرماس اٹھالیا۔ اس کا ڈھکن کھول کر جھانکا تو اس میں سے بھاپ اڑتی نظر آئی۔ وہ پورا تھرماس نفیس چائے سے بھرا ہوا تھا۔ ایک کپ میں چائے بھر کر اس نے تھرماس بند کر دیا اور کمبل اپنے جسم پر ڈال کر نیم دراز ہو کر چائے پینے لگا۔ چائے کا پہلا گھونٹ لیا تو ایک لطیف ذائقہ حلق سے اترتا چلا گیا۔ وہ بہت مزیدار چائے تھی۔

چائے پی کر وہ تکیہ سر کے نیچے کھسکا کر کچھ دیر آرام کی غرض سے لیٹ گیا۔ اس نے کمبل اپنے سینے تک ڈال لیا۔ سردی آہستہ آہستہ بڑھ رہی تھی۔ جسم کو تھوڑا آرام ملا تو اس کی آنکھیں بند ہونے لگیں۔ پھر وہ یہ سوچتا سوچتا نیند کی آغوش میں چلا گیا کہ جانے کب خیمے والا آجائے اور اسے خیمے سے باہر کر دے۔

دو گھنٹے کے بعد اس کی آنکھ کھلی۔ اس نے گھبرا کر چاروں طرف دیکھا کہ وہ کہاں لیٹا ہے۔ وہ ابھی خیمے میں ہی تھا اور خیمے کی ہر چیز اپنی جگہ جوں کی توں موجود تھی۔ کلائی گھڑی دیکھنے سے اندازہ ہوا کہ وہ دو گھنٹے نہایت اطمینان سے سویا ہے۔ اٹھا تو بھوک کا شدت سے احساس ہوا۔

اس نے ایمرجنسی لائٹ بستر پر رکھی اور ہاٹ پاٹ کھول کر اس نے کھانا پلیٹ میں نکال لیا۔ بڑے مزے سے اس نے روسٹ مرغی تنوری نان سے کھائی۔ اس کھانے کا ذائقہ بھی بالکل مختلف اور بہترین تھا۔ پانی کے بھرے ہوئے کین سے پانی گلاس میں نکال کر خوب سیر ہو کر پیا۔ یہ پانی نہایت شفاف اور لطیف تھا۔

جانے یہ کس کا خیمہ تھا۔ جانے کون اتنے اہتمام سے یہاں رات گزارنے آیا تھا۔ جانے وہ خیمہ چھوڑ کر کیوں چلا گیا تھا۔ ساحل عمر نے بڑے اطمینان سے اس خیمے پر قبضہ کرلیا تھا اور اپنے اباجی کا مال سمجھ کر یہاں رہنے اور کھانے پینے میں مشغول تھا۔ اندر سے اس کا دل ملامت کر رہا تھا لیکن وہ یہاں رہنے اور یہاں موجود چیزوں کو استعمال کرنے پر مجبور تھا۔

پھر اس نے باہر نکلنے کا ارادہ کیا۔ اس نے اونی اوور کوٹ پہنا۔ بالوں والی گول اور اونچی ٹوپی سر پر رکھی۔ دستانے اور موزے چڑھائے۔ اپنے چپل پہننے لگا تو ایک طرف جوتے رکھے ہوئے نظر آئے۔ اس نے وہ بوٹ پہن لیے اور ایمرجنسی لائٹ لے کر خیمے سے باہر آگیا۔

باہر گہرا سناٹا طاری تھا۔ اتنا گہرا سناٹا کہ اگر کوئی سوئی زمین پر پھینکی جائے تو شاید اس کی آہٹ بھی سنائی دے جائے۔ ساحل عمر ایک پر شور شہر کا باسی تھا۔ اتنا گہرا سناٹا اس نے کاہے کو دیکھا تھا۔ یہ سناٹا اس کی روح میں اترا جاتا تھا۔

چاند نکل آیا تھا لیکن وہ ابھی پہاڑوں کے پیچھے تھا۔ چاندنی برف پوش پہاڑوں پر برس رہی تھی۔ یہ برف پوش چوٹیاں برف کا لبادہ اوڑھے چاند کی روشنی میں چمک رہی تھیں۔ یہ ایک سحر انگیز نظارہ تھا۔ ساحل عمران چمکتی چوٹیوں کو مبہوت ہو کر دیکھنے لگا۔ یہ ایک نادر حسن تھا' ایسا حسن دیکھنے کو کہاں ملتا ہے۔

وہ پھر جھیل کے اطراف ٹہلنے لگا۔ اسے بازغر کا انتظار تھا۔ اس کی تلاش میں نظریں ادھر ادھر بھٹک کر واپس آجاتی تھیں۔

آسمان روشن تھا۔ بالکل صاف تھا۔ چاند دھیرے دھیرے اوپر اٹھتا جا رہا تھا۔ ساحل عمر کا جہاں خیمہ تھا' وہاں ابھی اندھیرا تھا۔ وہ جگہ پہاڑ کے سائے میں تھی۔ پھر اچانک ہی چاند پہاڑ کی اوٹ سے نکل آیا۔ جھیل سیف الملوک ایک دم روشن ہو گئی۔ اس پیالہ نما جھیل میں چاند کا عکس نظر آنے لگا۔ چاروں طرف دودھیا چاندنی پھیل گئی۔ برف سے ڈھکے پہاڑوں پر چاندنی کچھ اس طرح منعکس ہو رہی تھی کہ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے اچانک چاندنی کا سیلاب آ گیا ہو۔

آج چاند کچھ ضرورت سے زیادہ روشن تھا۔ بازغر نے صحیح کہا تھا۔ یہ چودھویں کے چاند کی کوئی خاص رات تھی۔ چاندنی رات میں نہائی جھیل سیف الملوک دن کی روشنی کے مقابلے میں کہیں حسین نظر آ رہی تھی۔ یہ ایک ایسا نظارہ تھا جس کے لیے پتھر کا ہوا جا سکتا تھا۔

ساحل عمر چاندنی رات میں نہائی جھیل سیف الملوک کو دیکھ کر وجد میں آ گیا۔ اسے بے اختیار اللہ یاد آیا اور خدائی مسکرا اٹھی۔ دیکھا میرا جمال' میں یہاں ہوں' میں کہاں نہیں ہوں۔

پھر ایک گونج سی پیدا ہوئی جیسے پوری فضا گنگنا اٹھی ہو۔ جیسے یہاں کی ہر شے پکار اٹھی ہو۔ "اللہ ہو' اللہ ہو۔"

اور یہ وہ لمحہ تھا جب ساحل عمر نے سوچا کہ وہ کھڑے کھڑے پتھر کا ہو جائے۔ بس اسے دیکھنے والی آنکھ مل جائے اور یہ نظارہ ہمیشہ کے لیے اس کی آنکھوں میں منجمد ہو جائے۔ وہ اس نظارے کو دیکھ کر کبھی نہ تھکے۔ تب اسے بازغر یاد آیا' وہ اسے بہت اچھا لگا۔ اس نے اسے فوراً معاف کر دیا۔ یہ بازغر ہی تو تھا جس کی بدولت وہ جھیل کے اس حسن سے روشناس ہوا تھا۔

ساحل عمر نے گھڑی دیکھی۔ گھڑی میں اس وقت رات کا ایک بجا تھا۔ چاند اپنے پورے شباب پر تھا۔ گہرا سناٹا' سخت سردی' برستی ہوئی چاندنی' گنگناتی فضا۔ وہ اس نظارے کو اپنی آنکھوں میں بھر لینا چاہتا تھا۔ اپنی روح میں اتار لینا چاہتا تھا۔ وہ اپنے آپ کو بھول جانا چاہتا تھا۔ اس وادی میں کھو جانا چاہتا تھا۔

تب اچانک اسے ہنسی کی آواز سنائی دی۔ وہ چونکا۔ ارے یہاں کون ہے۔ اس کے علاوہ بھی یہاں کوئی ہے۔ وہ ایک ہنسی کی آواز نہ تھی۔ وہ کئی ہنسیوں کی آواز تھی۔ ارے یہاں کون ہنس رہا

ہے۔ شاید یہ وادی ہنس رہی ہے۔ کائنات گنگنا رہی ہے۔

پھر اس نے سامنے نگاہ کی تو پہاڑ کے پیچھے سے ان چنے والیوں کو آتے دیکھا۔ وہ بڑی تیزی سے لہراتی ہوئی چلی آرہی تھیں۔ چھن چھن گھنگھرو بج رہے تھے۔ نقرئی ہنسی کے فوارے چھوٹ رہے تھے۔

ساحل عمر جلدی سے خیمے کی اوٹ میں چلا گیا۔ پھر جب اس نے دیکھا کہ وہ اسی طرف آرہی ہیں تو وہ جلدی سے خیمے میں گھس گیا اور پردے کی اوٹ سے باہر جھانکنے لگا۔

آٹھ سبز لبادے میں تھیں اور ان میں سے ایک جوان کے درمیان تھی' وہ سفید ریشمی لبادے میں تھی۔ اس کے سر پر رومال بندھا ہوا تھا۔ باقی آٹھوں ننگے سر تھیں اور ان کے سنہری بال کھلے ہوئے تھے۔

وہ ابھی ذرا دور تھیں' اس لیے ان کے چہرے واضح نہ تھے۔ پھر جب وہ قریب آگئیں تو ساحل عمر نے دیکھا کہ وہ آٹھوں کی آٹھوں اپنے حسن میں یکتا ہیں اور وہ نویں جوان کے درمیان سبز پتوں میں کھلے کسی سفید پھول کی طرح تھی' اس کے حسن کی کوئی مثال نہ تھی۔ وہ بے نظیر تھی۔ اپنے حسن کی مثال آپ تھی۔

اور یہ وہ تھی جس نے اس کے خوابوں میں آکر ہلچل مچا دی تھی۔

وہ رشا ملوک تھی۔

جس کے اس نے خواب دیکھے تھے۔ پھر اس نے رشا ملوک کو اپنے خوابوں سے چرا لیا تھا۔ اس نے اسے کاغذ پر اتار دیا تھا۔ ایک ایسی حسین پینٹنگ بنائی تھی کہ جو دیکھتا تھا' دیکھتا رہ جاتا تھا۔

آج وہی پینٹنگ اس کے سامنے زندگی کا لبادہ اوڑھے پوری آب و تاب سے چمک رہی تھی۔ وہ بہت خوبصورت تھی۔ اتنی خوبصورت کہ آدمی پلکیں جھپکانا بھول جائے۔ وہ اس کے تصور سے بھی کہیں حسین تھی۔

اس کا بے اختیار جی چاہا کہ وہ خیمے سے باہر نکل کر اس کے سامنے آجائے اور کہے۔ "دیکھو میں ہوں ساحل عمر۔ جس کے خوابوں میں آکر تم نے قیامت مچا دی تھی۔ کیا تم مجھے پہچانتی ہو؟"

لیکن اس نے ایسا نہ کیا۔ اپنے دل کو سنبھال لیا۔ باہر جانے سے رک گیا۔ ہو سکتا ہے وہ اسے پہچانتی نہ ہو۔ کیا ضروری ہے کہ وہ اگر اس کے خوابوں میں آتی تھی تو وہ بھی اس کے خوابوں میں آتا ہوگا۔ اگر اس نے پہچاننے سے انکار کر دیا تو پھر کیا ہوگا۔ اگر اس کے پاس رشا ملوک کی پینٹنگ ہوتی تو پھر کچھ بات بن سکتی تھی۔ وہ ثبوت کے طور پر اس پینٹنگ کو پیش کر سکتا تھا۔

ابھی وہ انہی سوچوں میں غلطاں تھا کہ باہر ہلچل مچی۔ وہ آٹھوں حسینائیں چھن چھن کرتی رشا ملوک سے دور ہوئیں۔ وہ چاروں طرف پھیل گئیں۔ انہوں نے اپنے نازک ہاتھوں کے پیالے بنا کر منہ پر رکھے اور مترنم آواز میں اعلان کرنے لگیں۔

"یہاں کون ہے......؟ اگر یہاں کوئی ہے تو اسے چاہیے کہ وہ اپنی آنکھوں پر ہاتھ رکھ لے۔ رشا ملوک کو ہم نہلائیں گے۔ اگر کسی نے دیکھنے کی کوشش کی تو اس کی آنکھیں جاتی رہیں گی۔"

آٹھوں باندیاں یہ اعلان بار بار کر رہی تھیں اور اس اعلان کی گونج پہاڑوں تک سنائی دے رہی تھی۔ ساحل عمر کا دل بہت مچلا کہ وہ اپنی آنکھیں کھلی رکھے اور وہ جلوہ دیکھے جس کی تاب نہ لا کر اس کی آنکھیں بے نور ہو جائیں۔ پھر اس نے سوچا کہ اگر واقعی اس کی آنکھیں بے نور ہو گئیں تو وہ کیا کرے گا۔ آنکھیں ہیں تو جہان ہے' یہ نظارے ہیں۔ اسے کسی قسم کی حماقت نہیں کرنا چاہیے۔

وہ نہ چاہتے ہوئے بھی اپنے دل پر جبر کر کے خیمے کے پردے کے پاس سے ہٹ گیا۔ وہ بستر پر سیدھا لیٹ کر خیمے کی چھت کو گھورنے لگا۔

خیمے کے باہر سے نقرئی قہقہوں کی آوازیں آتی رہیں اور وہ خیمے کی چھت کو گھورتا رہا۔

یہ ایک خاص رات تھی۔ چودھویں کا چاند یوں تو ہر ماہ ہی طلوع ہوتا تھا لیکن یہ رات سال میں ایک مرتبہ آتی تھی۔ اس رات رشا ملوک اپنی ہمجولیوں اور باندیوں کے ساتھ جھیل پر نہانے کے لیے آتی تھی۔ یہ خاص غسل اس کے حسن میں مزید چار چاند لگا دیتا تھا۔

اس رات رشا ملوک کے حسن بے مثال کو بے نقاب چاند نے دیکھا' ستاروں نے دیکھا' پہاڑوں نے دیکھا' جھیل کے پانی نے اسے اپنی آغوش میں لیا۔ محروم رہا تو صرف ساحل عمر۔

دو باندیوں نے رشا ملوک کو ہاتھ پکڑ کر جھیل میں اتارا۔ جھیل میں اتر کر انہوں نے رشا ملوک کو لباس سے آزاد کیا اور اسے مل مل کر نہلانے لگیں۔ پھر وہ اسے جھیل کے اندر اتنی دور تک لے گئیں کہ وہ سر تک ڈوب گئیں۔ پھر چند لمحوں بعد وہ اچانک جھیل سے ابھری تو پوری جھیل اس کے بدن کی روشنی سے منور ہو گئی۔

اس کے بدن کی چاندنی کے آگے چاند کی روشنی بھی جیسے ماند پڑ گئی تھی۔

جھیل سے نکلتے ہی اسے لباس پہنا دیا گیا اور پھر اعلان ہوا۔

"اب کوئی چاہے دیکھے یا سوئے' اس کی مرضی......ہم تو چلے۔"

یہ اعلان دیر تک گونجتا رہا۔ ساحل عمر بڑی بے تابی سے خیمے کے دروازے پر آیا۔ اس نے باہر جھانک کر دیکھا' اب وہاں کچھ نہ تھا۔ نہ رشا ملوک تھی' نہ اس کی ہمجولیاں۔ وہ ایک دم ہی فضا میں تحلیل ہو گئی تھیں۔

ساحل عمر تڑپ کر خیمے سے باہر نکل آیا۔ اس نے چاروں طرف آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا مگر بے سود۔ اب وہاں دور تک کوئی نہ تھا۔ وہی سناٹا تھا' وہی چاند تھا اور نکھری ہوئی چاندنی تھی۔ وہی سحر انگیز فضا تھی۔

ساحل عمر کو جیسے شبہ ہوا کہ کہیں وہ کوئی خواب تو نہیں دیکھ رہا۔

اس نے دستانہ اتار کر اپنے گال پر چٹکی بھری۔ فوراً ہی اس کے منہ سے کراہ نکل گئی۔ یہ خواب نہ تھا اس نے جو دیکھا تھا' وہ کھلی آنکھوں سے دیکھا تھا۔

وہ کچھ دیر جھیل پر ٹہلتا رہا۔ بار بار پلٹ کر ادھر دیکھ لیتا تھا جدھر سے رشا ملوک ہنستی مسکراتی آئی تھی۔ جس طرح روز روز عید نہیں ہوتی' ویسے ہی روز روز محبوب کی دید نہیں ہوتی۔ رشا ملوک کو جھیل سے گئے ہوئے تو ابھی آدھا گھنٹہ بھی نہ ہوا تھا۔

پھر وہ پوری رات اس نے جاگ کر اور ٹہل کر گزار دی۔

ایسی حسین جگہ، فضا خوابناک ہو اور محبوب کی دید کا امکان ہو تو پھر کس کافر کو نیند آتی ہے۔ وہ چار ساڑھے چار بجے تک جھیل کے کنارے ٹہلتا رہا۔

جب چاندنی بے نور ہونے لگی۔ منظر دھندلانے لگا اور اس کی آنکھوں میں نیند اترنے لگی تو وہ خیمے میں چلا گیا۔ خیمے کی ڈوریاں کس کر وہ بستر پر دراز ہو گیا۔ ایسی سردی میں ایسا نرم گرم بستر...... وہ کمبل اوڑھ کر جب اس نے آسودگی سے پاؤں پھیلائے تو اس کی آنکھوں میں خمار بھرنے لگا۔ پھر اسے نیند کی آغوش میں جاتے ہوئے چند منٹ سے زیادہ نہ لگے۔

جب ساحل عمر گہری نیند میں ڈوب گیا تو خیمے کے باہر آہٹ ہوئی۔ قدموں کی چاپ خیمے کے دروازے پر آ کر رک گئی۔ آنے والے نے پردے کے درمیان سے اندر جھانک کر دیکھا۔ اندر ایمرجنسی لائٹ روشن تھی اور ساحل عمر منہ پر کمبل ڈالے پرسکون انداز میں سو رہا تھا۔

آنے والے نے خیمے کے پردے کی رسیاں کھول ڈالیں اور پردے کے پٹ خیمے کے اوپر دائیں بائیں ڈال دیئے۔ پھر وہ کسی بندر کی طرح چاروں ہاتھ پاؤں پر چلتا ہوا، بڑی احتیاط کے ساتھ خیمے میں داخل ہوا۔ اس نے آہستہ آہستہ ساحل عمر کے چہرے سے کمبل کھینچا۔ جب کمبل ساحل عمر کی ناک تک ہٹ گیا تو آنے والے نے اپنی جیب سے ایک پتھر کا ٹکڑا نکالا اور اس کی ناک پر رکھ دیا۔ چند لمحے اس نے اس پتھر کو اس کی ناک پر رکھا رہنے دیا۔ پھر تین بار اس نے اس پتھر کو اس کی ناک پر رگڑا اور اطمینان بھرا سانس لے کر اس نے اس پتھر کو دوبارہ جیب میں ڈال لیا اور کمبل سے اس کا منہ ڈھک دیا۔

پھر آنے والا خیمہ سے باہر نکل آیا۔ باہر نکل کر اس نے اپنے دونوں ہاتھوں کا بھونپو بنا کر ایک عجیب سی آواز نکالی۔ یہ آواز کسی چیخ سے مشابہ تھی۔

اس چیخ کے نمودار ہوتے ہی پتھر کی ایک گاڑی پہاڑ کی اوٹ سے برآمد ہوئی اور بہت تیز رفتاری سے چلتی خیمے کے پاس آ کر ٹھہر گئی۔ یہ ایک کھلی گاڑی تھی۔ اس میں دو پہیے لگے ہوئے تھے اور آگے تہکال اس میں جتا ہوا تھا۔ گاڑی بان کوئی نہ تھا، تہکال خود ہی اس کو چلاتا ہوا لایا تھا۔

اس گاڑی کے پیچھے البتہ چار بندے ساتھ ساتھ بھاگتے ہوئے آئے تھے۔

''دانا! کیا حکم ہے؟'' وہ چاروں ہاتھ باندھ کر غلاموں کی طرح اس شخص کے سامنے کھڑے ہو گئے جس نے چیخ مار کر انہیں طلب کیا تھا۔ وہ بازغر تھا۔

''خیمہ اکھاڑو۔'' بازغر نے چاروں کو حکم دیا۔

چند لمحوں میں ان چاروں نے خیمے کے چاروں کھونٹے اکھاڑ لیے اور خیمہ اس آہستگی سے ساحل عمر کے اوپر سے اتارا کہ ذرا سا بھی شور نہ ہوا۔

''دانا کو احتیاط سے اٹھا کر مع بستر گاڑی پر رکھ دو۔'' بازغر نے دوسرا حکم دیا۔

ان چاروں غلاموں نے ساحل عمر کو مع بستر اٹھا کر گاڑی پر رکھ دیا۔ بازغر نے ساحل عمر کو کمبل اچھی طرح اڑھا دیا اور پھر ایک ریشمی ڈوری سے ساحل عمر کو اس طرح باندھ دیا کہ وہ گاڑی سے

پھسل کر نیچے نہ گرے۔ اس کے بعد بازغر نے جھکال کے سر پر ہاتھ رکھا اور بولا۔ "جھکال بہت احتیاط سے۔ دیکھ دانا کو کوئی تکلیف نہ ہو۔" یہ کہہ کر اس نے منہ سے "گخ" کی آواز نکالی اور بڑی تیزی سے پیچھے ہٹ گیا۔

جھکال ساحل عمر کو بڑی برق رفتاری سے لے چلا۔ چند لمحوں میں وہ پہاڑ کی اوٹ میں چلا گیا۔

"تم لوگ خیمہ اور اس کا سامان سمیٹ کر پہنچو، میں چلتا ہوں۔" بازغر ان سے مخاطب ہوا۔

"اچھا دانا۔" اس میں سے ایک غلام نے مودبانہ کہا۔

بازغر نے اپنے دونوں ہاتھ فضا میں لہرائے۔ پھر وہاں کچھ نہ رہا۔

جب ساحل عمر کی آنکھ کھلی۔ پہلے تو اس کی سمجھ میں ہی نہ آیا کہ وہ کہاں ہے۔ وہ جھیل سیف الملوک کے نزدیک نصب ایک پر آسائش خیمے میں سویا تھا۔ اب نہ وہ خیمہ تھا، نہ وہ مقام تھا۔ البتہ بستر وہی تھا۔ وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھا، وہ کہاں آ گیا۔

یہ ایک چھوٹا سا کمرہ تھا۔ اس کمرے کی دیواریں پتھروں کی تھیں۔ کمرہ گول تھا۔ زمین پر سفید بالوں کا قالین بچھا ہوا تھا۔ اس قالین کے اوپر ساحل عمر کا بستر تھا اور یہ بستر کمرے کے عین درمیان میں تھا۔ گنبد نما چھت تھی اور یہ چھت اطراف سے کھلی ہوئی تھی جس سے روشنی اندر آ رہی تھی۔ سامنے ایک دروازہ تھا جو بند تھا۔

پھر ساحل عمر نے اپنی پشت کی طرف گھوم کر دیکھا تو حیران رہ گیا۔ سامنے دیوار پر ایک قد آدم تصویر بنی ہوئی تھی۔ یہ تصویر ساحل عمر کی تھی۔ صورت تو ساحل عمر کی تھی لیکن لباس ساحل عمر کا نہ تھا۔ وہ ایک بند گلے کا کوٹ پہنے ہوئے تھا۔ سر پر آسمانی رنگ کا صافہ تھا۔ کوٹ کے کالر پر دو ہیرے لگے ہوئے تھے جو جگمگا رہے تھے۔ گلے میں ایک کالی ڈوری میں بندھی انگوٹھی پڑی تھی۔ یہ چاندی کی انگوٹھی تھی اور اس میں سبز رنگ کا گول پتھر لگا ہوا تھا۔ کوٹ کا رنگ سرمئی تھا۔

ساحل عمر بستر کو چھوڑ کر اپنی اس تصویر کے پاس آ کھڑا ہوا۔ اس نے پہلے تو چیک کیا کہ یہ تصویر کس چیز سے بنائی گئی ہے۔ یہ تصویر چھوٹے چھوٹے رنگین پتھروں سے بنائی گئی تھی اور اتنی نفاست سے بنائی گئی تھی کہ دور سے دیکھنے پر پینٹنگ نظر آتی تھی۔ اس تصویر کو بہت محنت اور بڑی مہارت سے بنایا گیا تھا۔ یہ ایک جیتی جاگتی تصویر تھی۔ ساحل عمر اپنی اس تصویر کو دیکھ کر ششدر رہ گیا۔

اگر اس تصویر کا خالق اس کے سامنے ہوتا تو وہ بے اختیار اس کے ہاتھ چوم لیتا۔

تبھی دروازہ کھلا اور وہ ہستی پوری شان سے چلتی ہوئی اندر آئی جس نے اس تصویر کو تخلیق کیا تھا۔ ساحل عمر اپنی تصویر کو دیکھنے میں اس قدر محو تھا کہ اسے یہ بھی پتہ نہ چلا کہ کوئی خاموشی سے اس کے پیچھے آ کھڑا ہوا ہے۔

ایک دلفریب خوشبو نے اچانک اسے اپنی گرفت میں لے لیا۔ اس سے پہلے کہ وہ پیچھے مڑ کر دیکھتا عقب سے آواز آئی۔ "کیا دیکھتے ہیں؟"

یہ ایک مانوس آواز تھی۔

ساحل عمر بڑی بے قراری سے پلٹا۔ وہ کیا پلٹا جیسے اس کی دنیا ہی پلٹ گئی۔ جیسے اس کی تقدیر بدل گئی۔ اسے اپنے خوابوں کی تعبیر مل گئی۔ گویا اسے وہ مل گیا جو سب کو کہاں ملتا ہے۔ محبوب تو نصیبوں والے کو ملتا ہے۔ وہ نصیبوں والا تھا۔

اس کے سامنے رشا ملوک کھڑی تھی، شرمیلے چہرے اور نیچی نگاہوں کے ساتھ۔

''کون ہیں آپ؟'' ساحل عمر کے ہونٹوں پر شریر مسکراہٹ تھی۔ وہ اسے پہچان کر بھی نہ پہچانا۔

''کون ہوں میں......؟'' رشا ملوک نے اپنی جھیل جیسی آنکھوں سے پلکوں کا شامیانہ ہٹایا اور اسے گہری نگاہوں سے دیکھا۔ ''میں وہ ہوں جس کے آپ خواب دیکھتے تھے۔''

''کیا یہ خواب میں نے اکیلے دیکھے تھے؟'' ساحل عمر نے مڑ کر اپنی تصویر کو دیکھا اور رشا ملوک کے چہرے پر معنی خیز نگاہیں ڈالیں۔

''نہیں، اس جرم میں میں برابر کی شریک ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ شرم سے گلنار ہو گئی۔

''یہ میں ہوں؟'' ساحل عمر نے اپنی تصویر کی طرف اشارہ کیا۔ اس کی نگاہوں میں سوال تھا۔

''آپ کو کوئی شبہ ہے؟''

''میں اتنا اچھا تو نہیں۔'' ساحل عمر نے سادگی سے کہا۔

''تصویر کی برائی کرنا چاہتے ہیں۔'' رشا ملوک نے اس بات کو کسی اور زاویے سے پرکھا۔

''اتنی اچھی تصویر کی کون برائی کر سکتا ہے؟ یہ کس نے بنائی ہے؟''

''میں نے۔'' رشا ملوک نے شرمیلی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ''رشا ملوک نے۔''

''تم نے ......واقعی؟'' وہ بہت حیران ہوا۔

''ہاں۔ واقعی میں نے بنائی ہے۔ یہ تصویر پتھروں کے ٹکڑوں سے بنائی گئی ہے۔ اس فن کا نام طبنزہ ہے۔ اس فن کو میں نے بابا صاعق سے سیکھا۔'' رشا ملوک نے خوش ہو کر بتایا۔

''بہت عمدہ......یہ ایک شاہکار تصویر ہے اور اصل سے کہیں بہتر ہے۔'' ساحل عمر ہنس کر بولا۔

''کوئی چیز......اصل سے کبھی بہتر نہیں ہو سکتی۔'' رشا ملوک نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔

''ایک بات پوچھوں؟'' ساحل عمر نے اپنے بستر سے کمبل ہٹا کر ایک طرف رکھ دیا اور تکیے ٹھیک کر کے اس نے رشا ملوک کو بستر پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ تکیوں سے ٹیک لگا کر بڑے شاہانہ انداز میں بیٹھ گئی۔ پھر اس نے ساحل عمر سے کہا۔ ''آپ بھی بیٹھ جائیں۔''

ساحل عمر اس کے سامنے دو زانو ہو کر بستر کے ایک کنارے پر بیٹھ گیا۔

''آپ کچھ پوچھ رہے تھے؟''

''ہاں، میں یہ پوچھنا چاہ رہا تھا کہ میری تصویر تم تک کیسے پہنچی؟ میرا مطلب ہے یہ تصویر تم نے میری کس تصویر کو دیکھ کر بنائی اور وہ تصویر تم نے کہاں سے حاصل کی؟''

"میں نے یہ تصویر کسی اور تصویر کو دیکھ کر نہیں بنائی ہے۔ یہ صورت میرے خوابوں نے تراشی ہے۔"

"میں سمجھا نہیں۔" ساحل عمر نے اس کی بات کو شاعری جانا۔

"یہ بات خیر اتنی مشکل بھی نہیں۔" رشا ملوک نے اپنی بڑی بڑی آنکھوں سے اسے گھورا۔ "میں سمجھاتی ہوں۔ اصل میں بات یہ ہے کہ اس بستی میں جب کوئی لڑکی جوانی کی دہلیز پر قدم رکھتی ہے تو اس خوشی کی رات اس سے اس کی ماں کہتی ہے کہ اپنے لیے مور تلاش کرو۔ ہماری بستی میں زندگی کا ساتھی تلاش کرنے کی پوری آزادی ہے اور یہ آزادی یہاں صرف لڑکی کو ہے۔ لڑکی اپنے لیے مور کا انتخاب کرتی ہے۔ یہاں ہر چھٹے مہینے شادی کا جشن منایا جاتا ہے۔ جتنی لڑکیاں اپنے موروں کا انتخاب کر چکی ہوتی ہیں وہ اس جشن میں ان کا ہاتھ پکڑ کر آتی ہیں اور اس طرح ان کی شادی ہو جاتی ہے۔ یہاں انتخاب پر کوئی قید نہیں۔ یہ لڑکی پر منحصر ہے کہ وہ جتنی جلد چاہے اپنے مور کا انتخاب کر لے۔ یہاں انتخاب پر کوئی پابندی ہے اور نہ وقت کی کوئی قید۔ جسے چاہو اور جب چاہو منتخب کرو۔ خیر میں اپنی بستی کی اس رسم سے واقف تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ یہ رات مجھ پر بھی آئے گی جب میری ماں مجھے مور تلاش کرنے کا مشورہ دے گی۔ جوں جوں میری عمر سن بلوغت کی طرف بڑھ رہی تھی اور مشورے کی رات نزدیک آتی جا رہی تھی، توں توں میری پریشانی بڑھتی جا رہی تھی کیونکہ میرے خوابوں میں جو بسا ہوا تھا ایسا پوری بستی میں کوئی نہ تھا۔ یہ ٹھیک ہے کہ یہاں انتخاب کے سلسلے میں کوئی قید نہیں۔ پھر بھی لڑکیاں مشورے کی رات آتے ہی اپنے لیے مور تلاش کر لیتی ہیں اور پہلے ہی جشن میں شریک ہو کر شادی کر لیتی ہیں۔ یہی بات اچھی سمجھی جاتی ہے...... لیکن میری مشکل پسند طبیعت نے مجھے مشکل میں ڈال دیا۔ میں نے طے کر لیا کہ چاہے کتنا ہی وقت لگ جائے، میں اپنے لیے ایسے مور کا انتخاب کروں گی جو اپنی مثال آپ ہوگا۔ جب لگن سچی ہو تو راستے خود بخود کھلنے لگتے ہیں۔ پھر اس رات جب میں چاند پر نظریں جمائے اپنے مور کے تصور میں کھوئی تھی تو ایک شبیہہ ابھری۔ پھر وہ شبیہہ واضح ہوتی گئی۔ میں آپ کے خواب دیکھنے لگی۔ آپ کو خواب میں دیکھنے لگی۔ پھر میں نے بابا صاعق سے اپنی مشکل بیان کی۔ بابا نے ایک عمل بتایا وہ عمل کر کے سوئی تو آپ واضح طور پر میرے سامنے آ گئے۔ پھر میں نے آپ کا چہرہ بنانا شروع کیا۔ اس کے بعد آپ میرے خوابوں میں آتے گئے اور میں آپ کی صورت کو پتھروں کے ٹکڑوں میں ڈھالتی گئی۔ میں نے آپ کو اپنی پسند کا لباس پہنایا۔ بالآخر شب و روز کی محنت رنگ لے آئی اور میں آپ کی تصویر بنانے میں کامیاب ہو گئی۔"

ساحل عمر بڑی محویت سے اس کی بات سن رہا تھا۔ ساتھ ہی اس کی نظریں اس کے چہرے کے دلآویز نقوش پر جمی تھیں۔ اسے اپنے آپ پر بڑا فخر ہو رہا تھا کہ ایک حسین ترین لڑکی کا وہ آئیڈیل تھا۔ اس کے خوابوں میں بستا تھا۔ کچھ اس انداز سے کہ اس نے اس کے نقوش پتھر کی دیوار پر پتھروں میں ڈال لیے۔ میرا شوق دیکھ، میرے شوق کا حصول دیکھ۔

"پھر کیا ہوا؟" ساحل عمر نے اسے خاموشی اختیار کرتے دیکھ کر پوچھا۔

"بس پھر کیا ہونا تھا۔ روز آپ کی تصویر کو دیکھتی تھی اور سوچتی تھی۔" رشا ملوک بولی۔

"کیا سوچتی تھیں؟" اس نے پوچھا۔

"سوچتی تھی...... اور اپنے آپ سے مخاطب ہو کر سوال کرتی تھی...... دیکھ رشا ملوک تو نے سپنوں کے شہزادے کی تصویر تو بنالی۔ پر اب تو اسے پائے گی کس طرح؟ اس تصویر سے تو تیری شادی نہیں ہو سکتی۔ اسے ڈھونڈ اسے تلاش کر۔ یہ کہاں ہے...... پھر میں نے آپ کو ڈھونڈنا شروع کیا۔ میرے پاس جو بھی ذرائع تھے سب استعمال کر ڈالے لیکن یہ معلوم نہ ہو سکا کہ آپ کہاں ہیں؟ اتنا مجھے یقین تھا کہ جب آپ میرے خوابوں میں آتے ہیں تو آپ کا وجود کہیں نہ کہیں ضرور ہے۔ جب میں بہت زیادہ پریشان ہوئی تو بابا صاعق کی خدمت میں حاضری دی۔ ان سے اپنا مسئلہ بیان کیا تو انہوں نے تین راتوں کے بعد مجھے بلایا۔ یہ تین راتیں میں نے بڑی بے قراری سے گزاریں' جب میں چوتھی رات ان کی خدمت میں حاضر ہوئی تو ان کے ہونٹوں پر تبسم تھا۔ میں سمجھ گئی کہ میرا گوہر مراد مل گیا۔ پھر انہوں نے آپ کے ملنے کی خوشخبری سنائی۔ ساتھ میں کچھ پریشان کن باتیں بھی بتائیں۔ میں نے ان باتوں کو صبر و سکون کے ساتھ سنا اور انہیں اپنا فیصلہ سنایا کہ اب جو بھی ہو میں نے اسے اپنا مور چن لیا۔ میرا فیصلہ سن کر بابا صاعق خاموش ہو گئے۔ پھر مجبور ہو کر انہوں نے آپ کے حصول کے لیے کارروائی شروع کی۔ ایک طرف آپ کی حفاظت کا مسئلہ تھا تو دوسری طرف آپ کو اپنی بستی کی طرف لانا تھا۔ اس کام کو بابا صاعق نے بڑی دانائی سے کیا۔ انہوں نے آپ کے پاس بازغر کو روانہ کیا۔ اس کے بعد جو کچھ آج تک ہوا' اس سے آپ واقف ہیں۔" رشا ملوک یہ کہہ کر خاموش ہو گئی۔

"کچھ اسی طرح کا قصہ میرے ساتھ بھی ہوا...... تم تو جانتی ہو گی؟"

"ہاں' کچھ جانتی ہوں' کچھ نہیں جانتی...... آپ سنائیں۔ آپ کی زبانی سن کر دل کو سکون ملے گا۔"

"جس طرح تم نے مجھے خوابوں میں دیکھا' ویسے ہی تم میرے خوابوں میں آئیں۔ میں نے تمہیں خوابوں میں دیکھا۔ پھر میں نے سینکڑوں لڑکیوں کی تصویریں دیکھ کر ان میں سے تمہیں نکالا۔ تمہاری تصویر بناتا گیا۔ میں نے تمہیں دلہن والا لباس پہنا دیا اور تمہاری تصویر کو انوکھا بنانے کے لیے تمہاری پیشانی پر جھومر کی جگہ ایک بچھو کو بنا دیا۔" ساحل عمر نے اس کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"کتنا برا کیا آپ نے۔" وہ ناراضگی سے بولی۔

"ہاں' واقعی میں نے برا کیا...... وہ بچھو میری جان کا عذاب بن گیا۔"

"ہاں' جب بازغر آپ سے مل کر آیا تو اس نے بڑی حیرت سے بتایا کہ آپ نے میری تصویر بنالی ہے۔ پھر ساتھ ہی غصے کا اظہار کیا کہ اس نے تمہاری پیشانی پر اعور کو بٹھا دیا ہے۔ مجھے یہ جان کر بڑی خوشی ہوئی کہ یہ آگ یکطرفہ نہیں۔ اگر میں نے آپ کو اپنا مور منتخب کر لیا تو آپ نے بھی اپنے مور ہونے کی تصدیق کر دی ہے۔ البتہ اعور کا میری پیشانی پر ہونا میرے لیے بھی باعث پریشانی تھا لیکن اس میں آپ کا کوئی قصور نہ تھا۔ یہ لوگ ہیں ہی اسی قسم کے...... وہ اعور جن کا بیٹا ہے' ان کا کام ہی لوگوں کو تکلیف میں مبتلا کرنا ہے۔ وہ اس تصویر کے ذریعے مجھ پر اپنا تسلط جمانا چاہتا تھا لیکن"

ایسا نہ کر سکا۔ بالآخر اسے میری پیشانی کو چھوڑنا پڑا۔ پھر اس نے وہاں جو جو جال پھیلایا' اس سے میں اچھی طرح واقف ہوں اور ابھی خطرہ پوری طرح ٹلا نہیں ہے۔ ہمیں پوری طرح چوکنا رہنا ہے۔ وہ بھی چاہتا ہے کہ میں اسے اپنا مور منتخب کرلوں۔'' رشا ملوک نے انکشاف کیا۔

''ارے نہیں۔'' ساحل عمر بے اختیار چونک اٹھا۔ ''ایسا کیسے ہوسکتا ہے؟''

''یہ میں سچ کہہ رہی ہوں۔'' رشا ملوک نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اس کا قبیلہ ہماری بستی کے نزدیک ہی آباد ہے لیکن آپ کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ آپ اس وقت محفوظ ترین مقام پر ہیں۔''

''رشا ملوک کیا تم جانتی ہو کہ یہ لوگ میرے پیچھے کیوں لگے ہوئے ہیں؟''

''سب کی اپنی اپنی غرض ہے۔ اعور کچھ اور چاہتا ہے اور وہ جادوگرنیاں کچھ اور چاہتی ہیں۔''

''کیا یہ صحیح ہے' برکھا مجھے زندگی سے محروم کرکے اپنی ساحرانہ قوتیں بڑھانا چاہتی ہے؟''

''ہاں' یہ بات بالکل ٹھیک ہے...... وہ ایک خطرناک ساحرہ ہے۔ اسے اعور اور اس کے باپ کی پشت پناہی حاصل ہے۔'' اس نے ایک لمحہ توقف کیا اور پھر مسکرا کر بولی۔ ''اچھا چھوڑیں ان باتوں کو...... میں بھی آتے ہی کیا قصہ لے بیٹھی۔''

''نہیں' ایسی کوئی بات نہیں...... تمہاری باتوں سے میری کئی الجھنیں دور ہوگئیں۔''

''اور مجھ سے ملنا کیسا لگا؟'' رشا ملوک نے اپنی شرمگیں آنکھیں اٹھائیں۔

''یوں لگا جیسے میں نے چاند کو چھولیا ہو۔''

''آپ نے بڑی سچی اور اچھی بات کہی ...... مجھ سے ملنا' مجھے دیکھنا واقعی ایسا ہے جیسے کوئی چاند کو چھولے۔''

''اس کا کیا مطلب ہے...... میں نے کوئی اور بات کہی تھی' تم نے کوئی اور بات کہی ہے۔''

''جو آپ نے کہا' وہ بھی سچ اور جو میں نے کہا' وہ بھی سچ۔''

''کیا تمہارا تعلق چاند سے ہے؟'' ساحل عمر نے وضاحت چاہی۔

''میرا تعلق چاند سے ہو یا زمین سے...... رشا ملوک تو اب آپ کی ہوگئی۔'' اس نے ایک ادائے خاص سے کہا۔ وہ اصل بات کا جواب گول کرگئی۔

''میں اسے اپنی خوش نصیبی سمجھتا ہوں...... میری اماں گھر پر تمہارا انتظار کررہی ہیں۔ یہ کتنی عجب بات ہے کہ میں انہیں تمہاری تصویر دکھا کر تمہیں دلہن کہہ چکا ہوں۔ تم میرے خوابوں کی تعبیر ہو۔ مجھے ایسی ہی شریک زندگی کی تلاش تھی۔ تمہارا حسن بے مثال ہے۔ تم ایک انوکھی چیز ہو۔''

''اور آپ میں کیا کمی ہے۔ رشا ملوک کا مور کوئی عام سی چیز ہو ہی نہیں سکتا۔ آپ ایک خاص آدمی ہیں۔ رشا ملوک کا انتخاب۔ جسے رشا ملوک منتخب کرلے' پھر اسے منتخب کرنے کی کوئی جرات نہیں کرسکتا۔ بالآخر برکھا اور ورشا منہ دیکھتی رہ گئیں۔'' یہ کہہ کر وہ ہنسی اور ہنستی چلی گئی۔

ساحل عمر ہنستے ہوئے بڑی محویت سے دیکھنے لگا۔ اس کی ہنسی کی آواز' اس کی ہنسی کا انداز اتنا دلفریب تھا کہ ساحل عمر نہیں چاہتا تھا کہ وہ اپنی ہنسی روکے۔ وہ چاہتا تھا کہ وہ ہنستی رہے اور وہ اسے

یونہی دیکھتا رہے۔

تب وہ ہنستے ہنستے اچانک رک گئی اور پریشان نظروں سے دروازے کی طرف دیکھنے لگی۔

☆......☆......☆

عمر نے جب ہنسی رکتے اور اس کے چہرے پر پریشانی پھیلتے دیکھی تو اس نے اس کی نظروں کا تعاقب کیا۔ اس کی نظریں دروازے پر جمی ہوئی تھیں لیکن دروازہ بند تھا۔ ساحل عمر کو بڑی حیرت ہوئی کہ رشا ملوک آخر کس چیز کو دیکھ کر پریشان ہو گئی۔

اس سے پہلے کہ ساحل عمر اس سے کوئی سوال کرتا وہ ہڑبڑا کر اٹھ کھڑی ہوئی اور تیزی سے دروازے کی طرف بڑھی۔ دروازے کی طرف جاتے ہوئے اس نے خود کلامی کی۔ ''ارے بابا صاعق یہاں کیسے آ گئے۔''

''بابا صاعق'' ساحل عمر نے دہرایا۔ اسے تو بابا صاعق کہیں نظر نہ آئے۔ بھلا وہ نظر آتے بھی کیسے جبکہ دروازہ بند تھا پھر رشا ملوک کو بند دروازے سے وہ کیسے نظر آ گئے۔

ابھی وہ یہ سوچ ہی رہا تھا کہ رشا ملوک نے آہستگی سے دروازہ کھولا اور بڑے احترام سے دروازے کے ایک طرف ہو گئی۔ اس کے ہونٹوں سے بے اختیار نکلا۔ ''بابا آپ۔''

ساحل عمر دروازے پر نظریں جمائے ہوئے تھا۔ جب دروازہ کھلا تو اسے دروازے پر ایک اونچے قد کا سفید ریش شخص نظر آیا۔ وہ ایک عمر رسیدہ آدمی تھا۔ نوے سے اس کی عمر کیا کم ہو گی۔ بھنویں تک سفید ہو چکی تھیں۔ سر پر کڑھی ہوئی ایک گول ٹوپی تھی۔ سر کے بال سفید' بھنویں سفید' داڑھی سفید اور چہرے کی رنگت سرخ و سفید۔ زرد رنگ کا تہبند اور اس پر اسی رنگ کی چادر اوڑھے' کمر نیلے رنگ کی ریشمیں ڈوری سے کسی ہوئی تھی۔ تہبند ٹخنوں سے اوپر تھا اور پیروں میں ایک ہلکی سی چپل تھی۔ ایک نظر میں بابا صاعق کی شخصیت بڑی دلفریب' جاذب نظر اور وجیہہ محسوس ہوئی تھی۔

''ایک بہت ضروری کام سے آیا ہوں۔'' بابا صاعق نے دروازے پر کھڑے کھڑے بڑے شیریں لہجے میں کہا۔

''بابا آپ کمال کرتے ہیں۔ آپ نے خواہ مخواہ تکلیف کی۔ مجھے بلوا لیا ہوتا۔''

''ہمارا شوق ہمیں یہاں لے آیا۔'' یہ کہہ کر انہوں نے چپل دروازے پر اتار دیئے اور سفید اونی قالین پر چلتے ہوئے آگے بڑھے۔

رشا ملوک نے فوراً دروازہ بند کر دیا اور بھاگتی ہوئی بابا صاعق کے نزدیک آئی اور ان کا بازو پکڑتے ہوئے بولی۔ ''میں سمجھ گئی کہ آپ کیوں آئے ہیں۔ آخر صبر نہیں ہو سکا ناں...... آپ میرے مور کو دیکھنے آئے ہیں۔''

''ہاں۔'' انہوں نے مسکرا کر کہا۔ ''میں تیرے مور کو دیکھنے آیا ہوں اور اس کیلئے ایک تحفہ آیا ہے۔ وہ اسے دینے آیا ہوں۔'' پھر وہ اچانک ساحل عمر سے مخاطب ہوئے جو بڑی دلچسپی سے انہیں دیکھ رہا تھا اور انہیں اپنے نزدیک آتے دیکھ کر وہ کب کا اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ ''اے لڑکے تو ہمیں تو پہچان گیا ہو گا۔''

''جی بابا صاعق...... میں جانتا ہوں کہ آپ اسی بستی کے دانا ہیں۔ آپ کو بہت ہنر آتے ہیں اور رشاملوک پر آپ خاص طور پر مہربان ہیں۔''

''اے لڑکے ہماری مہربانیاں تجھ پر بھی کچھ کم نہیں...... تو یہاں تک بحفاظت پہنچ گیا ہے۔ یہ بات اگر سوچی جائے تو بہت بڑی ہے۔'' انہوں نے احسان جتایا۔

''میں آپ کی اس مہربانی کا شکر گزار ہوں۔'' وہ واقعی ممنون احسان تھا۔

''خالی خولی شکر گزار ہونے کا کیا فائدہ۔ ہمارے حضور کوئی نذر پیش کر۔''

''بابا آپ میرے مور کو پریشان کیوں کر رہے ہیں...... آپ جانتے ہیں کہ وہ یہاں کس طرح پہنچا ہے۔ اس کے پاس اس وقت کچھ دینے کو کہاں ہے۔ آپ کی نذر پکی ہے۔ جب یہ آپ کی مختاری پر آئیں گے تو خالی ہاتھ نہیں آئیں گے۔'' رشاملوک نے بابا صاعق کو ترچھی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''اے لڑکی تو ناراض کس لئے ہوتی ہے۔ ہم مذاق کر رہے ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ جب یہ ہماری مختاری پر آئے گا تو خالی ہاتھ نہیں آئے گا۔ اس وقت تو ہم اس کے لئے کچھ لائے ہیں۔'' یہ کہہ کر بابا صاعق نے اپنی چادر میں ہاتھ ڈالا اور جب ہاتھ باہر نکالا تو ان کے ہاتھ میں چاندی کے خول میں بند ایک تعویذ تھا۔ یہ تعویذ کالی ڈوری میں بندھا ہوا تھا۔ بابا صاعق نے یہ تعویذ ساحل عمر کی طرف بڑھایا۔ ''یہ لو اسے گلے میں ڈال لو۔''

''بابا یہ کیا ہے؟'' رشاملوک نے اس تعویذ کو حیرت زدہ ہو کر دیکھا اور اسے اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

''یہ تعویذ ہے۔ اس کی بستی سے آیا ہے۔ اسے حافظ موسیٰ نے بھیجا ہے۔ وہ اپنی بستی کا بڑا دانا شخص ہے۔ اس جیسا شخص آس پاس کوئی نہیں۔ یہ تعویذ اس کی حفاظت کرے گا۔''

''حافظ موسیٰ!'' ساحل عمر نے خود کلامی کی۔ یہ نام اس کے حافظے میں موجود تھا۔ ناصر مرزا ان بزرگ سے ملا تھا تو انہوں نے اس سے ملنے کی خواہش ظاہر کی تھی۔ ناصر مرزا اسے ان کے پاس لے جانا چاہتا تھا لیکن اس وقت وہ برکھا کے فریب میں مبتلا تھا۔ اس کا جادو اس کے سر چڑھ کر بول رہا تھا۔ وہ اسی سحر کے زیر اثر گھر سے نکل آیا تھا۔ اس طرح حافظ موسیٰ سے اس کی ملاقات ہوتے ہوتے رہ گئی تھی۔ اب انہی حافظ موسیٰ نے اس کیلئے تعویذ بھیجا تھا تا کہ اس کی حفاظت میں رہ سکے۔ سوال یہ تھا کہ یہ تعویذ انہوں نے اتنی دور کس کے ہاتھ بھیجا تھا۔ یہی سوچ کر اس نے بابا صاعق سے سوال کرنا چاہا۔

''محترم بزرگ......!''

''اے لڑکے ذرا ٹھہرنا...... میرے ساتھ بڑے بڑے القاب لگانے کی ضرورت نہیں، میں پوری بستی کا بابا صاعق ہوں۔ تم بھی مجھے اسی نام سے پکارو...... اگر بہت زیادہ ہی احترام کرنا ہے تو چلو نام مت لو تو صرف بابا کہہ لو۔ ہاں تو میں کون ہوں؟''

''بابا صاعق'' ساحل عمر کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ اس کے اس انداز پر دونوں ہی ہنس

پڑے۔

''یہ ہوئی ناں بات...... اب کہو کیا کہتے ہو۔''

''بابا میں یہ پوچھنا چاہ رہا تھا کہ یہ تعویذ آپ تک کیسے پہنچا۔ حافظ موسیٰ کو یہ کیسے معلوم ہوا کہ میں یہاں ہوں آپ کی بستی میں۔''

''اے لڑکے......''

''بابا ذرا ٹھہریئے' میرا نام اے لڑکے نہیں' ساحل عمر ہے۔ آپ مجھے میرے نام سے پکاریں تو مجھے خوشی ہو گی۔'' ساحل عمر نے مسکرا کر بڑے مودبانہ انداز میں کہا تو رشا ملوک منہ پھیر کر مسکرانے لگی۔

''اچھا ٹھیک ہے۔ میں آئندہ تجھے تیرے نام سے پکاروں گا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ تیرا نام بہت اچھا ہے۔ ہاں تو ساحل عمر وہ تیری بستی کا حافظ موسیٰ بڑا زبردست دانا ہے۔ اس کے بہت سے کارندے ہیں۔ وہ جس جگہ چاہے اور جب چاہے کوئی بھی چیز منتقل کر سکتا ہے۔ اگر وہ خود سفر کرنا چاہے تو اسے یہاں آنے میں چند ساعتیں درکار ہوں۔ اس کے رابطے بہت دور تک ہیں۔ تیری کچھ سمجھ میں آیا کہ میں نے کیا کہا۔''

''ہاں' بابا میں کچھ سمجھا اور کچھ نہیں سمجھا۔'' ساحل عمر نے جواب دیا۔

''تو جتنا سمجھ گیا اسے بہت سمجھ...... میں نے تو خیر اتنا بتا بھی دیا حافظ موسیٰ تو اس موضوع پر ایک لفظ نہ بولتا اور وہ ایسا کر کے ٹھیک کرتا۔ یہ دنیا ہی الگ ہے۔ مخفی باتوں کو مخفی ہی رہنا چاہئے۔'' بابا صاعق نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اب یہ تعویذ کو گلے میں ڈال لے۔''

یہ تعویذ رشا ملوک کے ہاتھ میں تھا۔ اس نے فوراً ساحل عمر کی طرف بڑھا دیا۔ ساحل عمر نے وہ تعویذ اپنے گلے میں ڈال لیا۔ اس تعویذ کو گلے میں ڈالتے ہی اسے شدت کا پسینہ آیا۔ حالانکہ اس وقت وہ جہاں تھا وہاں سخت سردی تھی۔ اس کے باوجود اس کے کپڑے پسینے میں تر ہو گئے۔ پھر اس کے جسم پر لرزہ طاری ہو گیا۔

بابا صاعق اس کی بدلتی ہوئی کیفیت کو بغور دیکھ رہے تھے۔ جب اس کا جسم لرزنے لگا تو انہوں نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا اور بولے۔ ''ساحل عمر میرا ہاتھ پکڑ لے۔''

ساحل عمر نے فوراً ان کا ہاتھ تھام لیا۔ ہاتھ تھامتے ہی جسم پر طاری ہونے والی کپکپی فوراً ختم ہو گئی۔ پسینہ آنے کے بعد اسے یوں محسوس ہوا جیسے اس کا جسم ہلکا پھلکا ہو گیا ہو' طبیعت کا بوجھل پن دور ہو گیا ہو' سحر کے اثرات سے نکل گیا ہو۔

''اب ٹھیک ہے۔ کوئی پریشانی تو نہیں۔'' بابا صاعق اپنا ہاتھ کھینچتے ہوئے بولا۔

''نہیں بابا...... میں بالکل ٹھیک ہوں۔ اس تعویذ کو پہن کر بڑا سکون ملا ہے۔'' ساحل عمر نے کہا۔

''اے لڑکی...... اب میں چلتا ہوں تو اپنے مور کی خاطر مدارات کر...... سورج ڈھلے تو اسے میری مختاری پر لے آنا' ضروری نہ ہوتا تو میں مشورہ دیتا کہ اسے یہیں چھپا کر رکھ......''

"بابا آپ فکر نہ کریں...... میں انہیں سب کی نظروں سے بچا کر آپ کے پاس لے آؤں گی۔ آپ بے فکر ہو کر جائیں۔" رشا ملوک نے بڑے یقین سے کہا۔

"اے لڑکی...... میں جانتا ہوں کہ تو بڑی ذہین ہے۔ دیکھ ذرا ہوشیاری سے......" بابا صاعق نے چلتے چلتے ہدایت کی۔ پھر ساحل عمر کا ایک کان چھوا اور دروازے سے باہر نکل گیا۔

"اے لڑکی...... انہوں نے میرا کان کس خوشی میں پکڑا؟" ساحل عمر بابا صاعق کے جانے کے بعد رشا ملوک سے مخاطب ہوا۔

"یہ اس بستی کی رسم ہے۔ ابھی تو دیکھیں کون کون آپ کے کان پکڑتا ہے۔" رشا ملوک ہنس کر بولی۔ "اچھا اب باتیں بہت ہو چکیں میں آپ کے کھانے پینے کا بندوبست کرتی ہوں۔ آپ کچھ کھانے سے پہلے نہانے کا ارادہ تو نہیں رکھتے۔"

"ایسی سردی میں نہاؤں گا میں؟" ساحل عمر نہانے کے تصور سے ہی کانپ اٹھا۔

"آیئے...... پہلے حمام ملاحظہ فرما لیجئے۔ ہو سکتا ہے اسے دیکھ کر آپ اپنے ارادے میں تبدیلی کر لیں۔" یہ کہہ کر رشا ملوک دروازے کی طرف بڑھی۔

وہ بھی اس کے پیچھے پیچھے چلا۔

دروازہ کھلا تو اسے سامنے ایک لمبی سی راہداری نظر آئی۔ بالکل سامنے ایک اور دروازہ تھا۔ وہ شاید باہر جانے کا راستہ تھا۔ اس دروازے کے بائیں جانب دو دروازے اور نظر آ رہے تھے۔ رشا ملوک نے ایک دروازے کی طرف اشارہ کیا۔ "یہ حمام اور وہ بیت الخلا ہے۔ آپ نہانے دھونے کی تیاری کریں، میں آدھے گھنٹے تک آتی ہوں۔ امید ہے آپ اس وقت تک تروتازہ ہو جائیں گے۔"

رشا ملوک نے راہداری کے آخر میں بنا دروازہ کھولا اور باہر چلی گئی۔ ساحل عمر کو دروازہ کھلنے کے بعد اندھیرے کے سوا کچھ نظر نہ آیا۔ اس کے جانے کے بعد جب دروازہ بند ہو گیا تو اس دروازے کی طرف بڑھا۔ اس نے اس دروازے کو کھولنے کی کوشش کی لیکن وہ دروازہ نہ کھلا۔ شاید رشا ملوک جاتے ہوئے دروازہ باہر سے بند کر گئی تھی۔

وہ واپس لوٹ آیا۔ اب اس نے وہ دروازہ کھولا جسے رشا ملوک نے حمام کہا تھا۔

دروازہ کھلتے ہی اندر سے مسحور کن خوشبو کا جھونکا آیا۔ وہ گہرا سانس لیتا ہوا حمام میں داخل ہو گیا۔ یہ ایک وسیع و عریض حمام تھا۔ اس کے ذہن میں واش روم کا جو تصور تھا اس سے بالکل مختلف۔ درمیان میں ایک سفید پتھروں کا بنا حوض تھا۔ اس کے اندر جو پانی تھا وہ متحرک تھا۔ یہ بہتا ہوا پانی تھا۔ ایک طرف سے پانی اندر داخل ہو رہا تھا تو دوسری طرف سے باہر نکل رہا تھا۔

حمام کی دیواریں سرخ پتھروں کی تھیں۔ چھت وہی گنبد نما اور اطراف سے کھلی ہوئی۔ حمام گول تھا جبکہ حوض مستطیل تھا۔ حمام میں خوشگوار گرمی تھی اور یہ گرمی دیواروں کی وجہ سے تھی۔ حمام کی دیواریں گرم تھیں۔ پھر اس نے حوض کے پانی کو چھو کر دیکھا۔ وہ پانی مناسب حد تک گرم تھا۔ حمام میں داخل ہو کر اسے احساس ہی نہیں ہو رہا تھا کہ باہر اس قدر سردی ہے۔

حمام کے ایک طرف بڑا آئینہ فریم شدہ لکڑی کے سٹینڈ میں لگا ہوا تھا۔ اس فریم کو آگے

پیچھے اپنی مرضی کے مطابق کیا جا سکتا تھا۔ اس کے ساتھ ہی ایک سٹینڈ اور تھا جس پر بڑے سائز کا نرم ملائم تولیہ پڑا ہوا تھا۔ لکڑی کے ایک خانے میں چند جوڑے کپڑے موجود تھے۔

ساحل عمر جب اپنے گرم کپڑے اتار کر حوض میں داخل ہوا تو تب اسے پانی کی روانی کا اندازہ ہوا۔ یہ حوض کسی بہتے چشمے کی طرح تھا۔ حوض کی گہرائی کہیں کم اور کہیں زیادہ تھی۔ بندہ اپنی مرضی سے پانی کی گہرائی کا انتخاب کر سکتا تھا۔

ساحل عمر کے لئے اس طرح کے حمام میں غسل ایک نیا تجربہ تھا اور بہت خوشگوار...... رشا ملوک نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ یہ حمام اس قدر خوبصورت اور خوشگوار تھا کہ یہاں سے نکلنے کو جی ہی نہیں چاہتا تھا۔

جب وہ حمام سے باہر آیا تو بے حد تر و تازہ تھا۔ اسے زبردست بھوک لگی ہوئی تھی۔ کمرے میں آ کر وہ بستر پر بیٹھ گیا۔ اس کمرے میں کسی قسم کا کوئی فرنیچر نہ تھا لہٰذا اس نے بستر پر بیٹھ کر کمبل اپنے کندھوں پر ڈال لیا۔

وہ تعویذ اس کے گلے میں موجود تھا۔ پچھلا تعویذ جو عابد منجم نے دیا تھا اسے وہ نہاتے وقت اتار دیا کرتا تھا تاکہ بھیگ نہ جائے۔ وہ تعویذ کپڑے میں سلا ہوا تھا۔ اتارنے کی وجہ سے ایک دن وہ تعویذ رشا ملوک کی تصویر پر ٹنگا رہ گیا اور وہ برکھا کے سحر میں مبتلا ہو گیا۔ اس مرتبہ اس نے سوچ لیا تھا کہ وہ اس تعویذ کو کسی قیمت پر گلے سے نہیں اتارے گا۔ ویسے بھی یہ تعویذ چاندی کے خول میں بند تھا۔

تعویذ کے حوالے سے اسے رشا ملوک کی تصویر یاد آئی جس کے بارے میں اماں نے بتایا تھا کہ اسے بازغر لے اڑا۔ وہ اس سلسلے میں بازغر سے بات کرنا چاہتا تھا لیکن باوجود کوشش کے نہیں کر سکا تھا۔ پتہ نہیں اب بازغر سے اس کی ملاقات ہو گی یا نہیں۔ اگر وہ کہیں نظر آ گیا تو وہ اس مسئلے پر اس سے ضرور باز پرس کرے گا۔

ابھی وہ انہی خیالات میں غلطاں تھا کہ بڑی آہستگی سے دروازہ کھلا۔ سب سے پہلے ساحل عمر کی نظر ٹرے پر پڑی پھر ٹرے اٹھانے والی پر پڑی۔ ٹرے میں ناشتہ تھا لیکن ٹرے اٹھانے والی رشا ملوک نہ تھی۔ وہ کوئی اور لڑکی تھی۔ جو بھی تھی اچھی پیاری سی تھی۔ اس لڑکی کے پیچھے رشا ملوک تھی۔ اس کے ہاتھ میں ایک تھالی تھی۔

وہ دونوں ہنستی مسکراتی اندر آئیں۔ اس لڑکی نے بیضوی ٹرے اس کے سامنے رکھی اور پھر پیچھے ہٹ کر کھڑی ہو گئی۔ تب رشا ملوک آگے بڑھی۔ وہ ٹرے کے نزدیک ہی بیٹھ گئی اور اپنے ہاتھ میں پکڑی ہوئی تھالی ٹرے کے برابر رکھ دی اور من موہنے انداز میں مسکرائی۔

''ناشتہ فرمائیے!'' اس نے شیریں لہجے میں کہا۔

ٹرے میں دو پلیٹوں میں پھل سجے تھے اور درمیان میں دودھ سے بھرا گلاس موجود تھا۔ تھالی میں کیک جیسی کوئی چیز تھی۔ اسی کے ساتھ ایک چمکتی چھری رکھی تھی۔

''تم نے ناشتہ کر لیا۔'' ساحل عمر نے ناشتے پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔

''جی کب کا؟'' رشا ملوک نے بولی۔

میرے ساتھ نہیں کرو گی۔"

"ناشتہ تو نہیں کروں گی لیکن اس ناشتے کی ابتداء مجھ سے ہو گی۔" اس نے عجیب بات کہی۔

"دانا یہ شگون کی روٹی ہے اسے کاٹ کر پہلے آپ کو اپنے ہاتھ سے رشا ملوک کو کھلانا ہو گی۔" اس مرتبہ وہ لڑکی بولی جو رشا ملوک کے ساتھ آئی تھی۔

یہ سن کر رشا ملوک نے نظریں جھکا لیں۔ اس کے چہرے پر شرم چھا گئی تھی۔

"یہ کون ہیں؟" ساحل عمر نے رشا ملوک سے پوچھا۔

"یہ مویا ہے' میرے بچپن کی سہیلی...... آپ کو پسند آئی۔" رشا ملوک نے اپنی گھنیری پلکیں جھکائیں۔

"ہاں اچھی ہے۔" ساحل عمر نے اسے تعریفی نظروں سے دیکھا۔

تب رشا ملوک مویا سے مخاطب ہوئی۔ "اور مویا تجھے میرا مور پسند آیا؟"

"ہاں بہت...... واقعی یہ تو خوابوں کا شہزادہ ہے۔ کوئی خواب زادہ۔" مویا نے خوش ہو کر کہا۔

"ہے ناں......انوکھا۔" رشا ملوک اس کے منہ سے تعریف سن کر کھل اٹھی۔ "سب سے الگ' سب سے جدا' بستی میں ہے کسی کا ایسا مور؟"

"نہیں بالکل نہیں۔" مویا نے زور زور سے گردن ہلائی۔

"خدا کے واسطے رشا ملوک میرے پاؤں زمین پر ہی رہنے دو۔ مجھے اتنا اونچا نہ اڑاؤ کہ میں زمین پر پاؤں رکھنا ہی بھول جاؤں۔" ساحل عمر نے انکساری سے کہا۔

"دانا' زمین تو آپ کے پاؤں سے کب کی نکل چکی ہے۔ اب تو آپ کے پاؤں چاند پر پڑ رہے ہیں۔" رشا ملوک کے بجائے مویا نے جواب دیا۔

"مویا چل چپ ہو جا...... انہیں بھوک لگی ہو گی' ناشتہ کرنے دے۔" وہ راز کھولنے لگی تھی' اسے خاموش کرنا ضروری تھا۔

"میں نے دانا کا ہاتھ تو نہیں پکڑا ہوا...... یہ چھری اٹھا کر شگون کی روٹی کاٹتے کیوں نہیں۔" مویا نے یاد دلایا۔ اس کے لہجے میں شوخی تھی۔

"اوہ اچھا!" ساحل عمر نے شگون کی روٹی کی تھالی اپنے آگے کھسکا لی اور چھری سے کیک کی طرح اس کا ایک چھوٹا سا پیس کاٹا اور اسے اپنے ہاتھ میں اٹھا کر بولا۔ "لو رشا ملوک اپنا نازک سا منہ کھولو۔"

رشا ملوک نے فوراً اپنا منہ کھول دیا اور تھوڑا سا جھک کر شگون کی روٹی کا پیس منہ میں لے لیا اور بڑی شائستگی سے منہ چلانے لگی۔ پھر بولی۔ "چل مویا۔"

مویا فوراً رشا ملوک کے پاس آ کر بیٹھ گئی۔

تب رشا ملوک ساحل عمر سے مخاطب ہوئی۔ "اسے بھی شگون کی روٹی کھلایئے۔"

"اسے بھی میں کھلاؤں؟" ساحل عمر حیران ہوا۔

''جی اسے بھی آپ کھلائیں گے۔ یہ میری بچپن کی سہیلی ہے آخر......''

''اچھا۔'' یہ کہہ کر ساحل عمر نے اس ''روٹی'' کا ایک ٹکڑا اور کاٹا اور اس کی طرف بڑھا دیا۔ مویا نے فوراً بڑا سا منہ پھاڑ دیا اور پھر وہ رشا ملوک اور ساحل عمر کی خوشگوار زندگی کی دعائیں دیتی مزے سے کھانے لگی۔

''اب آپ ناشتہ کیجئے۔ ہم چلتے ہیں۔'' رشا ملوک کھڑے ہوتے ہوئے بولی۔ اس کے ساتھ مویا بھی کھڑی ہوگئی اور پھر وہ دونوں خاموشی سے کمرے سے نکل گئیں۔ وہ بند دروازے کو دیکھتا رہ گیا۔

اس کا خیال تھا کہ رشا ملوک بھی جواباً اسے ''شگون کی روٹی'' کھلائے گی......لیکن ایسا کچھ نہ ہوا' تب اس نے تھالی میں رکھی سنہری گول روٹی کا ایک پیس کاٹا اور منہ میں رکھ لیا۔ وہ بناوٹ کے اعتبار سے سادہ کیک جیسی تھی لیکن اس کا ذائقہ انوکھا تھا۔

اس نے سیر ہو کر ناشتہ کیا۔ پھلوں کی حلاوت اور شیرینی کا کوئی جواب نہ تھا۔ دودھ کی خوشبو اور ذائقہ بالکل جدا تھا۔ اس ناشتے نے اس کے دل کو فرحت بخش دی تھی۔

دوپہر کا کھانا بھی بڑا لذیذ تھا۔ دوپہر کے کھانے کے بعد قہوہ دیا گیا تھا۔ اس قہوہ کی خوشبو دیر تک اس کے منہ میں بسی رہی۔

جب سورج پہاڑوں کی اوٹ میں چھپ گیا تو رشا ملوک اس کے کمرے میں داخل ہوئی۔ وہ اکیلی نہ تھی۔ اس کے ساتھ بازغر تھا۔ وہ بازغر کو دیکھ کر مسکرانے لگا۔ اس نے چاہا کہ اس سے پوچھ کر وہ جھیل سیف الملوک پر اسے تنہا چھوڑ کر کہاں چلا گیا تھا لیکن وہ باوجود کوشش کے سوال نہ کر پایا۔ بازغر نے اپنی موٹی اور غلافی آنکھوں سے بس ایک بار اسے دیکھا تھا۔ اس کی آنکھوں میں جانے کیا بات تھی کہ اس کے ذہن میں اٹھنے والے سارے سوال بھاپ کی طرح اڑ گئے تھے۔

''بابا صاعق کی مختاری پر چلنا ہے۔'' بازغر نے اسے اپنی تیز نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''چلیں۔'' ساحل عمر بستر سے فوراً کھڑا ہوگیا۔

''یہ لیں۔'' رشا ملوک نے اس کی طرف ایک چھوٹا سا مخملی ڈبہ بڑھاتے ہوئے کہا۔

''یہ کیا ہے؟''

''یہ بابا صاعق کی نذر ہے۔'' رشا ملوک بولی۔

''آپ بازغر کے ساتھ چلیں' یہ آپ کو بہت احتیاط سے بابا کی مختاری پہنچا دے گا۔ میں آپ کے ساتھ نہیں جا سکتی۔ میں آپ کو وہیں ملوں گی۔''

''آئیے' ساحل صاحب۔'' بازغر نے اسے باہر نکلنے کا اشارہ کیا۔

ساحل عمر جب دروازے سے باہر نکلا تو اسے سیڑھیوں کے سامنے ایک گاڑی نظر آئی۔ وہ چھ سات سیڑھیاں اتر کر اس کے نزدیک پہنچا۔ یہ ایک بیل گاڑی جیسی چیز تھی لیکن اس میں بیل کے بجائے سفید گھوڑا جتا ہوا تھا۔ ساحل عمر کو بازغر نے گاڑی پر چڑھنے میں مدد کی پھر وہ خود گاڑی بان کی جگہ بیٹھ گیا اور اس نے اگلے پچھلے دونوں پردے گرا دیئے۔ ساحل عمر کسی پردے والی خاتون کی طرح

گاڑی میں بند ہو گیا۔

چند لمحوں بعد بازغر نے پردے کے باہر ہی سے پوچھا ''چلوں جناب!''

''ہاں چلو۔'' گاڑی کے اندر سے جواب آیا۔

تب بازغر نے منہ سے ایک عجیب سی آواز نکالی۔ ساحل عمر کو ایک دم جھٹکا لگا۔ اس نے گاڑی کو مضبوطی سے تھام لیا۔ گاڑی نے دیکھتے ہی دیکھتے رفتار پکڑ لی۔ یہ محسوس ہی نہیں ہو رہا تھا کہ اس گاڑی میں گھوڑا جتا ہوا ہے۔ یہ محسوس ہو رہا تھا کہ وہ کسی موٹر کار پر بیٹھا ہے۔ گاڑی میں گھوڑا جتا ہوا تھا لیکن اس کی ٹاپوں کی آواز قطعاً نہیں آ رہی تھی۔ اور یہ بات بہت حیرت میں ڈالنے والی تھی۔

ساحل عمر نے ذرا سا پردہ ہٹا کر باہر کا جائزہ لیا۔ باہر بالکل اندھیرا تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے گاڑی کسی سرنگ میں سے گزر رہی ہو۔

کچھ دیر کے بعد گاڑی کی رفتار کم ہوئی۔ ٹاپوں کی آواز بھی آنے لگی۔ پھر گاڑی دھیمی ہوتے ہوئے ایک دم رک گئی۔

''آئیے ساحل صاحب!'' بازغر کی آواز آئی تو وہ پردہ ہٹا کر گاڑی سے نیچے کود آیا۔

نیچے اتر کر اس نے چاروں طرف دیکھا تو خود کو کسی عمارت کے احاطے میں پایا۔ سامنے ایک بڑی سی گنبد نما عمارت تھی۔ اس میں ایک بڑا سا دروازہ تھا اور ایک چھوٹی سڑک تھی جس کے دونوں طرف ستونوں میں روشنیاں لگی تھیں۔ یہ سڑک اس عمارت تک گئی تھی۔

بازغر اور وہ دونوں ساتھ ساتھ چلتے ہوئے اس گنبد نما عمارت کے بڑے سے گیٹ میں داخل ہو گئے جو کھلا ہوا تھا۔ گیٹ میں داخل ہوتے ہی ساحل عمر کی نظر رشا ملوک پر پڑی۔ وہ سامنے ہی کھڑی تھی۔ انہیں دیکھ کر وہ آگے بڑھی۔ ''آپ آ گئے۔'' رشا ملوک قریب آ کر بولی۔

''جی۔'' ساحل عمر بولا۔ وہ حیران تھا کہ رشا ملوک اس سے پہلے کس طرح مختاری پہنچ گئی۔

''اندر میری ضرورت تو نہیں۔'' بازغر رشا ملوک سے مخاطب تھا۔

''نہیں...... تم باہر کٹاری میں بیٹھو۔'' رشا ملوک نے جواب دیا۔ ''اگر تمہاری کوئی ضرورت ہوئی تو تمہیں اشارہ مل جائے گا۔''

''ٹھیک ہے۔'' بازغر نے مودبانہ انداز میں کہا اور پھر وہ واپس چلا گیا۔

''آئیے۔'' رشا ملوک نے اپنی بڑی بڑی چمکتی آنکھوں سے اسے دیکھا۔

ساحل عمر خاموشی سے اس کے ساتھ ہو گیا۔ رشا ملوک مختلف راہداریوں سے گزرتی ہوئی بالآخر ایک دروازے پر ٹھہر گئی۔ دروازے پر لوہے کا ایک موٹا کڑا لگا ہوا تھا۔ اس نے چار مرتبہ اس کڑے کو دروازے پر مارا اور پھر ساحل عمر کے ساتھ کھڑی ہو گئی۔

چند لمحوں بعد اس دروازے کے دونوں پٹ ایک ساتھ کھلے۔ دروازہ کھولنے والا نظر نہ آیا۔ شاید دروازہ کھولنے والے کواڑوں کے پیچھے چلے گئے تھے۔

دروازہ کھلتے ہی سامنے بابا صاعق نظر آئے۔ وہ ایک اونچی کرسی پر بیٹھے تھے۔ یہ ایک مرصع کرسی تھی۔ اس پر قیمتی پتھر جڑے ہوئے تھے۔ یہ کرسی دو فٹ اونچے چبوترے پر رکھی ہوئی تھی۔ چبوترے

پر ایک بہت خوبصورت قالین بچھا ہوا تھا اور اس چبوترے پر کرسی کے ساتھ لگا جھکال بیٹھا ہوا تھا۔ بابا صاعق کا ایک ہاتھ اس کے سر پر تھا اور وہ بار بار اپنی زبان باہر نکال کر اپنے منہ پر پھیر رہا تھا۔ بابا صاعق کی پشت پر ایک بڑا آتش دان تھا جس میں آگ روشن تھی۔ بابا صاعق ان دونوں کو آتا دیکھ کر مسکرائے۔

رشا ملوک کرسی کے ایک طرف بابا صاعق کے قدموں میں بیٹھ گئی۔ بابا صاعق نے اپنا دوسرا ہاتھ رشا ملوک کے سر پر رکھ دیا۔ اب ساحل عمر آگے بڑھا۔ اس کے ہاتھ میں مخملی ڈبہ تھا۔ وہ ڈبہ اس نے چبوترے کے قریب ہو کر بابا صاعق کی طرف بڑھایا۔

''ساحل عمر اس ڈبے کو کھول۔'' بابا صاعق نے بہت دھیمے لہجے میں کہا۔

یہ ایک ایسا ڈبہ تھا جس میں عام طور پر زیورات رکھے جاتے ہیں۔'' ساحل عمر نے اس کا ڈھکن اٹھایا تو اس کی آنکھیں خیرہ ہو گئیں۔ ڈبہ کے درمیان میں ایک بڑا سا ہیرا رکھا تھا۔ اس ہیرے سے شعاعیں پھوٹ رہی تھیں۔ ساحل عمر نے ہیرا دیکھ کر ڈبے کا رخ بابا صاعق کی طرف کر دیا۔

بابا صاعق نے ڈبے کی طرف ایک نظر کی اور پھر شیریں لہجے میں بولے۔''نذر نکال کر میرے ہاتھ پر رکھ۔''

ساحل عمر نے وہ ہیرا ڈبے سے نکال کر بابا صاعق کے پھیلے ہاتھ پر رکھ دیا اور خالی ڈبہ بند کر کے ان کے قدموں میں ڈالنے لگا تو رشا ملوک نے اس ڈبے کو تھام لیا۔

بابا صاعق نے اپنے ہاتھ پر رکھے ہیرے کو بغور دیکھنا شروع کیا۔ کچھ ہی دیر میں ان کے ہاتھ پر رکھا ہوا ہیرا پگھل گیا۔ پانی ہو گیا۔ بابا صاعق نے دوسرے ہاتھ کی ایک انگلی اس پانی میں بھگوئی اور رشا ملوک سے مخاطب ہو کر بولے۔''رشا ملوک سامنے آ۔''

رشا ملوک ان کے گھٹنے سے لگی بیٹھی تھی فوراً اس نے رخ بدل لیا۔ اب اس کا چہرہ بابا صاعق کے سامنے تھا۔ انہوں نے اپنی بھیگی ہوئی انگلی اس کی مانگ میں پھیری۔ انہوں نے کئی مرتبہ ایسا کیا یہاں تک کہ رشا ملوک کی مانگ کے بال اچھی طرح اس ہیرے کے پانی میں بھیگ گئے۔

پھر انہوں نے ساحل کو آگے آنے کو کہا۔ رشا ملوک پھر ان کے گھٹنے سے لگ کر بیٹھ گئی۔

''اپنا سینہ کھول۔'' بابا صاعق ساحل عمر سے مخاطب ہوئے۔

ساحل عمر نے اپنے دونوں ہاتھوں سے سینے کے سامنے سے لباس ہٹا دیا۔ گورے بدن پر گھنے سیاہ بال سامنے آ گئے۔ پھر بابا صاعق نے اپنی ہتھیلی کا بقیہ پانی اپنی انگلی سے سینے کے بالوں پر لگا دیا۔ یہ پانی انہوں نے چھوٹے سے دائرے کی صورت میں لگایا۔ پانی لگاتے ہوئے وہ زیر لب کچھ پڑھتے جا رہے تھے۔

پھر یہ عمل ختم ہوا۔''

ان کے ہاتھ پر اب بھی تھوڑا سا پانی لگا ہوا تھا۔ ان کی ہتھیلی گیلی تھی۔ تب انہوں نے اپنا ہاتھ جھکال کے سامنے کر دیا۔ جھکال نے فوراً اپنی لمبی زبان نکال کر گیلی ہتھیلی کو چاٹ لیا۔ جھکال نے ان کی ہتھیلی مزید گیلی کر دی۔ تب انہوں نے اپنا ہاتھ جھکال کے بالوں سے صاف کیا۔ جھکال دوبارہ

ان کے قدموں میں بیٹھ چکا تھا۔ وہ پیار سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگا۔

اس کے بعد وہ کرسی سے کھڑے ہو گئے۔ رشا ملوک بھی فوراً ان کے قدموں سے اٹھ گئی۔ بابا صاعق ایک قدم آگے بڑھے۔ پھر انہوں نے رشا ملوک کو اشارہ کیا۔ وہ ساحل عمر کے برابر کھڑی ہو گئی۔ بابا صاعق نے اپنے دونوں ہاتھ آگے پھیلائے۔ رشا ملوک نے اپنا بایاں ہاتھ ان کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ ساحل عمر نے اس کی دیکھا دیکھی اپنا دایاں ہاتھ بڑھایا اور ان کے داہنے ہاتھ پر رکھ دیا۔

اتنے میں تہکال جو بڑے اطمینان سے اپنی ٹانگیں پھیلائے بیٹھا تھا' ایک دم اٹھا اور پھر پلٹ کر واپس چلا۔ اس نے چبوترے سے چھلانگ لگائی۔ ساحل عمر نے اسے ذرا سا جھک کر دیکھا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ آتش دان کی دیوار سے ٹکرا کر پیچھے گرے گا لیکن ایسا نہ ہوا وہ بھڑکتی آگ اور پتھر کی دیوار دونوں سے گزر کر ایک ساعت میں غائب ہو گیا۔ تہکال واقعی کوئی انوکھی شے تھا۔

بابا صاعق کے ہاتھ پر دونوں کے ہاتھ رکھے تھے اور انہوں نے آنکھیں بند کر کے کچھ پڑھنا شروع کر دیا تھا۔ ساحل عمر ان کے ہونٹوں کو ہلتا ہوا بغور دیکھ رہا تھا۔ کچھ دیر پڑھنے کے بعد انہوں نے اچانک آنکھیں کھولیں اور دھیرے سے بولے۔ ”میرے ہاتھ پر جو آیا ہے اسے اٹھا کر مٹھیاں بند کر لو۔“

ساحل عمر اور رشا ملوک نے ایسا ہی کیا۔ بابا صاعق تب پیچھے ہٹے اور پھر سے کرسی پر براجمان ہو گئے اور بولے۔ ”چلو دونوں مٹھیاں کھولو۔“

دونوں نے اپنی اپنی مٹھیاں کھولیں تو دونوں کی ہتھیلی پر ایک چھوٹا سا سرخ رنگ کا بیضوی پتھر نظر آیا۔

رشا ملوک کے چہرے پر ایک دم مسرت کی لہر دوڑ گئی۔

”اے رشا تجھے مبارک ہو...... اے ساحل تجھے مبارک ہو...... وقت نے اپنا فیصلہ دے دیا۔ تم دونوں یک رنگ ہو گئے۔“ بابا صاعق کے لہجے میں خوشی تھی۔

”بابا صاعق...... یہ سب آپ کی دعاؤں کا اثر ہے۔“ رشا ملوک ممنون انداز میں بولی۔

”بابا' ہم آپ کے مشکور ہیں۔“ ساحل عمر نے احسان مندی سے کہا۔

”ساحل اس پتھر کو چاندی کی انگوٹھی میں جڑوا لینا اور رشا تجھے یہ پتھر گلے میں ڈالنا ہو گا۔“ بابا نے ہدایت کی۔

”ٹھیک ہے بابا۔“ دونوں نے بیک وقت اقرار کیا۔

”جب تک وقت تم دونوں کے ساتھ رہے گا ان پتھروں کا رنگ نہ بدلے گا۔ اور جب وقت بدلے گا تو وقت کے ساتھ ہی پتھروں کا رنگ بھی تبدیل ہو جائے گا۔ یہ لال سے کالے ہو جائیں گے۔“ بابا صاعق نے انکشاف کیا۔

”بابا آپ ہمارے لئے دعا کریں گے کہ وقت کبھی نہ بدلے۔“ رشا ملوک نے فکر مندی سے کہا۔

”میری دعا تم دونوں کے ساتھ ہے۔ اچھا رشا اب رخصت...... تجھے تیرا مور مبارک ہو۔“

بابا صاعق یہ کہہ کر کھڑے ہو گئے اور اس وقت تک کھڑے رہے جب تک وہ دونوں کمرے سے باہر نہ نکل گئے۔

رشا ملوک نے پلٹ کر دروازہ بند کیا اور مسکرا کر ساحل عمر کی طرف دیکھا۔

اس شرمیلی مسکراہٹ میں جانے کتنے دلوں کی جان تھی۔ کتنے موسموں کی بہار تھی، کتنے پھولوں کی خوشبو تھی، کتنی تتلیوں کے رنگ تھے۔ غرض اس ایک مسکراہٹ میں جانے کتنی عشقیہ داستانیں تھیں۔

ساحل بھی جواباً مسکرایا اور اس کی طرف بڑی محبت سے ہاتھ بڑھایا۔ وہ اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لینا چاہتا تھا۔ اسے چھونا چاہتا تھا۔

رشا ملوک ایک دم گھبرا کر پیچھے ہٹ گئی۔ ''نہیں۔''

''کیا ہوا؟'' ساحل عمر اس طرح گھبرا کر پیچھے ہٹتے دیکھ کر خود بھی پریشان ہو گیا۔

''آپ پتھر کے ہو جائیں گے۔'' رشا ملوک نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔

''مذاق کرتی ہو۔'' وہ ہنسا۔

''نہیں سچ کہتی ہوں...... میں بالکل سنجیدہ ہوں اور یہ بات انتہائی توجہ طلب ہے۔'' رشا ملوک خوفزدہ تھی۔

''چلو میں نہیں چھوؤں گا...... لیکن آخر کب تک؟''

''اس وقت تک جب تک میں خود آپ کا ہاتھ نہ پکڑوں۔'' رشا ملوک نے اپنی بڑی بڑی آنکھوں سے دیکھا۔ ''جشن کی رات میں خود آپ کا ہاتھ پکڑ کر لگن زار میں داخل ہوں گی۔ پھر اس کے بعد میرا ہاتھ پکڑ کر جہاں چاہے لے جایئے گا۔''

''اچھا ہوا! تم نے بتا دیا ورنہ جانے کیا سے کیا ہو جاتا۔''

پھر رشا ملوک اس عمارت کے گیٹ تک اس کے ساتھ آئی۔ گیٹ پر بازغر موجود تھا۔ اس نے ساحل عمر کو بازغر کے حوالے کیا اور خود واپس پلٹ گئی۔

بازغر اور ساحل عمر اس گھوڑا گاڑی کی طرف بڑھے جس کا نام کٹاری تھا۔ راستے میں بازغر نے پوچھا۔ ''نذر ہو گئی۔''

''ہاں ہو گئی۔'' ساحل عمر نے بتایا۔

''مٹھی میں کیا نکلا۔'' اس نے بڑی دلچسپی سے پوچھا۔

''لال پتھر۔'' ساحل عمر نے مختصر جواب دیا۔

''دونوں پتھروں کا رنگ ایک ہی تھا؟'' پھر سوال ہوا۔

''ہاں ایک ہی تھا۔'' جواب دیا گیا۔

''آپ خوش قسمت ہیں...... آپ کو مبارک ہو۔'' بازغر نے خوش ہو کر کہا۔

''بازغر ایک بات بتائیں۔'' کیا مختلف رنگوں کے پتھر بھی نکلتے ہیں؟'' ساحل عمر نے اپنی معلومات میں اضافہ چاہا۔

''جی کبھی ایسا بھی ہو جاتا ہے۔ آپ کو وقت نے بچالیا۔'' بازغر نے کہا۔
''ورنہ کیا ہوتا؟'' وہ پریشان ہوا۔
''آپ کے لئے برف میں قبر کھودی جاتی اور اس میں زندہ دفن کر دیا جاتا۔'' بازغر نے انکشاف کیا۔
''اور رشا ملوک پر کیا گزرتی؟'' اس نے تشویش بھرے لہجے میں پوچھا۔
''اسے بستی سے نکال دیا جاتا۔'' بازغر نے بتایا۔
''اس طرح تو وہ خود بخود اعور کے قبضے میں چلی جاتی۔''
''وہ اعور کے قبضے میں جاتی یا کوئی اور اس پر قبضہ کرتا...... بستی والوں کو اس کی فکر نہ ہوتی۔''
''بڑے ظالم ہو تم لوگ۔'' ساحل عمر نے اسے گھور کر دیکھا۔
''نہیں جناب ہم ظالم نہیں وقت کے فیصلے کے پابند ہیں۔ وقت سے کون لڑ سکتا ہے۔''
باتیں کرتے ہوئے وہ کٹاری کے نزدیک آ پہنچے۔ بازغر نے ساحل کو گھوڑا گاڑی میں بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ فوراً پہیئے پر پاؤں رکھ کر گاڑی میں بیٹھ گیا۔ بازغر نے پردہ ڈال دیا اور خود بھی اچک کر کٹاری پر بیٹھ گیا۔ چند لمحوں بعد کٹاری ہوا سے باتیں کرنے لگی۔
پھر وہ جلد ہی اپنے ٹھکانے پر پہنچ گیا۔
کوئی آدھ گھنٹے کے بعد جب وہ اپنے گول کمرے میں ٹہل رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ کیا کرے اتنے میں دروازے پر دستک ہوئی۔ دروازہ اندر سے بند نہ تھا۔ اس نے ٹہلتے ٹہلتے آواز لگائی۔
''دروازہ کھلا ہے۔ آ جاؤ بھائی۔''
فوراً ہی دروازہ کھلا تو مویا کی مسکراتی صورت نظر آئی۔ اس کے ہاتھ میں ایک تھال تھا۔ اس تھال میں ابلے ہوئے چاول اور اس پر سالم مرغی رکھی ہوئی تھی۔ تھال کے کنارے پر پانچ کٹوریاں تھیں۔ جس میں مختلف اقسام کی چٹنیاں اور مرچ مصالحے بھرے ہوئے تھے۔
''رشا کے مور...... آپ کے لئے کھانا۔'' مویا ہنس کر بولی۔ ''کہاں رکھوں؟''
''رشا کی سہیلی...... جہاں چاہے رکھ دو...... کھانے کا شکریہ!''
''بے شک میں رشا کی سہیلی ہوں لیکن میرا بھی ایک نام ہے...... مجھے مویا کہو۔''
''بے شک میں رشا کا مور ہوں لیکن میرا بھی ایک نام ہے...... مجھے ساحل عمر کہو۔''
ساحل عمر کا ترکی بہ ترکی جواب سن کر وہ بے اختیار ہنس پڑی۔ ''بڑے باتونی ہیں...... اچھا ہے رشا ملوک کا دل لگا رہے گا۔ وہ بہت کم گو ہے۔''
مویا نے وہ تھال ساحل عمر کے بستر پر ہی رکھ دیا۔ ساحل عمر نے ایک نظر تھال پر ڈالی۔ یہ عجیب وغریب ڈش تھی۔ اسے بڑی شدید بھوک لگی تھی۔ وہ ہاتھ دھو کر کھانے بیٹھا تو اندازہ ہوا کہ وہ ابلے ہوئے چاول انتہائی خوشبودار اور لذیذ تھے۔ مرغی اتنی خستہ کہ ہاتھ کے اشارے سے ٹوٹ رہی تھی۔ اس پر مرچ مصالحے اور چٹنیاں۔ اس نے خوب مزے لے کر اور خوب سیر ہو کر کھانا کھایا۔ وہ پوری مرغی اور آدھے سے زیادہ چاول کھا گیا۔ وہ جب سے یہاں آیا تھا اس کی بھوک خوب کھل گئی تھی

لیکن اسے یہ اندازہ نہ تھا کہ اس کی بھوک اتنی کھل گئی ہے کہ وہ پوری مرغی با آسانی چٹ کر جائے گا اور ڈکار بھی نہیں لے گا۔

مویا اسے بڑی دلچسپی سے کھاتا دیکھتی رہی۔ ایک چھوٹی بوتل جو شیشے کی تھی اس میں پانی تھا۔ اس نے پانی پیا۔ یہ پانی خوش ذائقہ اور خوشبودار تھا۔

''اب آپ یقیناً قہوہ پینا چاہیں گے۔'' مویا نے تھال اٹھاتے ہوئے کہا۔

''یقیناً!'' ساحل عمر نے بڑے زور سے گردن ہلائی۔

''پھر میرے پیچھے پیچھے آ جائیے۔'' مویا یہ کہہ کر دروازے کی طرف بڑھی۔

جب ساحل عمر اس کے پیچھے پیچھے دروازے سے باہر نکلا تو چاندنی چٹکی ہوئی تھی۔ سردی بھی ٹھیک ٹھاک تھی۔ اس نے اپنے سر پر جمی بالوں والی ٹوپی کو مزید جمایا' کوٹ کا کالر ٹھیک کیا اور اپنے ہاتھ جیبوں میں ڈال لئے۔ تھوڑا آگے جانے پر ایک لڑکی کھڑی دکھائی دی۔ اس نے مویا سے وہ تھال لے لیا اور ایک طرف چلی گئی۔

ساحل عمر اس کے پیچھے پیچھے چلتا رہا۔ پھر ایک چھوٹا سا مینار نظر آیا۔ وہ اس کا دروازہ کھول کر داخل ہو گئی۔ ساحل عمر کا خیال تھا کہ مینار میں اوپر جانے کا زینہ ہو گا لیکن ایسا نہ تھا اس میں سیڑھیاں نیچے جا رہی تھیں۔ یہ ایک کشادہ زینہ تھا۔ زینہ کے بعد ایک چوڑا راستہ دکھائی دیا۔ اس راستے میں اچھی خاصی روشنی تھی۔

کچھ دور چلنے کے بعد یہ راستہ آگے بند ہو گیا تھا۔ سامنے ایک بڑا سا لکڑی کا چمکدار محرابی دروازہ تھا۔ اس نے دروازے کو آہستہ سے دھکا دیا۔ دروازہ کھلتا چلا گیا۔

''آیئے!'' مویا نے اس سے مڑ کر کہا۔

جب ساحل عمر اندر آ گیا تو مویا نے دروازہ بند کر دیا۔ ساحل عمر نے اس ہال نما کمرے پر ایک طائرانہ نظر ڈالی پھر ایک مقام پر اس کی نظریں ٹھہر گئیں۔ وہ حیران ہو کر دیکھنے لگا۔

☆......☆......☆

اس کے بالکل سامنے رشا ملوک کی تصویر لگی ہوئی تھی۔ حیرانی کی بات یہ تھی کہ یہ پینٹنگ اس کی بنائی ہوئی تھی۔ یہ وہ تصویر تھی جسے بازغ اس کے گھر سے سب کی آنکھوں میں دھول جھونک کر اٹھا لایا تھا۔

یہ کمرہ ساحل عمر کے کمرے جیسا تھا۔ فرق یہ تھا کہ اس سے چار گنا بڑا تھا۔ وہی طرز تعمیر پتھر کی دیواریں گنبد نما چھت جو اطراف سے کھلی ہوئی تھی۔ کھڑکی کوئی نہ تھی۔ البتہ دروازے تین تھے۔ دیوار سے دیوار تک قالین دیوار کے ساتھ رکھی ہوئی سات اونچی کرسیاں' ان کے سامنے ایک بیضوی میز ایک طرف دو فٹ اونچا بستر' سرہانے کی طرف سے گول اور آگے سے مستطیل۔ اس پر آسمانی رنگ کی چادر' گہرے نیلے گاؤ تکیے موجود تھے۔ دروازوں پر پردے نہ تھے لیکن دروازے اتنے چمکیلے تھے لگتا تھا آج ہی پالش کی گئی ہو۔

''آپ تشریف رکھئے...... چاہے کرسی پر' چاہے بستر پر۔ میں چلتی ہوں۔ رشا ملوک آ کر آپ کو قہوہ پلائے گی۔ وقت آپ کی نگہبانی کرے۔'' یہ کہہ کر وہ جس دروازے سے آئی تھی اسی دروازے سے باہر نکل گئی۔

اس کے جانے کے بعد وہ اپنی بنائی ہوئی تصویر کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ رشا ملوک کی تصویر کو غور سے دیکھنے لگا۔ یہ وہ تصویر تھی جس نے ایک فسانے کو جنم دیا تھا۔ اسے نہیں معلوم تھا جس مثالی لڑکی کے وہ خواب دیکھ رہا ہے وہ واقعی کہیں موجود ہو گی۔ آئیڈیل کے بارے میں تو یہ کہا جاتا ہے کہ وہ کبھی نہیں ملتے۔ اگر وہ مل جائے تو پھر آئیڈیل نہیں رہتا لیکن اس کے خوابوں میں بسنے والی تو حقیقت کا روپ دھار گئی تھی۔ وہ مجسم ہو کر اس کے سامنے آ گئی تھی۔ وہ اس قدر پیاری تھی کہ اس پر دیوان پر دیوان لکھے جا سکتے تھے۔ وہ شاعر نہیں تھا مصور تھا۔ اس لئے اس نے اسے رنگوں میں ڈھال لیا تھا لیکن یہ رنگ تو کچھ بھی نہ تھے۔ جو رنگ اصل میں تھے اوپر والے نے اسے جو روپ دیا تھا' اس کی نقل تو ممکن ہی نہ تھی۔

رشا ملوک کی تصویر کو وہ بڑی محویت سے دیکھ رہا تھا کہ کسی نے بڑی آہستگی اور شائستگی سے کہا۔ ''کیا دیکھتے ہیں؟''

وہ اس مانوس آواز پر پلٹا تو اس نے رشا ملوک کو اپنی پشت پر پایا۔ پھر وہ اسے گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''تمہیں دیکھتا ہوں اور کسے دیکھوں گا۔''

"آیئے ادھر میز پر آ جائیے۔ آپ کیلئے قہوہ لائی ہوں۔" رشا ملوک نے میز کی طرف اشارہ کیا۔

ساحل عمر خاموشی سے میز کی طرف چل دیا اور ایک کرسی پر بیٹھ گیا پھر بولا۔ "رشا ملوک یہ تصویر تمہارے پاس کیسے آئی؟"

"میری تصویر تھی، میں نے اپنے بندے سے اسے منگوالی۔" رشا ملوک نے بڑے فخریہ انداز میں اور بے نیازی سے کہا۔

"منگوالی یا چروالی...... منگوانے اور چرانے میں بڑا فرق ہے۔"

"ہوگا۔" وہ شرارت سے ہنسی "ہم تو ہیں ہی سدا کے چور...... دیکھیں ناں...... یہ تصویر ہی کیا ہم نے تو آپ کو بھی منگوالیا۔ ہمارا مطلب ہے چروالیا۔"

"یہ چوری تمہاری عادت ہے یا پیشہ ہے۔" ساحل عمر نے قہوہ پیتے ہوئے کہا۔

"جو آپ سمجھ لیں...... ہم تو بس اتنا جانتے ہیں کہ ہم آپ کے دیوانے ہیں اور محبت آدمی سے بہت کچھ کروا لیتی ہے۔" رشا ملوک نے اپنی آنکھیں جھکا کر کہا۔ اس کے ہونٹوں پر شرمیلی مسکراہٹ کھیلنے لگی تھی۔

"رشا ملوک یہ تمہارا کمرہ ہے؟" ساحل عمر نے پوچھا۔

"ہاں۔"

"رشا ملوک کیا یہ تمہارا گھر ہے؟"

"ہاں۔"

"کیا تم اکیلی رہتی ہو؟ تمہارا کوئی نہیں...... میرا مطلب ہے تمہارے ماں باپ؟"

"ماں ہیں...... والد ہیں والد کا نام سمار ملوک ہے۔ وہ اس بستی کے رمز شناس ہیں۔ آپ انہیں سردار سمجھ لیں۔ وہ سچے خواب دیکھتے ہیں۔ ان خوابوں کی بنیاد پر وہ پیشگوئی کر گئے ہیں۔ وہ آج تک سیکڑوں پیشگوئیاں کر چکے ہیں جو سب کی سب سچ ثابت ہوئی ہیں۔" رشا ملوک نے بتایا۔

"کیا ان سے میری ملاقات نہیں ہو سکتی؟"

"ہاں، کیوں نہیں...... یہاں آپ کو بلایا ہی اس لئے گیا ہے۔" رشا ملوک نے انکشاف کیا۔

اتنے میں دروازے پر دستک ہوئی۔ رشا ملوک دستک کی آواز سن کر فوراً کھڑی ہو گئی۔ "لیجئے وہ آ گئے۔"

اس کمرے میں تین دروازے تھے اور تینوں برابر برابر تھے۔ رشا ملوک تیزی سے چلتی ہوئی درمیان کے دروازے کے پاس پہنچی پھر اس نے دروازے کو کھول دیا۔ دروازہ کھلتے ہی جو شخص مسکراتا ہوا اندر داخل ہوا اسے دیکھ کر ساحل عمر کو رشا ملوک کی بنائی ہوئی تصویر یاد آ گئی۔ وہ ایک ادھیڑ عمر کا پرکشش مرد تھا۔ سر پر آسمانی رنگ کا صافہ...... بند گلے کا کوٹ، کوٹ کے کالر پر دو ہیرے جڑے ہوئے گلے میں ایک کالی ڈوری میں بندھی انگوٹھی۔ یہ چاندی کی انگوٹھی تھی جس میں سبز رنگ کا گول پتھر لگا ہوا تھا۔ کوٹ اور پینٹ کا رنگ گرے تھا۔ ساحل عمر کی سمجھ میں اب آیا کہ رشا ملوک نے اس کی تصویر کو کس

کالباس پہنا دیا تھا۔
تھا اس شخص کے ہاتھوں میں ننگی تلوار تھی۔ یہ تلوار اس نے اپنے دونوں ہاتھوں میں پکڑی ہوئی تھی۔ اس تلوار کا رخ چھت کی طرف تھا۔ کمرے کے اندر آ کر سمار ملوک نے تلوار ایک ہاتھ میں لے لی اور اس کا رخ زمین کی طرف کر لیا پھر وہ وہیں ٹھہر گیا۔ رشا ملوک تیزی سے آگے بڑھی۔ وہ گھٹنوں کے بل جھکی اور اس نے اپنے باپ کا خالی ہاتھ بڑے احترام سے چوما اور پھر کھڑی ہو گئی۔

ساحل عمر، سمار ملوک کو اندر آتا دیکھ کر احتراماً کھڑا ہو گیا تھا۔ اب وہ آہستہ آہستہ اس کی طرف بڑھ رہا تھا۔ جب ساحل عمر اس کے نزدیک پہنچ گیا تو اس نے تلوار والا ہاتھ بڑی مستعدی سے آگے بڑھا دیا۔ تلوار کا رخ چھت کی طرف تھا۔

ساحل عمر کی سمجھ میں نہ آیا کہ اس بات کا کیا مطلب ہے۔ کیا وہ ہاتھ بڑھا کر تلوار لے لے۔ ساحل عمر کو تذبذب میں دیکھ کر رشا ملوک نے کہا۔ ''احترام دیجئے۔''

ساحل عمر کی سمجھ میں بات نہ آئی کہ وہ احترام کس طرح دے۔ اتنے میں رشا ملوک پھر بولی۔ ''ویسا احترام جیسا میں نے دیا۔''

''اچھا!'' ساحل عمر نے کہا۔ اب اس کی سمجھ میں آیا کہ کیا کرنا ہے۔ اس نے سمار ملوک کا ہاتھ چوما تھا لیکن سوال یہ تھا کہ وہ کون سا ہاتھ چومے۔ وہ ہاتھ جس میں تلوار ہے یا وہ ہاتھ جو خالی ہے۔ سمار ملوک نے اسے دیکھ کر تلوار والا ہاتھ بڑھایا تھا لہٰذا اس نے سوچا کہ اسی ہاتھ کو بوسہ دینا ہے اگر کوئی گڑبڑ ہوئی تو رشا ملوک اشارہ کر دے گی۔

ساحل عمر نے جھک کر تلوار والے ہاتھ کو اپنے ہونٹوں سے چوما اور سیدھا کھڑا ہو گیا۔ ہاتھ کو چومتے ہی ساحل عمر نے دیکھا کہ سمار ملوک نے تلوار کا رخ فرش کی طرف کر لیا ہے۔ پھر وہ تلوار نیچی کئے کرسیوں کی طرف بڑھا اور پہلی کرسی پر بیٹھ گیا۔ تلوار اس نے میز پر رکھ دی۔

رشا ملوک اور ساحل عمر اس کے سامنے کھڑے ہو گئے۔ سمار ملوک نے بغور ساحل عمر کی طرف دیکھا۔ سمار ملوک کی آنکھوں میں ہیرے کی سی چمک تھی۔ اس سے آنکھیں ملانا مشکل تھا۔ ساحل عمر نے اپنی آنکھیں نیچی کر لیں۔

''اپنی آنکھیں اٹھا...... مجھے دیکھ۔'' سمار ملوک کی بارعب آواز گونجی۔

''بابا' کیا آپ کی آنکھوں میں دیکھنا کوئی آسان کام ہے۔ ان آنکھوں میں صدیوں کی روشنی بھری ہے۔'' رشا ملوک نے ساحل عمر کی طرفداری کی۔

''تجھے خاموش رہنا ہو گا۔'' وہی بارعب آواز گونجی۔ پھر وہ ساحل عمر سے مخاطب ہوا۔ ''میری آنکھوں میں دیکھ۔''

ساحل عمر کے ذہن میں اچانک ایک خیال کوندا۔ اسے فوراً حافظ موسیٰ کا تعویذ یاد آیا جو اس کے گلے میں پڑا ہوا تھا۔ اس نے اس تعویذ کو اپنی آنکھیں بند کر کے باری باری دونوں آنکھوں پر رکھا پھر تعویذ ہاتھ سے چھوڑ کر ایک دم آنکھیں کھول دیں اور سمار ملوک کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ اس کی آنکھوں میں اب اتنی سکت پیدا ہو گئی تھی کہ وہ سمار ملوک کی آنکھوں سے آنکھیں ملا سکتا تھا۔

اسے آنکھیں ملاتے دیکھ کر سمار ملوک کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔ ''شاباش...... یہ ہوئی نا بات۔''

سمار ملوک کو خوش ہوتے دیکھ کر رشا ملوک فوراً چہکی۔ ''بابا آپ کو میرا مور پسند آیا۔''

''تیرا مور؟'' سمار ملوک نے الجھے ہوئے لہجے میں سوال کیا۔

''ہاں' میرا مور۔'' رشا ملوک نے بڑے یقین سے کہا۔

''رشا ملوک تیری اس سے شادی نہیں ہو سکتی۔'' فضا میں جیسے ایک زبردست دھماکہ ہوا۔

''بابا' یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ صدیوں پرانے قانون کو توڑ رہے ہیں۔ یہ آپ کو کیا ہو گیا ہے؟'' رشا ملوک پریشان ہو کر بولی۔

''میں قانون نہیں توڑ رہا' اس کی پیشانی دیکھ رہا ہوں۔'' سمار ملوک نے عجب بات کی۔

''ان کی پیشانی پر کیا لکھا ہے؟'' رشا ملوک کو فکر ہوئی۔

''جو لکھا ہے وہ میں نے تجھے بتا دیا۔ تیری شادی نہیں ہو سکتی۔''

''لیکن بابا صاعق نے نذر لے کر جو پتھر دیا ہے وہ ہم رنگ ہے...... کیا بابا صاعق کی نذر جھوٹی ہے۔'' رشا ملوک کے جسم پر لرزہ طاری ہو گیا تھا۔ وہ اس بری خبر کو سن کر پریشان ہو گئی تھی۔

''جو میں جانتا ہوں وہ بابا صاعق نہیں جانتا۔ میں اس بستی کا رمز شناس ہوں۔ ستاروں کی چال جانتا ہوں۔ اس لڑکے کے ستارے جو کچھ کہہ رہے ہیں اس بات نے مجھے چونکا دیا ہے۔ یہ لڑکا اس بستی میں ہمارا نجات دہندہ بن کر آیا ہے۔ تین دن سے جو میں خواب دیکھ رہا تھا' آج اس کی تعبیر کھل کر سامنے آ گئی۔ نہیں یہ شادی نہیں ہو سکتی۔'' سمار ملوک نے بس ایک ہی رٹ لگا رکھی تھی۔

''بابا' آپ ایسا کیوں کہہ رہے ہیں۔ مجھ پر رحم کھائیں۔ اپنی اکلوتی اولاد کا مور تباہ نہ کریں۔''

''تیرا مور تباہ نہ کروں' اپنی بستی تباہ کروا لوں۔ میں اس بستی کا رمز شناس ہوں۔ میں ایسا نہیں کر سکتا۔ اپنی بیٹی کی خاطر' میں پوری بستی کو تباہی کے دہانے پر نہیں پہنچا سکتا۔'' سمار ملوک نے لگا سا جواب دیا۔

''میری شادی سے بستی تباہ ہو جائے گی۔ آخر کیسے؟'' رشا ملوک کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا رہا تھا۔ ''بابا' آپ یہاں میرے مور سے ملنے آئے تھے لیکن جب سے آئے ہیں مسلسل پریشان کن پیشگوئیاں کئے جا رہے ہیں۔ بابا ایسا مت کریں۔ میں نے ہزار دقتوں کے بعد اپنے مور کو پایا ہے۔''

''تو نہیں جانتی۔ یہ وقت کا فیصلہ ہے۔ یہ لڑکا وقت کا انتخاب ہے۔ اسے وقت یہاں لایا ہے۔ یہ یہاں آ گیا ہے تو ہمیں وقت کا احترام کرنا ہو گا۔''

''میری شادی روک کر؟'' رشا ملوک تلخی سے بولی۔

''بابا اس بستی میں آج تک ایسا نہیں ہوا۔ بابا صاعق نے بھی ہمارے حق میں فیصلہ دے دیا ہے۔ وہ میرے مور کو دیکھ کر بہت خوش ہیں۔''

"خوش تو میں بھی ہوں...... میں کون سا ناخوش ہوں۔ وقت نے اس بستی میں ایک ایسا نوجوان بھیج دیا ہے جس کی پیدائش ایک خاص وقت میں ہوئی ہے۔ ایسا وقت صدیوں میں آتا ہے۔ ایسے نوجوان صدیوں میں پیدا ہوتے ہیں۔ یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ یہ نوجوان آج ہمارے درمیان موجود ہے میرا ایک خواب اور سچا ثابت ہو گیا ہے۔" سمارملوک خوش ہو کر بولا۔

ساحل عمر کافی دیر سے خاموش کھڑا باپ بیٹی کی گفتگو سن رہا تھا۔ گفتگو اسی کے بارے میں ہو رہی تھی لیکن اس سے کوئی مخاطب نہ تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ سمارملوک کو اچانک کیا ہو گیا۔ اس نے ایسا کیا خواب دیکھ لیا۔ وہ اس کو اتنی اہمیت کیوں دے رہا ہے۔ شادی سے کیوں انکاری ہے جبکہ بقول رشا ملوک نذر کے پتھر بھی ہم رنگ نکل آئے ہیں۔ تب اس نے سوچا کہ اس گفتگو میں مداخلت کرنا چاہئے۔ سمارملوک سے بارے میں آگاہی حاصل کرنا چاہئے۔ اگر وہ اس بستی یا بستی والوں کے کوئی کام آ سکتا ہے تو اسے وہ کام نجام دینا چاہئے۔ یہ فیصلہ کر کے اس نے لب کشائی کی۔ "بابا آپ اجازت دیں تو میں کچھ عرض کروں۔"

"ہاں لڑکے بولو۔"

"بابا، میرا نام ساحل عمر ہے۔" ساحل عمر کو سمارملوک کا بار بار لڑکا کہنا اچھا نہ لگا۔ "ابھی تک آپ دونوں کے درمیان جو گفتگو ہوئی ہے اس سے مجھے یہ اندازہ ہوا ہے کہ آپ نے میرے بارے میں کوئی خواب دیکھا ہے اور یہ کہ آپ سچے خواب دیکھتے ہیں۔ کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ آپ نے میرے بارے میں کیا خواب دیکھا ہے۔"

"اے ساحل عمر خواب سے پہلے میں تجھے ایک کہانی سناتا ہوں، پہلے وہ سن...... تو کھڑا کیوں ہے...... آ میرے برابر آ کر بیٹھ جا اور اے رشا ملوک تو ذرا صبر سے کام لے...... آ تو بھی میرے پاس آ کر بیٹھ جا۔" سمارملوک نے کہا۔

ساحل عمر خاموشی سے سمارملوک کے برابر پڑی کرسی پر بیٹھ گیا۔ رشا ملوک، ساحل عمر کے برابر والی کرسی پر بیٹھ گئی۔ اس کے حسین چہرے پر فکر کے بادل چھائے ہوئے تھے۔

"جی بابا...... شروع کیجئے کہانی۔" ساحل عمر نے سنجیدگی سے کہا۔

"یہ کہانی نہیں ایک اٹل حقیقت ہے۔ میرا علم مجھے کبھی دھوکا نہیں دے سکتا۔ میرے خواب بھی جھوٹے نہیں ہوتے۔ یہ بہت پہلے کی بات ہے ہزاروں برسوں پہلے کی بات ہے۔ فرعونوں کا زمانہ...... اپنے وقت کے سو بڑے ساحروں نے "ربطول" مرتب کی۔ یہ کتاب سحر دو حصوں میں تیار کی گئی۔ ایک حصے میں منتر تھے تو دوسرے حصے میں ان منتروں کو پڑھنے کی ترکیب تھی۔ یہ دونوں حصے فراعنہ کے پاس نسل در نسل چلے آ رہے تھے۔ شہنشاہ وقت ان دونوں حصوں کو الگ الگ مقامات پر رکھتا تھا کہ اگر کوئی ایک حصہ چوری بھی ہو جائے تو چور کتاب سے فائدہ نہ اٹھا سکے لیکن ستاروں کے فیصلے اٹل ہوتے ہیں۔ کسی معبد کے پروہت نے جو اپنے وقت کا بڑا ساحر بھی تھا اور اس کا تعلق سو جادوگروں کے سالار سامری کی اولادوں میں سے تھا کسی طرح اس کتاب کا ایک حصہ چرا لیا۔ یہ پہلا حصہ تھا جس میں منتر درج تھے۔ پہلا حصہ چوری ہو جانے پر ربطول کا دوسرا حصہ بے اثر ہو گیا۔ چند سالوں بعد

شہنشاہ وقت کا انتقال ہوگیا۔ اس فرعون کی ممی کو ہرم میں منتقل کیا گیا تو اس کے ساتھ سحر ربطول کا دوسرا حصہ بھی رکھ دیا گیا۔ وہ ساحر جو فرعون کی موت کا منتظر تھا کہ کب فرعون مرے اور کب وہ کتاب کو اپنے قبضے میں کرے۔ فرعون کے ہرم میں مدفون ہوتے ہی اس ساحر نے راتوں رات اس کے ہرم میں داخل ہو کر کتاب کا دوسرا حصہ بھی اڑا لیا اور وہ ساحر جو سامری کی اولادوں میں سے تھا اور جس کا نام راعین تھا' فرعونوں کی سرزمین سے فرار ہوگیا۔ ربطول میں درج منتروں کے ذریعے اس نے زبردست قوتیں حاصل کر لیں۔ انہی شیطانی قوتوں میں سے ایک ''مانا'' کی قوت بھی تھی۔ پھر راعین گھومتا گھامتا ہمارے علاقے میں آ گیا۔ اسے یہ علاقہ بہت پسند آیا اور اس نے یہاں اپنا مستقل ٹھکانہ بنانے کی منصوبہ بندی کی۔ اس نے کتاب سحر میں درج سب سے مشکل منتر پر عمل کرنے کی ٹھانی۔ اس منتر کی تکمیل کیلئے ضروری تھا کہ راعین خود کو زندہ دفن کرے اور ہزاروں سال بعد مقررہ وقت پر جب وہ دوبارہ اپنے مدفن سے باہر آئے تو وہ بے پناہ قوتوں کا مالک ہو۔ مانا کے ساتھ چار گھوڑے بھی اس کے قبضے میں آ جائیں اور پھر وہ جب چاہے جہاں چاہے تباہی پھیلا دے۔ راعین برائی کا علمبردار ہے۔ پکا شیطان ہے۔ ایک فتنہ ہے۔ ایک عفریت ہے۔ اگر وہ زندہ ہو کر اپنے مدفن سے باہر آ گیا تو پھر تباہی مقدر بن جائے گی۔ اس فتنے کے جاگنے سے پہلے اسے ہمیشہ کیلئے موت کی نیند سلانا ہے اور یہ کام اے ساحل عمر صرف تم کر سکتے ہو تم...... تم جوشنی ہو' وقت کے دھنی ہو' چاند اور سورج تمہارے راہبر ہیں۔ حمل کا تم پر سایہ ہے۔ مشتری تمہارا غلام ہے' عطارد تمہارے سامنے ہاتھ جوڑے بیٹھا ہے۔ تمہاری پیدائش سات ستاروں کے اجتماع کی شبھ گھڑی میں عمل میں آئی۔'' اتنا سنا کر سارملوک خاموش ہوگیا۔ ''تمہارا کوئی جواب نہیں۔''

ساحل عمر بڑی محویت کے عالم میں اس کی کہانی سن رہا تھا۔ جب اس نے اس کا ذکر کیا تو وہ ایک دم چونک اٹھا اور پریشان ہو کر بولا۔ ''بابا آپ میرے بارے میں کس قسم کی باتیں کر رہے ہیں۔''

''اے ساحل عمر تو وہ شخص ہے جو اپنے بارے میں کچھ نہیں جانتا پر ایسا بھی ہوتا ہے۔ تو پریشان مت ہو۔ جیسا میں کہوں ویسا کرتا جا۔ تو بھی خوش رہے گا اور ہم بھی خوش رہیں گے۔''

''اور میری شادی کا کیا ہوگا بابا۔'' رشا ملوک نے درمیان میں ٹانگ اڑائی۔

''جب تک راعین کو ہمیشہ کی نیند سلا نہیں دیا جاتا اور کتاب سحر کو جلا نہیں دیا جاتا تب تک تو اپنے مور کا ہاتھ نہیں پکڑ سکتی تو شادی کے جشن میں شریک نہیں ہو سکتی۔ سن لیا تو نے۔'' سارملوک نے تنبیہ کی۔

''بابا میری شادی تو ہو جائے گی نا' میرے مور سے۔'' وہ خوشامدانہ لہجے میں بولی۔

''ہاں' ہو جائے گی۔'' سارملوک نے سپاٹ انداز میں جواب دیا۔

''پھر میں انتظار کرلوں گی۔ بستی کی بھلائی کی خاطر میں انتظار کرلوں گی لیکن بابا میرے مور کو تو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔ آپ کا علم کیا کہتا ہے۔''

''ہمیں اچھے وقت کی امید رکھنی چاہئے اور کامیابی کی دعا مانگنی چاہئے۔

''بابا میں نے آپ کی کہانی تو سن لی لیکن اس کہانی میں اس خواب کا ذکر نہیں جس کے بارے میں آپ نے کہا تھا کہ وہ سچا ثابت ہوا اور جو میرے بارے میں تھا۔''

''اچھا ہاں...... میں وہ بتانے والا تھا کہ بیچ میں رشا ملوک بول پڑی۔ میں تین دن سے ایک خواب دیکھ رہا ہوں کہ ایک نوجوان سنہرے چست کپڑوں میں ہاتھ میں تلوار ہے ایک برف کی قبر پر اپنی تلوار سے وار کرتا ہے۔ تلوار برف میں گھس جاتی ہے۔ جب وہ تلوار نکالتا ہے تو وہ خون میں نہائی ہوئی ہوتی ہے۔ برف پر بھی خون ہوتا ہے پھر یہ تلوار ایک دم صاف ہو جاتی ہے۔ خون اچانک غائب ہو جاتا ہے تو وہ نوجوان دوبارہ برف کی قبر پر وار کرتا ہے پھر تلوار خون آلود ہو جاتی ہے اور چند لمحوں بعد صاف ہو جاتی ہے۔ اس طرح وہ نوجوان بار بار تلوار سے قبر پر وار کرتا ہے یہاں تک کہ وہ قبر اچانک سات حصوں میں تقسیم ہو جاتی ہے۔ بس یہ خواب دیکھا میں نے۔ جب پہلی بار میں نے یہ خواب دیکھا تو میں نے علم نجوم کا سہارا لیا۔ ستاروں نے مجھے یہ کہانی سنائی۔ تین دن تک مسلسل یہ خواب دیکھنے کے بعد آج تمہیں دیکھا تو مجھے فوراً خواب والا نوجوان یاد آ گیا۔ وہ نوجوان تم تھے اور تمہارے ہاتھ میں یہ تلوار بھی میری تھی۔ یہ ایک مقدس تلوار ہے جو نسل در نسل ہم رمز شناسوں میں چلی آ رہی ہے۔ آج میں یہ تلوار تمہارے حوالے کرتا ہوں۔ اسے قبول کرو۔'' یہ کہہ کر سمار ملوک فوراً اٹھ گیا۔ اس نے میز سے تلوار اٹھائی اور اپنے دونوں ہاتھوں پر رکھ کر وہ ساحل عمر کے سامنے جھک گیا۔

ساحل عمر کے پاس اب اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ اس تلوار کو قبول کر لے۔ رشا ملوک نے بھی آنکھ کے اشارے سے تلوار قبول کرنے کا سگنل دیا تھا۔ یہ ایک ایسا اعزاز تھا جو آج تک کسی مور کو نصیب نہیں ہوا تھا۔ رشا ملوک کے چہرے پر ایک دم رونق آ گئی تھی۔

ساحل عمر نے اپنا ہاتھ بڑھا کر وہ تلوار سمار ملوک کے ہاتھوں پر سے اٹھالی۔ ''شکریہ!''

پھر اس نے اس تلوار کو الٹ پلٹ کر دیکھا۔ یہ ایک خوبصورت تلوار تھی۔ اس کے دستے پر ہیرے جڑے ہوئے تھے۔ ساحل عمر نے دستے میں ہاتھ ڈال کر تلوار کو مضبوطی سے پکڑ لیا اور ہاتھ اٹھا کر چمکتی تلوار کو چوم لیا اور پھر دل ہی دل میں دعا کی۔

''اے اللہ...... اس عفریت کو ختم کرنے میں میری مدد فرما۔''

دعا کر کے اسے سکون سا آ گیا۔ دعا دراصل ایک مستقل عبادت ہے۔ تمام مذاہب کی روح دعا ہے اور عبادت ہمیشہ سکون کا باعث ہوتی ہے۔

''اے ساحل عمر بس اب تو جا...... رشا ملوک تجھے تیرے ٹھکانے تک چھوڑ آئے گی تو آرام کر۔'' سمار ملوک یہ کہہ کر کھڑا ہو گیا۔ پھر وہ رشا ملوک سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''اے رشا ملوک جا تو اس کے ساتھ جا......''

''ٹھیک ہے بابا جاتی ہوں۔''

''سمار ملوک ساحل عمر کے قریب آیا تو اس نے ہاتھ بڑھا کر ساحل کا کان چھوا اور بولا۔ ''اے ساحل عمر ابھی کام شروع ہوا ہے۔ ابھی راستے میں بہت مشکلیں ہیں۔ ابھی ہمیں یہ معلوم نہیں

ہے کہ راعین کہاں دفن ہے ہمیں اس کے برفانی ہرم کا کھوج لگانا ہوگا۔ میں بستی کے کچھ ہنر مندوں کو پکڑتا ہوں۔ بابا صاعق سے بھی مشورہ کرتا ہوں۔ مل بیٹھ کر ہی راستہ نکالنا ہوگا۔ اس فتنے کا قبر پھاڑ کر باہر آنے کا صحیح وقت بھی معلوم کرنا ہوگا۔ یہ کام تو میں ستاروں کے ذریعے کرلوں گا۔ میرا علم بڑا سچا ہے مجھے کبھی دھوکا نہیں دیتا۔"

"ٹھیک ہے بابا۔ آپ اپنی کوششیں جاری رکھیں۔ میں اللہ کی مخلوق کی بھلائی کیلئے جو کرسکتا ہوں اس کے لئے میں حاضر ہوں۔ مجھے اس عفریت کا خاتمہ کر کے بے پناہ خوشی میسر آئے گی۔" ساحل عمر نے کہا اور رشا ملوک کے ساتھ چل دیا جو اس کی منتظر تھی۔

وہ دونوں جب سیڑھیاں چڑھ کر مینار سے باہر نکلے تو رشا ملوک بڑے بے تابانہ لہجے میں بولی۔ "یہ کیا ہوگیا؟"

"کچھ نہیں ہوا...... تم پریشان کیوں ہو۔" ساحل عمر نے اسے تسلی دی۔ "یہ بتاؤ کہ اگلا جشن شادی کب ہے۔ ابھی کتنا وقت ہے؟"

"صرف ایک ماہ...... اگلے مہینے جشن شادی ہے۔ میں تو بہت خوش تھی کہ آپ بڑے صحیح وقت پر ہمارے علاقے میں آئے ہیں۔ سارے کام بھی بالکل ٹھیک انداز میں ہو رہے تھے کہ وہ منحوس راعین درمیان میں آ گیا۔"

"ابھی پورا ایک مہینہ ہے۔ ایک مہینہ بہت ہوتا ہے۔ تم جشن کی تیاری میں لگ جاؤ۔ اس دوران میں راعین سے نمٹ لیتا ہوں۔ تمہارے بابا کی مقدس تلوار تو میرے ہاتھ لگ ہی گئی پھر اب ڈرنا کیسا؟"

"یہ کام اتنا آسان نہیں ہے۔ آپ کی زندگی بھی خطرے میں پڑ سکتی ہے۔"

"موت اور زندگی تو اوپر والے کے ہاتھ میں ہے اگر اسی طرح لکھی ہے تو پھر مجھے کون بچا سکتا ہے۔"

"اگر آپ کو کچھ ہو گیا تو میں تو پاگل ہو جاؤں گی۔" وہ بے قرار ہو کر بولی۔

"اب پاگل نہیں ہو گیا؟" ساحل عمر نے ہنس کر کہا۔

"ہوں۔" رشا ملوک نے گہری نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ "آپ کے لئے پاگل ہوں۔ آپ کی دیوانی ہوں۔ آپ کے بن رہنا اب محال ہے۔"

"رشا ملوک مجھ پر بھی کچھ ایسی ہی گزرتی ہے۔ میرے بس میں ہو تو تمہیں ابھی یہاں سے اڑا کر لے جاؤں لیکن میرے بس میں کچھ نہیں ہے۔ مجھے تو اپنا احوال بھی معلوم نہیں ہے۔ بس ادھر ادھر سے اپنے بارے میں سنتا ہوں کہ میں یہ ہوں، میں وہ ہوں۔ کوئی بہت خاص چیز ہوں۔ اللہ جانے میں کیا ہوں؟"

"ہاں تو اس میں کیا شبہ ہے کہ آپ بہت خاص چیز ہیں۔ پھر سب سے بڑی بات رشا نے جس کو اپنا مور منتخب کرلیا وہ تو کوئی عام چیز ہو ہی نہیں سکتا۔"

اسی طرح باتیں کرتے ساحل عمر اپنے ٹھکانے پر پہنچ گیا۔ رشا ملوک اسے کمرے میں چھوڑ کر

واپس چلی گئی۔ اس کے جانے کے بعد وہ کمرے میں ٹہلنے لگا۔

☆......☆......☆

رشا ملوک ڈھونڈتی ہوئی بالآخر سمار ملوک کے ٹھکانے پر پہنچ گئی۔ سمار ملوک اپنے کتب خانے میں موجود تھا اور اس وقت وہ کتابوں کے ڈھیر میں دبا ہوا تھا۔ رشا ملوک کو دروازے پر دیکھ کر اس نے ایک نظر اس پر ڈالی اور پھر اپنے کام میں مشغول ہو گیا۔

رشا ملوک بہت خاموشی سے ایک کرسی کھینچ کر میز کے ایک کونے پر بیٹھ گئی اور اپنے باپ کو دیکھنے لگی۔

سمار ملوک کے سامنے بہت سی کتابیں کھلی پڑی تھیں۔ وہ مختلف کتابوں کو کھول کھول کر دیکھ رہا تھا۔ اس کے سامنے میز پر ایک چوڑا اور ڈیڑھ فٹ لمبا ایک شیشہ پڑا تھا۔ اس شیشے پر وہ ایک پر کے قلم سے لال روشنائی سے کچھ زائچے بنا رہا تھا۔ یہ شیشہ ان اعداد و شمار سے تقریباً بھرتا جا رہا تھا۔ سمار ملوک کتابیں پڑھ پڑھ کر لکیریں کھینچتا جا رہا تھا۔ وہ الجھن کا شکار تھا۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کا علم اس کا ساتھ نہیں دے رہا۔ وہ مایوس ہوتا جا رہا تھا۔

لیکن پھر جانے کیا ہوا؟ سمار ملوک ایک دم اچھل پڑا۔ اس نے خوشی سے نعرہ لگایا اور خوش ہو کر رشا ملوک کی طرف دیکھا اور بولا۔ ''اے رشا ملوک تیرا آنا اس وقت بڑا نیک شگون ثابت ہوا۔ بالآخر میں نے معلوم کر لیا کہ راعین کب جاگے گا' دیکھا تو نے کہ میرا علم کتنا سچا ہے۔''

''بابا مبارک ہو۔'' رشا ملوک کے چہرے پر خوشی برسنے لگی۔ ''میں جانتی ہوں کہ آپ کا علم بڑا سچا ہے' آپ کو کبھی دھوکا نہیں دیتا۔ کیا تاریخ نکلی ہے۔''

''ابھی پورا ایک ماہ ہے۔ ایک مہینے کے بعد رات کو بارہ بجے اس کا مدفن چٹخنا شروع ہو گا۔ بارہ بج کر پانچ منٹ پر وہ اٹھ کر بیٹھ جائے گا۔''

''اوہ بابا' یہ تو بڑی خطرناک تاریخ ہے۔'' رشا ملوک نے فوراً کہا۔

''کیوں؟'' سمار ملوک نے اسے سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔

''بابا آپ کو یاد نہیں کہ شادی کے جشن کی بھی یہی تاریخ ہے۔ بابا' یہ منحوس راعین آخر میرے پیچھے کیوں پڑ گیا ہے۔ میری خوشیوں کا قاتل؟''

''اے رشا ملوک...... ذرا صبر سے کام لے۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ اچھا میں چلتا ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ جلدی سے کھڑا ہو گیا۔

''اب کہاں جائیں گے...... یہ کون سا وقت ہے کہیں جانے کا۔'' رشا ملوک نے کہا۔

''بابا صاعق کی مختاری پر جانا ہے۔ وہ لوگ میرے منتظر ہوں گے۔'' پھر اس نے رشا ملوک کے جواب کا بھی انتظار نہ کیا۔ وہ فوراً ہی کمرے سے باہر نکل گیا۔

☆......☆......☆

پانچ گھوڑوں کی شاندار کناری بابا صاعق کی مختاری کے سامنے رکی تو بابا صاعق نے آگے بڑھ کر بستی کے رمز شناس سمار ملوک کا استقبال کیا۔ سمار ملوک نے بابا صاعق کا ہاتھ پکڑ کر اپنے سر پر رکھا

پھر اسی ہاتھ کو چوم لیا اور احترام کے ساتھ بولا۔ ''بابا کیسے ہیں؟''
''ٹھیک ہوں...... تم سناؤ...... اس وقت کیا مسئلہ درپیش آ گیا۔''
''ہنر مند آ گئے؟'' سمار ملوک نے سوال کیا۔
''ہاں' تینوں آ چکے ہیں۔ اندر بیٹھے ہیں۔''
''ٹھیک ہے بابا' پھر سب کے سامنے بیٹھ کر مسئلہ بیان کرتا ہوں۔ بابا بڑی خطرناک صورتحال پیدا ہو گئی ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ میرا علم کتنا سچا ہے' وہ مجھے کبھی دھوکا نہیں دیتا۔''
''میں جانتا ہوں...... تمہیں بھی جانتا ہوں اور تمہارے علم کو بھی جانتا ہوں۔''
''پھر آپ یہ بھی جانتے ہوں گے کہ میرے خواب کتنے سچے ہوتے ہیں۔''
''ہاں' میں تمہارے خوابوں سے بھی واقف ہوں...... اب آگے کہو۔''
''بابا آگے تو سب کے سامنے کہوں گا؟'' سمار ملوک بولا۔
''ٹھیک ہے۔''

پھر بابا صاعق سمار ملوک کو لے کر اپنے کمرے میں داخل ہوا تو انہیں دیکھتے ہی تینوں ہنر مند احتراماً اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ تینوں ہنر مندوں نے سمار ملوک کے صافے کو باری باری چھوا اور پھر سب نے اپنی اپنی نشستیں سنبھال لیں۔

اس کے بعد بستی کے پانچ بڑوں کا اجلاس شروع ہوا۔ یہ ایک اہم اجلاس تھا۔ اس لحاظ سے کہ اس میں بستی کے بہترین دماغ شامل تھے۔ اہم شخصیات کی شرکت نے اس اجلاس کو چار چاند لگا دیئے تھے۔

اجلاس کا آغاز کرتے ہوئے سمار ملوک گویا ہوا۔ ''بابا صاعق اور اس بستی کے ہنر مندو! میں نے آپ لوگوں کو آج ایک خاص مسئلے پر بات کرنے کیلئے زحمت دی ہے۔ ہماری یہ بستی اور دنیا تباہی کے دہانے پر کھڑی ہے۔ آج سے ٹھیک ایک ماہ بعد ہماری پرامن بستی میں وہ تباہی مچے گی کہ اس تباہی کو کوئی دیکھنے والا نہ بچے گا۔''

''اے رمز شناس...... یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟'' ایک ہنر مند بزبران بولا جو موسموں کا ماہر تھا اور محض آسمان کو دیکھ کر بتا دیا کرتا تھا کہ کتنی دیر بعد بارش شروع ہو جائے گی۔ برف باری کتنی ہو گی۔ طوفان اگر آئے گا تو اس کی رفتار کیا ہو گی۔

''اے بزبران...... میں جو کہہ رہا ہوں سچ کہہ رہا ہوں تو جانتا ہے کہ میں کتنے سچے خواب دیکھتا ہوں۔ میں تین دن سے ایک خواب دیکھ رہا تھا لیکن یہ خواب کہانی کا انجام ہے۔ میں پہلے وہ کہانی سناؤں گا جو میرے علم نے مجھے بتائی۔ اس کہانی کے سلسلے میں' میں نے بہت تحقیق کی۔ بڑی پرانی تحریریں چھان ماریں پھر جو کہانی ابھر کر آئی وہ میں آپ لوگوں کو سناتا ہوں۔

یہ کہہ کر سمار ملوک نے سو جادوگروں کی تیار کردہ کتاب سحر ''ربطول'' کا ذکر کیا۔ راعین اس کتاب کو کیسے لے اڑا۔ اس نے اس کتاب میں درج منتروں سے کس طرح مانا کی قوت حاصل کی پھر اس کتاب میں درج آخری قوت یعنی چار گھوڑے حاصل کرنے کیلئے خود کو کس طرح دفن کر لیا۔ ایک

وقت مقررہ پر جب وہ اپنے مدفن سے باہر آئے گا تو کتنا طاقتور ہو گا۔
سارملوک سنا رہا تھا اور وہ چاروں حیرت زدہ منہ پھاڑے سن رہے تھے۔ جب اس نے پوری کہانی سنا دی اور ساتھ میں اپنا خواب بھی سنا دیا اور یہ بھی بتا دیا کہ اس عفریت کو ختم کرنے والا بھی ہماری بستی میں آ پہنچا ہے تو ان کے چہرے پرسکون ہوئے۔

''اے رمز شناس...... اب یہ بات کہاں آ گئی ہے؟'' دوسرے ہنر مند بکوزان نے سوال کیا۔ وہ تعبیرات کا ماہر تھا۔ پہاڑ' ندی' نالے اس کے سامنے کوئی چیز نہ تھے۔ وہ پہاڑوں کے سینے چیر کر ان میں چھپے خزانے باہر نکال لیا کرتا تھا۔ دریاؤں کے رخ پھیر دیتا تھا۔

''راعین کا مدفن معلوم کرنا ہے؟'' سارملوک نے اصل مسئلہ پیش کیا۔

''اے رمز شناس' یہ کام تو آپ ہی بہتر طریقے پر کر سکتے ہیں یا پھر بابا صاعق سے اس معاملے میں مدد لی جا سکتی ہے۔'' بزبران بولا۔

''اے بزبران...... میرے علم نے یہاں تک رہنمائی کر دی ہے کہ راعین ہمارے علاقے میں ہی کہیں دفن ہے۔ اس سے آگے مجھے کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ اس کے مدفن کی نشاندہی کیلئے کوئی اور آگے بڑھے۔''

''اے رمز شناس...... میری سمجھ میں ایک بات نہیں آئی۔ راعین اپنے مدفن سے باہر نکلے گا تو وہ ہمارے لئے تباہ کن کیوں کر ثابت ہو گا۔ یہ چار گھوڑے کیا چیز ہیں؟'' اس مرتبہ تیسرا ہنر مند سناتن بولا۔ یہ چرند پرند کا شناسا تھا۔ پرندوں کا تو خیر کوئی مسئلہ نہ تھا درندے بھی اس کے سامنے کسی پالتو کتے کی طرح دم ہلاتے تھے۔

''اے سناتن تو نے اچھا سوال کیا۔ یہ سوال تو ہی کر سکتا تھا۔'' سارملوک نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''یہ چار گھوڑے تباہی کی علامت ہیں۔ تو یوں سمجھ کہ جس کے قبضے میں یہ چار گھوڑے آ جائیں اس کی طاقت کا کوئی اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔ ایک گھوڑا طوفان باد و باراں لا سکتا ہے۔ ایک گھوڑا زلزلے لانے کی طاقت رکھتا ہے۔ ایک گھوڑا قحط پیدا کر سکتا ہے۔ ایک گھوڑا عیاشی اور فحاشی بستیوں میں کسی وبا کی طرح پھیلا سکتا ہے۔ اب تو خیال کر کہ مانا کی قوت کے علاوہ جب یہ چار گھوڑے کسی کے طابع ہو جائیں تو پھر وہ اس دنیا میں' اس بستی میں کس طرح کی تباہی نہیں پھیلا سکتا۔ ایسے عفریت کا جاگنے سے پہلے ہی خاتمہ کر دینا بہتر ہے۔ اس فتنے کو اٹھنے سے پہلے ہی ملیامیٹ کر دینا ہے۔''

''اے رمز شناس' یہ تو بہت مشکل مرحلہ آن پھنسا۔ اس فتنے کے اٹھنے میں تیس روز باقی ہیں۔ ان تیس دنوں میں ہمیں اس کے ٹھکانے کا پتہ لگانا ہے۔'' اس مرتبہ بابا صاعق گویا ہوئے۔ ''یہاں اس وقت سب کے سب دانائی والے جمع ہیں۔ میں خود بھی کوشش کرتا ہوں۔ آپ لوگ بھی کوشش کرو کل پھر میری مختاری پر جمع ہو اور اپنی اپنی کوششوں کا احوال سناؤ۔ میں تہکال کو طلب کرتا ہوں۔ ہو سکتا ہے وہ راعین کے مدفن کی نشاندہی کر دے۔

بس پھر یہ اجلاس کل تک کیلئے ملتوی کر دیا گیا اور بستی کے یہ پانچوں عقل والے اپنے طور پر راعین کی کھوج میں لگ گئے۔

اگلے دن یہ اجلاس نہیں ہو سکا۔ اس لئے کہ اجلاس میں بتانے کے لئے کسی کے پاس کچھ نہ تھا۔ ایک دن میں بھلا راعین کے مدفن کی کھوج کس طرح ممکن تھی پانچوں دانا اپنی اپنی بساط کے مطابق کوششوں میں مصروف تھے۔ پھر یہ طے ہوا کہ ان پانچوں میں سے جو بھی پہلے راعین کے مدفن کا نشان پا لے وہ بابا صاعق کی مختاری کا رخ کرے۔ پھر یہ بابا صاعق کی ذمے داری ہو گی کہ وہ کس طرح سب کو اکٹھا کرتے ہیں۔

دوسرے دن پانچوں داناؤں نے اپنے اپنے طور پر کھوج کا آغاز کر دیا۔ بابا صاعق نے تہکال کو طلب کر لیا۔ انہوں نے تہکال کو اس کی زبان میں راعین کی کھوج کے بارے میں ہدایات دیں۔ اسے سمجھایا کہ اس نے کہاں کہاں جانا ہے۔ تہکال سر جھکائے مگر آنکھیں اٹھائے پچھلی دو ٹانگوں پر بیٹھا بابا صاعق کی باتیں بغور سن رہا تھا۔ جب انہوں نے اندازہ کر لیا کہ تہکال کی سمجھ میں کچھ نہ کچھ بات آ گئی ہے تو پھر انہوں نے بازغر کو اشارہ کیا۔

بازغر کمرے سے باہر گیا اور پھر جب وہ کچھ دیر کے بعد واپس آیا تو اس کے ہاتھوں میں لکڑی کا ایک چوڑا سا تختہ تھا۔ اس نے یہ تختہ بابا صاعق کے قدموں میں رکھ دیا۔ اس تختے پر برف کا ایک چھوٹا سا پہاڑ کھڑا تھا۔ یہ شفاف برف تھی لیکن سیمنٹ کی طرح سخت تھی۔ اس برف کے پہاڑ میں کافی نیچے ایک لکڑی کا گڈا دبا ہوا تھا یہ گڈا انسانی شکل سے مشابہ تھا۔ بابا صاعق نے اس پہاڑ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے تہکال کو سمجھایا پھر انہوں نے اشارہ کیا کہ وہ اس برف سے گڈے کو نکال لے۔ تہکال کیلئے کوئی ٹھوس چیز ٹھوس نہ تھی۔ جس طرح وہ میدانوں میں دوڑ سکتا تھا ویسے ہی ٹھوس پہاڑوں میں بلا تکلف چھلانگیں مار سکتا تھا۔

بابا صاعق کے اس مظاہرے سے وہ اتنا سمجھ گیا کہ کہیں پہاڑوں میں کوئی شخص دفن ہے اس کا کھوج لگانا ہے۔ تہکال فوراً اٹھا اور بابا صاعق کے قدموں میں کسی بلی کی طرح لوٹنے لگا۔ بابا صاعق کا ہاتھ چاٹا اور پھر تیزی سے اٹھ کھڑا ہوا۔

پھر اس نے آتش دان کی طرف چھلانگ لگائی اس کے بعد پتہ نہ چلا کہ وہ کدھر گیا۔

بابا صاعق کو امید تھی کہ تہکال دو تین گھنٹے میں پورا علاقہ چھان مارے گا اور کوئی نہ کوئی خبر لے کر لوٹے گا لیکن اس وقت تہکال کو گئے ہوئے چار گھنٹے سے زائد ہو چکے تھے۔ بابا صاعق اپنے کمرے میں بہت بے چینی سے ادھر ادھر ٹہل رہے تھے۔ ان کے چہرے پر پریشانی کے گہرے بادل چھائے تھے۔

پھر وہ ٹہلتے ٹہلتے ایک دم رک گئے۔ کوئی چیز ان کے قدموں میں اچانک آ گری تھی۔ اگر وہ ایک قدم بھی آگے بڑھاتے تو ان کا پیر اس چیز پر رکھا جاتا۔

اس چیز کو دیکھ کر بابا صاعق کی آنکھوں میں اندھیرا آ گیا۔ وہ سر پکڑ کر بیٹھ گئے۔

☆......☆......☆

یہ تہکال کی کٹی ہوئی دم تھی جو فرش پر پڑی ہوئی بن جل مچھلی کی طرح تڑپ رہی تھی۔ تہکال کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ وہ اس وقت کہاں تھا اور اس پر کیا بیتی تھی۔

یہ بات اپنی جگہ طے تھی کہ وہ کسی حادثے کا شکار ہو گیا تھا۔

بابا صاعق کو اب اپنی حماقت کا احساس ہو رہا تھا۔ انہیں جھکال کو راعین کی تلاش میں نہیں بھیجنا چاہئے تھا۔ یہ اس کی سطح کا کام نہ تھا۔ وہ بے چارہ تو رسم وفا نبھانے ان کے حکم کے مطابق راعین کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا تھا۔ لیکن بابا صاعق کو اس بات کا اندازہ نہیں ہو سکا تھا کہ وہ ایک خرگوش سے گینڈے کی تلاش کروا رہے ہیں۔

سردست تو اس تڑپتی ہوئی دم کا کچھ کرنا تھا۔ یہ جھکال کی پوری دم تھی جسے جڑ سے کاٹا گیا تھا یا اکھاڑا گیا تھا۔ اگر اس دم کو محفوظ نہ کیا گیا تو جھکال کے ملنے پر اسے نہیں لگایا جا سکے گا۔ جھکال دم کٹا رہ جائے گا۔

بابا صاعق نے فوراً بازغر کو اشارہ کیا۔ وہ اشارہ سمجھتے ہی فوراً باہر چلا گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں ایک بالٹی تھی۔ اس بالٹی میں سرخ رنگ کا تیل تھا۔ اس سرخ تیل سے چوتھائی بالٹی بھری ہوئی تھی۔ بازغر نے بالٹی بابا صاعق کے سامنے رکھ دی۔

بابا صاعق نے کچھ پڑھتے ہوئے جھکال کی دم اپنے ہاتھ میں پکڑ لی۔ دم پکڑتے ہی وہ ایک دم ساکت ہو گئی۔ انہوں نے اس دم کو آہستہ سے بالٹی میں ڈال دیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے سارا تیل دم نے پی لیا۔ تب بابا صاعق نے بازغر سے مخاطب ہو کر کہا۔ ”جھکال کی دم کو برف میں گڑھا کھود کر دبا دو۔“

”ٹھیک ہے بابا۔“ بازغر نے سعادت مندی سے کہا اور بالٹی لے کر باہر نکل گیا۔

☆......☆......☆

بستی کا رمز شناس سمارملوک اس وقت کھانا کھانے کے لئے بیٹھ رہا تھا جب اسے بابا صاعق کے آنے کی اطلاع ملی۔ وہ فوراً کھانا چھوڑ کر نیلا گنبد کی طرف چلا۔ نیلا گنبد مہمان خانہ تھا۔ اس ملاقات کے کمرے میں خاص لوگوں کو بلایا جاتا تھا۔ سمارملوک جب نیلا گنبد میں داخل ہوا تو بابا صاعق کو سر جھکائے بیٹھا دیکھا۔

بابا صاعق کو اس طرح بیٹھا دیکھ کر اس کا دل ڈوبنے لگا۔ وہ تیزی سے بابا صاعق کی طرف بڑھا۔ ان کے قریب بیٹھ کر سمارملوک نے بابا صاعق کا ہاتھ اپنے سر پر رکھا اور پھر وہی ہاتھ چوم کر جلدی سے بولا۔ ”بابا خیر تو ہے۔“

”اے رمز شناس خیر نہیں ہے۔“ یہ کہہ کر انہوں نے اپنا سر اٹھایا تو سمارملوک نے دیکھا کہ ان کی آنکھیں بھیگی ہوئی ہیں اور چہرے پر افسردگی چھائی ہوئی ہے۔

”بابا کیا ہوا؟ آپ کی آنکھوں میں آنسو۔“ سمارملوک نے ایک مرتبہ پھر ان کا ہاتھ پکڑ کر چوم لیا۔

”اے رمز شناس...... میرا جھکال مجھ سے بچھڑ گیا۔“ یہ کہتے ہوئے ان کا گلا رندھ گیا۔

”اوہ میرے خدا...... یہ کیا ہوا؟“ سمارملوک پر جیسے بجلی گری۔ ”وہ تو بستی کی رونق تھا۔ بچوں کا کھلونا۔ کوئی اس کی دم کھینچتا تھا تو کوئی اس کے کان مروڑتا تھا‘ کوئی بچہ اس کے اوپر چڑھ کر بیٹھ جاتا تھا۔ وہ تو کبھی کسی کو کچھ نہ کہتا تھا۔ اسے آخر ہوا کیا...... وہ ہم سے کیسے بچھڑ گیا؟“

''میں نے اسے راعین کی تلاش میں بھیجا تھا۔ وہ راعین کو تلاش کرتا کرتا خود گم ہو گیا۔ بس مجھ تک اس کی دم پہنچی ہے۔''

''اے رمز شناس مجھے بتاؤ میں کس طرح اپنے دل کو سمجھاؤں۔ میں کہاں جاؤں' کیا کروں؟'' بابا صاعق کی آواز بھرا گئی۔

''بابا آپ کہیں نہ جائیں' میرے پاس بیٹھیں۔ میرا دل اس سانحے کو قبول کرنے پر تیار نہیں۔ آپ تھوڑی دیر یہاں بیٹھیں۔ میں اپنے کمرے سے ہو کر آتا ہوں۔'' یہ کہہ کر سمار ملوک نیلا گنبد سے نکل گیا۔

سمار ملوک نے یہ خبر رشا ملوک کو سنائی اور اسے نیلا گنبد جانے کی ہدایت کی۔ رشا ملوک کیلئے یہ خبر بہت تکلیف دہ تھی۔ تہکال اس کا بہت چہیتا تھا۔ وہ گھنٹوں اس کے کمرے میں اس کے ساتھ بیٹھا رہتا تھا۔

رشا ملوک دوڑتی ہوئی نیلا گنبد میں داخل ہوئی اور دھم سے بابا صاعق کے قدموں میں جا گری۔ اس نے بابا کا ہاتھ چوما اور آنکھوں میں آنسو بھر کر بولی۔ ''میرے بابا نے مجھے بڑی اندوہناک خبر سنائی ہے۔ آپ کہہ دیں کہ یہ جھوٹ ہے۔''

''اے کاش...... یہ جھوٹ ہوتا۔'' بابا صاعق نے دل گرفتہ آواز میں کہا۔ ''میرا تہکال مجھ سے بچھڑ گیا۔ ہم سب کا تہکال ہم سے دور ہو گیا۔''

''میں اس بات پر یقین کرنے کو تیار نہیں ہوں۔ بابا گئے ہیں' اپنے کمرے میں زائچہ بنانے ابھی معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ کہاں ہے' کس حال میں ہے۔'' رشا ملوک نے تسلی دی۔

''اے رشا ملوک...... مجھ سے غلطی ہو گئی۔ مجھے راعین کی تلاش میں اسے نہیں بھیجنا چاہئے تھا۔'' لہجے میں پچھتاوا تھا۔

''بابا راعین تو ابھی خود مدفون ہے وہ کسی کو ابھی بھلا کیا نقصان پہنچا سکتا ہے۔ پھر ہمارا تہکال اس قدر آسانی سے مار کھانے والوں میں سے نہیں ہے۔'' رشا ملوک نے کہا۔

چند لمحوں بعد سمار ملوک نیلا گنبد میں داخل ہوا۔ رشا اور بابا صاعق نے بیک وقت اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔ اس کا منہ لٹکا ہوا تھا۔

''بابا آپ کا علم کیا کہتا ہے۔ جلدی بتائیں۔'' رشا ملوک نے بیتابی سے کہا۔

''میرے علم نے اندھیرے کے سوا کچھ نہیں دیا۔''

''اوہ اس کا مطلب ہے کہ گڑبڑ ہے۔ کوئی خطرناک صورتحال ہے۔''

''کچھ نہیں کہا جا سکتا۔'' سمار ملوک دکھی لہجے میں بولا۔ ''میں ابھی ہنر مندوں کو طلب کرتا ہوں۔ ہمیں تہکال کو تلاش کرنا ہو گا۔''

تب سمار ملوک نے فوراً اپنے ہرکارے بستی میں دوڑائے۔ جب وہ واپس آئے تو ان کی زبانی معلوم ہوا کہ بزبران اور بکوزان دونوں صبح سے ایک ساتھ نکلے ہوئے ہیں البتہ سناتن اپنے گنبد میں موجود تھا۔ اسے ہرکارہ اپنے ساتھ لے آیا۔

جب ساتن کو تہکال کے بارے میں یہ خبر سنائی تو وہ پریشان ہو گیا۔ تہکال سب کو پیارا تھا۔ ساتن تو ویسے بھی چرند پرند کا دلدادہ تھا۔

''اے ساتن! اب تو بتا...... کیا کریں۔'' سمارملوک نے اسے ساری بات بتا کر مشورہ طلب کیا۔

''میں اپنے گنبد واپس جاتا ہوں اور وہاں کچھ جانوروں کو اس کی تلاش میں بھیجتا ہوں۔ جیسے ہی مجھے کچھ پتہ چلے گا اے رمز شناس میں آپ کو اطلاع دوں گا۔'' یہ کہہ کر اس نے بابا صاعق کی طرف اجازت طلب نظروں سے دیکھا۔ ''کیوں بابا ٹھیک ہے نا۔''

''ہاں ساتن ٹھیک ہے۔ ذرا یہ کام ہوشیاری سے کرنا' اپنے قیمتی جانور نہ گنوا دینا۔'' بابا صاعق نے کہا۔

''صورتحال کی سنگینی کا مجھے اندازہ ہو گیا ہے۔ میں اب جدھر بھی بھیجوں گا جوڑے کی صورت میں روانہ کروں گا اور ہوشیار جانوروں کا انتخاب کروں گا۔ بابا...... آپ پریشان نہ ہوں میں تہکال کا کھوج نکال لوں گا۔ راعین کا بھی کچھ نہ کچھ ہو جائے گا۔'' یہ کہہ کر ساتن گنبد سے نکل گیا۔

☆......☆......☆

بزبران اور بکوزان دونوں بستی کے بڑے ہنر مندوں میں سے تھے۔ ایک کا ہاتھ موسم کی نبض پر ہوتا تھا تو دوسرے کی نظریں پہاڑوں کی بلندی پر۔ وہ دونوں آپس میں بہت اچھے دوست بھی تھے۔ اس لئے وہ دونوں ایک ساتھ ہی راعین کی تلاش میں نکلے تھے۔

دو دن میں انہوں نے خاصا علاقہ کھنگال لیا تھا لیکن راعین کے مدفن کے ابھی کوئی آثار نہ ملے تھے۔ وہ دونوں صبح کو گھوڑوں پر نکلتے دشوار گزار پہاڑی راستوں پر سفر کرتے۔ مدفن کے آثار ڈھونڈتے اور شام ڈھلتے ہی بستی کا رخ اختیار کر لیتے۔ ویسے ان کے پاس ایک علیحدہ گھوڑے پر زاد راہ بھی ہوتا تھا کہ اگر کہیں رات گزارنی پڑ جائے تو وہ آرام سے خیمہ لگا کر رات گزار لیں۔

آج بھی یہی ہوا کہ وہ دن بھر کی تلاش بسیار کے بعد شام ڈھلتے ہی بستی کی طرف چل پڑے تھے۔ واپس آ رہے تھے تو ان کی نظر کوہ ویراں پر پڑی اور یہ بات دونوں نے بیک وقت نوٹ کی۔ انہوں نے کوہ ویراں سے ایک مخصوص برف کا ایک تودہ کھسکتے دیکھا۔

بزبزان فوراً رک گیا اور اس تودے کو غور سے دیکھنے لگا۔ بکوزان بھی اس پر نظریں جمائے ہوئے تھا۔

''بکوزان دیکھا تم نے؟'' بزبزان نے پوچھا۔

''ہاں دیکھ رہا ہوں۔''

''میرا علم یہ کہتا ہے کہ یہ تودے گرنے کا موسم نہیں ہے پھر یہ برف کا چھوٹا سا پہاڑ کس لئے لڑھک رہا ہے۔''

''ہاں بزبزان تمہارا اندازہ بالکل صحیح ہے۔ مجھے یہ مصنوعی تودہ دکھائی دے رہا ہے۔ میرا مطلب ہے کہ یہ فطری تودہ ہرگز نہیں ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے کہیں سے برف ہٹائی جا رہی ہو۔''

''اوہ بکوزان اس کا مطلب ہے، میں نے جو بات محسوس کی وہی تم نے بھی کی۔'' بزبزان نے مسرت آمیز لہجے میں کہا۔ ''میرے خیال میں ہمیں یہیں ڈیرے ڈال لینا چاہئیں۔ کسی مناسب جگہ سے ہمیں کوہ ویراں کے اس حصے کی نگرانی کرنی چاہئے۔''

''آؤ، پھر اس چٹانی چھجے کے نیچے اپنا خیمہ لگا دیتے ہیں۔ یہاں ہمیں سات دن رہنا ہوگا تب جا کر صحیح صورتحال کا اندازہ ہوگا۔''

پھر دونوں نے مل کر ایک خیمہ چٹانی چھجے کے نیچے نصب کر لیا۔ یہ اتنا بڑا خیمہ تھا کہ اس میں دونوں بآسانی سما سکتے تھے۔ اگرچہ ایک دو دن کا خورد نوش کا سامان ان کے پاس موجود تھا لیکن انہوں نے سات دن رہنا تھا۔ طے یہ ہوا کہ بکوزان اس وقت بستی چلا جائے اور علی الصبح کھانے پینے کا سامان اور چند مختی اور خچر لے کر آ جائے اگر کوہ ویراں کا سفر کرنا پڑے تو کیا جا سکے۔

تب بکوزان صبح آنے کا وعدہ کر کے بزبران کو خیمے میں چھوڑ کر بستی کی طرف روانہ ہو گیا۔ اس نے اندھیرا گہرا ہونے سے پہلے بستی میں قدم رکھ دیئے۔ سناتن کا گنبد راستے میں پڑتا تھا۔ وہ اس کے گنبد کے سامنے سے گزرا تو سناتن اپنے گنبد کے چبوترے پر جو گنبد سے باہر بنا ہوا تھا اور جو ایک طرح سے ملاقاتیوں کے بیٹھنے کی جگہ تھی بیٹھا ہوا تھا۔

اسے دیکھ کر اپنے گھوڑے سے اتر پڑا۔ سناتن نے اس کا کھڑے ہو کر استقبال کیا اور پھر کے چبوترے پر جس پر ایک سرخ رنگ کا دبیز قالین بچھا ہوا تھا اس کا ہاتھ پکڑ کر بٹھا لیا۔

''اے سناتن کیسے ہو تم؟'' بکوزان نے پوچھا۔

''اے بکوزان تم دونوں کہا ہو؟''

''بھائی ہم دونوں اس فتنے کی تلاش میں نکلے ہوئے ہیں۔ بزبران کو کوہ ویراں والے راستے پر ایک جگہ چھوڑ آیا ہوں۔ دونوں کی محنت بالآخر رنگ لے آئی۔''

''ہیں...... تم لوگوں کے پاس کیا خوشخبری ہے۔''

''ابھی تو نہیں...... ایک ہفتے کے بعد شاید ہم بستی والوں کو کوئی خوشخبری دے سکیں۔''

''آج دوپہر کو رمز شناس نے بلوا لیا تھا۔ تم دونوں کو بھی بلوایا تھا مگر تم دونوں نکلے ہوئے تھے۔ میں رمز شناس کے محل پر پہنچا تو نیلے گنبد میں بابا صاعق بھی موجود تھے۔ وہاں ایک کربناک خبر سننے کو ملی۔''

''اے سناتن کیا ہوا؟ جلدی بتا۔''

''ہماری بستی کا لاڈلا ہم سے بچھڑ گیا۔''

''کیا کہتے ہو......؟ تہکال کی بات کرتے ہو؟''

''ہاں...... اسی کی بات کرتا ہوں۔ اسے بابا صاعق نے راعین کی تلاش میں بھیج دیا تھا۔''

''اے سناتن...... یہ تم نے بڑی بری خبر سنائی۔''

بکوزان پریشان ہو کر بولا۔ ''پھر اس کی تلاش میں کسی کو بھیجا گیا یا نہیں۔''

''ہاں، میں نے اپنے کئی کھوجی روانہ کئے ہیں۔'' سناتن نے بتایا۔

"اے سناتن...... یہ معاملہ کچھ اور ہی لگتا ہے۔ تم نے ہوشیار کھوجیوں کو روانہ کیا نا؟"

"ہاں دو باز بھیجے ہیں' دو لومڑیاں اور دو سانپ روانہ کیے ہیں۔"

"مگر دو دو کیوں؟"

"کہ اگر ایک کو نقصان پہنچ جائے تو دوسرا خبر لا سکے۔"

"یہ تم نے اچھا سوچا...... اچھا میں چلتا ہوں۔ علی الصبح مجھے بزبران کے پاس پہنچنا ہے۔ یہاں سے کچھ محنتی اور سامان خچروں پر لے جانا ہے۔ دعا کرنا ہم لوگ کامیاب ہو سکیں۔" بکوزان اٹھتا ہوا بولا۔

"ہاں بکوزان میں دعا کروں گا۔ تمہاری کامیابی بستی کی کامیابی ہے۔" سناتن نے پرخلوص لہجے میں کہا۔

بکوزان نے بستی کے دل میں پہنچ کر چار مضبوط محنتیوں' خچروں اور سامان خوردونوش کا انتظام کیا اور اطمینان سے اپنے گنبد چلا گیا۔

منہ اندھیرے وہ اپنے گنبد سے نکلا تو اپنے گنبد کے دروازے پر پورے قافلے کو اپنا منتظر پایا۔ وہ فوراً اچھل کر گھوڑے پر سوار ہو گیا اور اس کے پیچھے چار محنتی جو خچروں پر سوار تھے' دو خچر جن پر سامان لدا ہوا تھا۔ چلنے لگے۔

بکوزان وعدے کے مطابق بزبران کے پاس پہنچ گیا بلکہ کچھ جلدی ہی پہنچ گیا۔ ابھی سورج پہاڑوں کی اوٹ میں چھپا ہوا تھا۔ بکوزان محنتیوں کو سامان اتارنے اور خیمے لگانے کا اشارہ کر کے خود اپنا گھوڑا آگے بڑھاتا ہوا خیمے کے نزدیک آ گیا۔

بزبران ابھی تک بیدار نہیں ہوا تھا۔ شاید وہ رات دیر تک جاگتا رہا تھا۔ بکوزان گھوڑے سے اتر کر ایک نظر اس نے محنتیوں پر ڈالی۔ وہ اپنے کام پر لگ گئے تھے۔ بکوزان نے خیمے کے باہر ہی سے نعرہ لگایا۔

"اے بزبران...... تم تو سوئے پڑے ہو۔ اس طرح کوہ ویراں کی نگرانی کیا خاک ہو گی۔"

اندر سے اس کی بات کا کوئی جواب نہ آیا۔ پھر اس نے خیمے کا پردہ ہٹا کر اندر جھانکا۔ اگرچہ خیمے میں اندھیرا تھا لیکن اتنا نہیں کہ اس کی تیز نظریں یہ نہ دیکھ سکیں کہ بزبران خیمے میں نہیں ہے۔ پھر بھی وہ جلدی سے خیمے میں گھس گیا اور اس کا بستر اچھی طرح دیکھ لیا۔ اب یہ یقین کرنے کی کوئی وجہ نہیں تھی کہ بزبران بے خیمہ خالی ہے۔

اس یقین نے اس کے دل کی دھڑکن تیز کر دی۔ یہ کیا ہوا؟ پھر اس نے سوچا کہ ہو سکتا ہے کہ ضرورتاً ادھر ادھر گیا ہو۔ یہ سوچ کر وہ خیمے سے باہر آیا۔ محنتی اپنے کام میں مصروف تھے۔ بکوزان نے اس چٹانی چھجے سے نکل کر چاروں طرف دور تک نظر دوڑائی لیکن اسے بزبران کہیں نظر نہ آیا۔

سورج آہستہ آہستہ اپنا سر ابھار رہا تھا۔ روشنی تیزی سے پھیلتی جا رہی تھی۔ اور جوں جوں روشنی پھیلتی جا رہی تھی اس کے دل میں اندھیرا بڑھتا جا رہا تھا۔ ایک انجانا سا خوف اس کے جسم پر چھاتا چلا جا رہا تھا۔

اس نے میخیں گاڑتے محنتیوں کو آواز دے کر اپنے پاس بلایا اور انہیں بزبران کی تلاش میں چاروں طرف دوڑا دیا۔ محنتی خچروں پر سوار ہو کر بزبران کی تلاش میں نکل گئے۔

بکوزان گھوڑے کی پیٹھ پر بیٹھ کر ڈھلانوں پر نظریں دوڑانے لگا۔ اچانک اس کے سامنے سے ایک گدھ گزرا۔ اس گدھ کو دیکھ کر بکوزان کھٹک گیا۔ اس نے اڑتے گدھ کا اپنی نظروں سے تعاقب کیا۔ دور ایک پہاڑی پر وہ گدھ جا کر بیٹھ گیا۔ اسے اس پہاڑی پر اور کئی گدھ اڑتے ہوئے نظر آئے۔

اس پہاڑی کی طرف ابھی کوئی نہیں گیا تھا۔ بکوزان نے اپنا گھوڑا اس راستے پر ڈال دیا۔ وہ آدھے گھنٹے کے اندر اس پہاڑی پر پہنچ گیا۔ گھوڑے کو ایک جگہ چھوڑ کر تیزی سے پہاڑی پر چڑھنے لگا۔ جب وہ اوپر پہنچا تو ایک جان لیوا منظر اس کا منتظر تھا۔

ہاں وہ بزبران ہی تھا۔ اس کی آنکھیں کھلی تھیں اور جسم پتھر کا ہو چکا تھا۔ وہ مر چکا تھا۔ بکوزان نے یہ جاننے کے لئے کہ اس کی موت کس طرح واقع ہوئی ہے اس کے جسم کا اچھی طرح معائنہ کیا تو یہ بات سامنے آئی کہ کسی خونخوار جانور نے اس کا گلا چبا ڈالا تھا۔

بزبران کا یہ انجام دیکھ کر دکھ کی ایک لہر اوپر سے نیچے تک اس کے جسم میں دوڑ گئی۔ اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ بزبران اپنا خیمہ چھوڑ کر یہاں اس پہاڑی پر کس طرح پہنچا۔ وہ یہاں کیا کرنے آیا تھا۔ اگر یہ تصور کر لیا جائے کہ وہ یہاں سے کوہ ویراں کا نظارہ کرنے آیا تھا تو یہ اندازہ بھی غلط تھا کیونکہ یہاں سے کوہ ویراں نظر نہیں آ رہا تھا۔ درمیان میں ایک پہاڑی حائل ہو گئی تھی۔

بزبران کے اس پہاڑی تک آنے کا کوئی جواز نہ تھا۔ پھر یہی سوچا جا سکتا تھا کہ اسے خیمے سے اٹھا کر یہاں لایا گیا اور پھر کسی خونخوار جانور کے حوالے کر دیا گیا۔ علاقے میں ایسے خونخوار جانوروں کا کوئی وجود نہ تھا۔ اس طرح کا واقعہ بستی کے کسی شخص کے ساتھ آج تک پیش نہیں آیا تھا۔ بکوزان کا دماغ چکرا کر رہ گیا۔ ایک تو دوست کی موت کا صدمہ تھا' پھر اس دوست کے ساتھ جو کچھ ہوا تھا وہ چکرا دینے کیلئے کافی تھا۔ بکوزان نے اپنے بکھرتے ہوئے اعصاب کو مجتمع کیا۔ اس کے پتھر جسم کو وہیں چھوڑ کر وہ تیزی سے نیچے آیا' گھوڑے پر بیٹھا اور اپنے خیمے کی طرف چل دیا۔

ابھی وہ تھوڑا سا ہی آگے چلا تھا کہ اسے ایک محنتی نظر آ گیا۔ اس نے اسے فوراً ہدایت دی۔ وہ اس کی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے اپنے چاروں ساتھیوں کو اس پہاڑی پر لے آیا۔ سب نے مل کر بزبران کے پتھر جسم کو اتارا اور پھر اس جسم کو ایک خچر پر لاد کر واپسی کا سفر شروع کر دیا۔

بکوزان جب بزبران کا جسم لے کر بستی میں داخل ہوا تو پوری بستی میں ایک کہرام مچ گیا۔ بزبران کوئی معمولی شخص نہ تھا۔ وہ اس بستی کے ستونوں میں سے تھا۔ تین بڑے ہنرمندوں میں سے ایک تھا۔ موسم کی نبض پر ہر وقت اس کی انگلیاں رہتی تھیں۔ اب وہی انگلیاں پتھر کی ہو چکی تھیں۔ ریت کے مطابق یہ قافلہ رمز شناس سمار ملوک کے محل کے دروازے پر پہنچا۔ سمار ملوک کو جیسے ہی محل میں اطلاع ملی وہ فوراً باہر آ گیا۔ بابا صاعق کو بھی بلوا لیا گیا۔

بزبران کی لاش کو محل کے سامنے سرخ پتھر کے بنے چبوترے جس پر سبز قالین بچھا ہوا تھا رکھ دیا گیا۔ بابا صاعق اور سمار ملوک نے اس کی لاش کا معائنہ کیا۔ بکوزان کی طرح ان کی سمجھ میں بھی نہ آیا

تھی۔ کہ بزبران کو کس جانور نے ہلاک کیا۔ اس بستی میں اس نوعیت کی یہ پہلی ہلاکت تھی۔

رسم کے مطابق بزبران کے پتھر جسم کو سولہ گھوڑوں کی کناری پر رکھا گیا اور یہ گاڑی دھیرے دھیرے میدان فنا کی طرف چلنا شروع ہوئی۔ اس گاڑی کے پیچھے بابا صاعق اور رمز شناس سمارملوک چل رہے تھے۔ جب یہ گاڑی میدان فنا میں پہنچی تو اس بستی کی تمام عورتیں وہاں پہنچ چکی تھیں۔ اس ماتمی جلوس میں کوئی مرد شریک نہ تھا۔ علاوہ بابا صاعق اور رمز شناس کے۔

اجتماعی دعا کے بعد بابا صاعق نے دو بندوں کی مدد سے جو اسی کام کی غرض سے اس میدان میں موجود تھے بزبران کے پتھر جسم کو کھڑا کر دیا۔ پہلا پتھر بابا صاعق نے اس کے پیر کے پاس رکھا' پھر رمز شناس سمارملوک نے دوسرا پتھر دوسرے پیر کے پاس رکھا اور وہ دونوں دور ہٹ گئے۔

اس کے بعد ایک ایک عورت آتی گئی اور اس کے جسم کے ساتھ پتھر رکھتی گئی۔ کچھ ہی دیر میں بزبران کا پتھر جسم سینے تک پتھروں میں چھپ گیا۔ پتھر رکھنے کا سلسلہ ابھی تک جاری تھا۔

جب بستی کی تمام عورتوں نے اپنے اپنے حصے کا پتھر بزبران کی چٹان موت پر رکھ دیا تو بابا صاعق نے ان پتھروں پر مقدس پانی کا چھڑکاؤ کیا اور اس طرح یہ تدفین مکمل ہوئی۔ اس میدان فنا میں اس طرح کی بہت سی پتھر کی قبریں تھیں اور ان کے جسم اسی طرح سینے تک پتھروں سے ڈھکے کھڑے تھے۔ وقت گزرنے کے ساتھ یہ مردہ جسم سخت سے سخت ہوتے چلے جاتے تھے۔ ایک وقت آتا تھا کہ اگر ان کھڑی لاشوں پر بھاری ہتھوڑے برسائے جائیں تب بھی ان کا کچھ نہ بگڑے۔

میدان فنا بظاہر ایک قبرستان تھا لیکن اسے ہماری دنیا کا آدمی دیکھتا تو اسے یوں محسوس ہوتا جیسے کسی آرٹسٹ نے سینکڑوں مجسمے تراش دیئے ہوں۔ یہ بڑے انوکھے مجسمے تھے۔

خیر اس بستی کا ایک بڑا ہنر مند بزبران ابدی سفر پر روانہ ہو چکا تھا اور اس کی موت کے اسباب پر غور کرنے کیلئے بابا صاعق اور سمارملوک سر جوڑے بیٹھے تھے لیکن ان کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ وہ دونوں بار بار اپنا سر کھجا رہے تھے اور ایک دوسرے کو خالی نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔

ابھی تہکال کے بارے میں یہ طے نہیں ہو سکا تھا کہ اسے کس قسم کا حادثہ پیش آیا ہے۔ آیا وہ زندہ ہے یا زندگی کی بازی ہار چکا ہے۔ اگر اس کی موت واقع ہو چکی ہے تو اس کا ذمہ دار کون ہے؟ یہ کس کی مذموم حرکت ہے۔ اس بستی میں جرائم کی تعداد نہ ہونے کے برابر تھی۔ سب بھلے مانس لوگ بستے تھے۔ جو ایک دوسرے کے جذبات کا خیال رکھتے تھے۔ اور بستی کے قوانین پر سختی سے عمل کرتے تھے۔

رائین کی تلاش کے سلسلے میں دو کوششیں ناکام ہو چکی تھیں اور ان کوششوں کے نتائج انتہائی سنگین نکلے تھے۔ اب سناتن میدان میں تھا۔ اس نے اپنے کچھ شکاری میدان میں اتارے تھے۔ ان کا انتظار تھا کہ وہ کیا کر کے لوٹتے ہیں۔

بابا صاعق نے وہ پورا دن سمارملوک کے نیلے گنبد میں گزارا۔ رشاملوک دوپہر کا کھانا خود لے کر آئی۔ اس نے اپنی نگرانی میں ان دونوں کو کھانا کھلوایا۔

جب وہ دونوں کھانا کھا چکے تو سمارملوک کو ساحل عمر کا خیال آیا۔ اس نے فوراً پوچھا۔ ''رشا

ملوک اپنے مور کو بھی کھانا کھلایا۔"
"جی بابا' میں نے مویا کو بھیج دیا تھا کھانا لے کر۔" رشا ملوک نے بتایا۔"اب قہوہ لے کر میں خود جاؤں گی۔"
"اسے یہیں نہ بلوا لیں۔" سمار ملوک نے بابا صاعق سے پوچھا۔
"ہاں بلوا لو...... ہو سکتا ہے وہ ہم سے بہتر کوئی بات سوچ لے۔" بابا صاعق نے بڑی صاف گوئی سے کہا۔
"ٹھیک ہے...... میں جاؤں گی تو انہیں ساتھ لیتی آؤں گی۔ ویسے انہیں میں نے حالات سے باخبر رکھا ہوا ہے۔" رشا ملوک نے اپنے باپ سے مخاطب ہو کر کہا۔
"اچھا کیا تم نے۔" سمار ملوک نے اسے تعریفی نظروں سے دیکھا۔
کوئی ایک گھنٹے کے بعد ساحل عمر رشا ملوک کے ساتھ مہمان خانے میں آ پہنچا۔ اس نے باری باری دونوں داناؤں کا ہاتھ چوما اور بڑے ادب سے دوزانو ہو کر قالین پر بیٹھ گیا۔
تہکال کے اچانک غائب ہو جانے کا اسے بھی صدمہ تھا۔ اس نے اس کی تصویر بنائی تھی اور بہت دل لگا کر بنائی تھی۔ اس تصویر کے حوالے سے وہ اس کے بہت قریب تھا۔ پھر اس نے اسے چترو بھیل کے چنگل سے نکالا تھا۔ نہ صرف چترو بھیل کے شکنجے سے نکالا تھا بلکہ رشا ملوک سے ملاقات کا ذریعہ بھی بنا تھا۔ اس طرح تہکال کے بہت احسان تھے اس پر۔ وہ اس کا ایک طرح سے محسن تھا۔ اس کی گمشدگی اس کیلئے باعث تشویش تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ کسی طرح اس کی تلاش میں نکل جائے...... لیکن ابھی اسے بستی میں یا بستی سے باہر جانے کی اجازت نہیں مل رہی تھی۔
ویسے بابا صاعق تہکال کی زندگی کی طرف سے مایوس ہو چکے تھے۔ اگر تہکال اس دنیا میں نہیں رہا تھا تو پھر دو دنوں میں یہ دو اموات ہوئی تھیں اور ان اموات کے پیچھے کوئی گہری سازش کام کر رہی تھی۔
سوال یہ تھا کہ وہ کون تھے جو ان معصوم لوگوں کے پیچھے لگ گئے تھے۔ راعین تو ابھی اپنے مدفن میں تھا۔
سہ پہر کو سناتن کے آنے کی اطلاع ملی۔ اسے فوراً اندر بلوا لیا گیا۔ اور ساحل عمر سے کہا کہ وہ رشا ملوک کے ساتھ اندر چلا جائے۔ کسی مصلحت کی بنا پر ابھی وہ بستی والوں کے سامنے ساحل کی آمد ظاہر نہیں کرنا چاہتے تھے۔ ساحل عمر فوراً اٹھ کر رشا ملوک کے ساتھ اندر محل میں چلا گیا۔
سناتن کے چہرے پر اداسی چھائی ہوئی تھی۔ وہ خاموشی سے ان دونوں کے سامنے دوزانو ہو کر بیٹھ گیا۔
"اے سناتن! اس بستی کے بڑے ہنر مند کیا تو بھی ناکام ہو گیا۔" بابا صاعق نے اس کے چہرے پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔
"ناکام تو خیر میں نہیں ہوا لیکن کوئی اچھی خبر میرے پاس نہیں ہے۔" وہ اداس لہجے میں گویا ہوا۔

"جو کچھ کہنا ہے جلد کہہ اور صاف صاف کہہ۔" سمارملوک نے ذرا تیز لہجے میں کہا۔

"میں نے جھکال کی تلاش میں چھ شکاری روانہ کیے تھے۔ دو باز دو لومڑیاں اور دو سانپ...... ان میں سے صرف ایک باز واپس آیا ہے اور اس کا بھی ایک بازو زخمی ہے۔ شاید اس پر بھی کوئی افتاد پڑی ہے۔"

"اوہ...... یہ کیا ہو رہا ہے۔ ہماری بستی کس طوفان کی لپیٹ میں ہے۔" بابا صاعق نے آہ بھری۔

"ضرور ہم سے کوئی گناہ ہوئے ہیں کہ اوپر والے نے ہم پر آفتیں نازل کرنا شروع کر دی ہیں۔" سمارملوک نے کہا۔

"جھکال کے بارے میں کوئی خبر لایا ہے تیرا شکاری؟" بابا صاعق نے سوال کیا۔

"ہاں بابا...... لایا ہے۔" سناتن بولا۔

"جلد بتا...... جھکال زندہ تو ہے۔"

"کچھ کہا نہیں جا سکتا...... اس باز کے ساتھ جا کر دیکھنا ہوگا کہ وہ کس حال میں ہے۔"

"تجھے کیسے معلوم ہوا کہ وہ کہاں ہے؟"

"یہ بات میں نہیں جانتا کہ جھکال کہاں ہے؟ میں بس اتنا جانتا ہوں کہ وہ بستی کے باہر موجود ہے۔ میرا شکاری اس کے چند بال اپنی چونچ میں دبا کر لایا ہے۔"

"وہ بال کہاں ہیں کیا تو اپنے ساتھ لایا ہے۔"

"لایا ہوں۔" یہ کہہ کر سناتن نے جیب میں احتیاط سے رکھے ہوئے بال نکال کر بابا صاعق کے ہاتھ پر رکھ دیے۔

بابا صاعق نے ان بالوں کو غور سے دیکھا۔ وہ واقعی جھکال کے بال تھے۔ ان بالوں کو دیکھ کر بابا صاعق کی آنکھوں میں امید کی کرن جاگی۔ وہ ان بالوں کو پہچانتے ہوئے بولے۔ "ہاں یہ بال میرے جھکال کے ہیں...... اے سناتن تو دیر نہ کر فوراً اپنے شکاری کو لے کر بستی سے نکل جا...... تجھے جو چاہئے وہ میں مہیا کر دیتا ہوں۔"

"بابا مجھے کچھ نہیں چاہئے...... جو مجھے چاہئے اس کا انتظام میں خود کر لوں گا۔" سناتن اٹھتے ہوئے بولا۔ "اچھا میں جاتا ہوں۔ دعا کریں کہ جھکال تک پہنچ جاؤں۔"

"ہاں تو جا...... میں دعا کروں گا۔"

سناتن دونوں داناؤں کے ہاتھ چوم کر نیلے گنبد سے نکل گیا پھر اس نے اپنے ساتھ دو محنتی لئے۔ اپنے باز کو کندھے پر بٹھایا اور خود گھوڑے پر سوار ہو کر سوچنے لگا کہ کدھر جائے۔ اتنے میں باز اس کے کندھے سے ایک سمت اڑا اور تھوڑا دور جا کر واپس اس کے کندھے پر آ بیٹھا۔

اس باز نے سمت کا تعین کر دیا تھا۔ سناتن اس کی بتائی ہوئی سمت کی طرف چل پڑا۔ یہ سمت کوہ ویراں کی طرف اشارہ کر رہی تھی۔

کوہ ویراں کی اپنی کہانی تھی جو صدیوں سے چلی آ رہی تھی۔

کوئی نہیں جانتا تھا کہ کوہ ویراں کے اس طرف کیا ہے۔

اس بستی کے لوگوں نے ادھر جانا چھوڑ دیا تھا۔ اب تو کہانیاں ہی رہ گئی تھیں۔ کہانیاں جو بستی والے اپنے بزرگوں سے سنتے چلے آئے تھے۔ یہ کہانیاں سینہ بہ سینہ چلی آ رہی تھیں۔ کبھی بہت سالوں پہلے اس بستی کے چند سر پھرے نوجوانوں کے دل میں کوہ ویراں کے اس پار جانے کی خواہش نے شدت اختیار کی۔ وہ نوجوان یہ دیکھنے کیلئے کہ اس پار کیا ہے کوہ ویراں کی مہم پر نکل کھڑے ہوئے۔ وہ پانچ نوجوان تھے۔ وہ گئے تو پھر ان میں سے چار نوجوان واپس نہ آ سکے۔ کافی عرصے کے بعد ایک نوجوان خستہ حالت میں اپنی بستی میں پہنچا تو وہ کوہ ویراں کے بارے میں کچھ نہ بتا سکا کیونکہ اس کے منہ میں زبان موجود نہ تھی۔

یہ جاننے کیلئے کہ ان چاروں نوجوانوں کے ساتھ کیا ہوا وہ کہاں گم ہو گئے اور جو نوجوان واپس آیا اس کی زبان نکال کر کس نے اپنے پاس رکھ لی دو سر پھرے نوجوان اس مہم پر نکل کھڑے ہوئے۔

بستی والے ان نوجوانوں کا انتظار کرتے ہی رہ گئے۔ ایک طویل عرصہ گزر جانے کے باوجود ان دونوں سے کوئی واپس نہ پلٹا۔ ان دونوں جوانوں کے دو بھائی اور بستی میں موجود تھے۔ وہ اپنے گمشدہ بھائیوں کی محبت کے جنون میں مبتلا ہو کر بستی والوں کے منع کرنے کے باوجود کوہ ویراں کی مہم پر نکل کھڑے ہوئے۔ نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات۔ بستی والے ان کا بھی انتظار کرتے رہ گئے۔

پھر بستی کے ایک ہنر مند نے اپنے کچھ جانور کوہ ویراں کی مہم پر روانہ کئے۔ ان مہم جو جانوروں میں سے صرف ایک باز واپس آیا۔ اس باز کے پنجوں میں ایک نوجوان کے لباس کا ٹکڑا تھا۔ لباس کے اس ٹکڑے کو دیکھ کر اندازہ کر لیا گیا کہ وہ دونوں نوجوان کوہ ویراں کی نذر ہو گئے۔

تب اس وقت کے بستی کے رمز شناس نے پوری بستی میں منادی کرا دی کہ آئندہ بستی کا کوئی شخص کوہ ویراں کا رخ نہ کرے۔ اگر کسی کو کوہ ویراں کی مہم پر جانے کا بہت شوق ہو تو وہ ضرور جائے لیکن کوہ ویراں کے ادھر ہی رہے اس کے پیچھے جانے کی کوشش نہ کرے۔ اتنے لوگوں کی گمشدگی کے بعد اب اس بات کی اجازت نہیں دی جا سکتی کہ کوئی نوجوان خواہ مخواہ اپنی جان گنوانے کوہ ویراں کی مہم پر چلا جائے۔

اس اعلان کے باوجود ایک دو متجسس نوجوانوں نے خفیہ طور پر کوہ ویراں کا راز معلوم کرنے کیلئے سفر اختیار کیا مگر وہ یہ بتانے کیلئے کہ وہاں کیا ہے بستی میں واپس نہ آ سکے۔

پھر کوہ ویراں کے بارے میں نت نئے افسانے تراش لئے گئے۔ خوفناک کہانیاں گھڑ لی گئیں اور یہ کہانیاں سینہ بہ سینہ آج بھی ایک دوسرے کو سنائی جاتی ہیں۔

کوہ ویراں آج بھی ایک سربستہ راز ہے۔ اس بستی کے لوگ نہیں جانتے کہ کوہ ویراں کے پیچھے کیا ہے۔ لوگ ادھر جاتے ہیں تو وہاں سے واپس کیوں نہیں آتے۔ ان پر کیا بیتتی ہے۔ وہ کہاں کھو جاتے ہیں۔

جہاں بہت سی کہانیاں مشہور تھیں ان میں ایک کہانی یہ بھی تھی کہ کوہ ویراں کے پیچھے کالے

لوگوں کی بستی ہے۔ ایسے لوگ جن کی رگوں میں شیطان خون بن کر دوڑتا ہے۔ جو اچھائی کے دشمن ہیں۔ انسانیت کی دھجیاں بکھیر کر خوشی محسوس کرتے ہیں۔

یہ بات بالکل ٹھیک تھی۔ کوہ ویراں کے پیچھے شیطانوں کی بستی تھی۔ کالے اور برے لوگ آباد تھے۔ ایسے لوگ جو دوسروں کی زندگیوں میں زہر گھول کر خوش ہوتے تھے۔ یہ بستی اونچے اونچے پہاڑوں میں گھری تھی اور بہت گہرائی میں تھی۔ اتنی گہرائی میں کہ سورج محض ایک گھنٹے دکھائی دیتا تھا۔ یہ بستی دن میں بھی اندھیرے میں ڈوبی رہتی تھی۔ اندھیرے لوگ تھے اندھیرے میں رہ کر ہی خوش رہتے تھے۔ یہاں اتنی کثافت تھی کہ روشنی کا ایک گھنٹے میں بھی دم گھٹنے لگتا تھا۔ وہ اپنی جان چھڑا کر نکل جاتی تھی۔

سناتن اپنے باز کی رہنمائی میں آگے بڑھتا جا رہا تھا۔ وہ باز جس کا ایک بازو زخمی تھا اور وہ اونچی اور لمبی اڑان بھرنے سے قاصر تھا۔ چھوٹی چھوٹی اڑانیں بھر کر سناتن کی رہنمائی کرتا اور پھر اس کے کندھے پر آ بیٹھتا تھا۔ جب سناتن اس کے بتائے ہوئے راستے پر سفر کر لیتا تو پھر وہ اڑ کر اسے آگے کا راستہ دکھاتا۔ اس طرح آگے بڑھتے بڑھتے اندھیرا جھکنے لگا مگر منزل نہ آئی۔

جب گہرا اندھیرا چھا گیا اور آگے سفر کرنا ممکن نہ رہا تو سناتن نے ایک مناسب جگہ دیکھ کر پڑاؤ ڈال دیا۔ وہ اپنے ساتھ دو مخنثی لایا تھا۔ ان ماہر مخنثیوں نے آناً فاناً اس کے لئے خیمہ لگا دیا۔ کھانا تیار کر کے اس کے سامنے رکھ دیا اور پھر وہ دونوں اپنے خیمے میں چلے گئے۔

صبح کا اجالا پھوٹتے ہی سفر شروع ہو گیا۔ سناتن کے سامنے اب یہ بات واضح ہو کر آ گئی تھی۔ کہ اس کا باز اسے کوہ ویراں کی طرف لئے جا رہا تھا۔ وہ اس کے اشارے پر چلتا رہا کہ یہاں تک کوہ ویراں کی چڑھائی شروع ہو گئی۔ یہ پہاڑ زیادہ اونچا نہ تھا۔ پھر اس پر چڑھنا زیادہ مشکل نہ تھا۔ ڈھلائی راستے تھے۔ ان پر چل کر چوٹی پر پہنچا جا سکتا تھا لیکن یہ سفر گھوڑوں کے بس میں نہ تھا۔ لہٰذا گھوڑوں کو نیچے ایک مناسب جگہ پر چھوڑ دیا گیا اور سناتن دونوں مخنثیوں کے ساتھ اوپر چڑھنے لگا۔ باز اڑ اڑ کر ان کی رہنمائی کر رہا تھا۔

دوپہر تک سناتن کوہ ویراں کی چوٹی پر پہنچ گیا۔ باز اس کے کندھے پر موجود تھا۔ سناتن نے چوٹی پر کھڑے ہو کر جب نیچے نظر ڈالی تو اسے گہری کھائی کے سوا کچھ نظر نہ آیا۔ نیچے اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔ سناتن نے بھی کوہ ویراں کے بارے میں بہت کچھ سنا ہوا تھا لیکن اوپر پہنچ کر اسے احساس ہوا کہ یہ محض کہانیاں ہیں۔ اسے وہاں کچھ نظر نہ آیا۔

کوہ ویراں پر سمندر کے جھاگ جیسی برف جمی ہوئی تھی۔ یہ گلیشیر نیچے تک گئے تھے۔ درخت برف کے درمیان سے سر ابھارے کھڑے تھے۔ ڈھلان خطرناک تھے لیکن ان ڈھلانوں پر قدم جما کر نیچے پہنچا جا سکتا تھا۔

سناتن نے دور تک نظر دوڑائی لیکن اسے کہیں تھمکال نظر نہ آیا۔

سناتن نے اپنے کندھے پر بیٹھے باز کی پیٹھ پر تھپکی دی۔ ”ہاں بھئی...... اب کدھر؟“

باز فوراً اس کے کندھے سے اڑ گیا اور اڑتا ہوا نیچے ڈھلائی راستے کی طرف جانے لگا۔ کافی نیچے جانے کے بعد وہ ایک درختوں کے جھنڈ میں گھس گیا۔ پھر وہاں سے واپس اڑ کر اوپر آ گیا اور

سناتن کے کندھے پر اپنے پاؤں جما لئے اور اپنی چونچ کھول کر سناتن کے کان کی لو کو دبایا۔

''اچھا بھائی...... چلتا ہوں۔'' اس نے باز کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

پھر سناتن نے سنبھل سنبھل کر نیچے اترنا شروع کیا۔ محنتی بھی اس کے ساتھ نیچے اترنے لگے۔

دونوں محنتی نیچے جانے سے ڈر رہے تھے لیکن سناتن کے سامنے انکار کی جرأت نہ تھی۔ وہ دونوں بہت دھیرے دھیرے نیچے اتر رہے تھے۔ سناتن اور ان کے درمیان فاصلہ بڑھتا جا رہا تھا۔

پھر ایک وقت آیا کہ سناتن فاصلہ طے کرتا ہوا ایک پہاڑی کی اوٹ میں چلا گیا۔ دونوں محنتیوں نے ایک دوسرے کو دیکھا اور آنکھوں ہی آنکھوں میں طے کیا کہ واپس چلے جانا چاہئے کہ سناتن پہاڑی کی اوٹ سے نکل کر واپس آیا اور غصے سے بولا۔ ''کیا کرتے ہو' جلدی نیچے آؤ۔''

''آتے ہیں ہنر مند...... آتے ہیں۔'' وہ دونوں محنتی بیک وقت بولے اور گھبرا کر جلدی جلدی نیچے اترنے لگے۔

گھبراہٹ میں ایک کا پاؤں پھسلا' اس نے خود کو پھسلنے سے بچانے کیلئے دوسرے محنتی کا پاؤں پکڑنا چاہا۔ وہ اپنا توازن قائم نہ رکھ سکا۔ اس کے پاؤں اکھڑ گئے۔ اب دونوں محنتی ڈھلان پر لڑھکنے لگے۔

پھر نہ جانے کیسے ان کے ہاتھ درختوں سے لپٹ گئے۔ دونوں نے ان درختوں کو مضبوطی سے تھام لیا اور اپنی خوش قسمتی پر ناز کرنے لگے جب انہوں نے اوپر نظریں اٹھا کر دیکھا کہ وہ کس درخت سے لپٹے ہوئے ہیں تو وہ دونوں ان درختوں کی صورت دیکھ کر اپنے ہوش گنوا بیٹھے۔

☆......☆......☆

وہ درخت نہ تھے۔ برفانی ریچھ تھے۔ لحیم شحیم اور تناور...... وہ دونوں ریچھ برابر برابر کھڑے تھے۔ وہ سفید رنگ کے تھے جبکہ ان کے منہ کالے تھے۔ یہ گوشت خور ریچھ تھے۔ ان دونوں خونخوار ریچھوں نے چند لمحوں میں دونوں مختیوں کو چیر پھاڑ کر رکھ دیا۔ انہوں نے پیٹ پھاڑ کر دونوں کی آنتیں باہر نکال دیں۔ دونوں مختیوں نے آخری چیخ ماری پھر ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گئے۔

سناتن جو آگے جا چکا تھا۔ وہ ان کے لڑھکنے کے شور پر پہاڑی کی اوٹ سے دوبارہ واپس آیا تو اس نے ان دونوں کو تیزی سے نیچے جاتے دیکھا۔ وہ ان کے راستے میں آ کر انہیں روکنا چاہتا تھا لیکن جانتا تھا کہ وہ اتنی تیزی سے لڑھک رہے ہیں کہ وہ انہیں روکنے کی بجائے خود بھی ان کے ساتھ لڑھکنا شروع ہو جائے گا۔ اس لئے وہ ان کے سامنے آنے سے باز رہا۔

پھر سناتن نے ان دونوں کو کافی نیچے ریچھوں کے پیروں سے لپٹ کر رکتے دیکھا اور پھر چند لمحوں میں ہی ریچھوں نے دونوں مختیوں کا حشر کر کے رکھ دیا۔ سناتن نے ان کی آخری چیخیں سنیں۔ انہیں ادھڑتے دیکھا تو اسے اپنے ہوش اڑتے ہوئے محسوس ہوئے۔ اب اس کے علاوہ کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ آگے جانے کے بجائے پلٹ کر اوپر بھاگے۔

اس نے اپنے کندھے پر سوار باز کو اوپر واپس جانے کا اشارہ کیا۔ باز فوراً اڑ گیا۔ سناتن نے اس کے اڑتے ہی تیزی سے اوپر کی طرف چڑھنا شروع کیا۔ وہ پتھروں اور درختوں کی شاخوں کا سہارا لے کر چڑھنے لگا۔

تھوڑا سا اوپر چڑھ کر اس نے پلٹ کر نیچے دیکھا۔ وہ دونوں ریچھ اپنے اردگرد سے بے نیاز ان دونوں مختیوں کی لاشوں سے لپٹے ہوئے تھے۔ ویسے بھی وہ دونوں ریچھ اتنے نیچے تھے کہ انہیں اوپر آنے میں وقت لگتا۔ اتنی دیر میں سناتن کو امید تھی کہ وہ ان کی پہنچ سے دور نکل جائے گا۔ تازہ صورت حال میں تو اسے اور مہلت مل گئی تھی۔ پھر بھی اس نے غفلت سے کام نہ لیا۔ وہ کسی بندر کی طرح اچھلتا' چھلانگیں لگاتا بڑی مستعدی اور پھرتی سے اوپر چلا آ رہا تھا۔ پھر وہ جلد ہی اوپر چوٹی پر پہنچ گیا۔ وہ بہت خوش تھا کہ اس کی جان بچ گئی تھی۔ وہ موت کی وادی سے بخیریت اوپر پہنچ گیا تھا۔ وہ چوٹی پر ہاتھ پاؤں پھیلائے لمبے لمبے سانس لے رہا تھا۔ اس نے چوٹی سے نیچے دیکھا۔ اسے کچھ نہ دکھائی دیا۔ نیچے اندھیرا تھا۔ وہ دونوں ریچھ درختوں اور چٹانوں کے پیچھے کہیں چھپ گئے تھے۔

ایک دم اسے ایک چیخ سنائی دی۔ یہ اس کے باز کی چیخ تھی جو اسے خطرے سے آگاہ کر

رہی تھی۔ سناتن نے گردن گھما کر باز کو دیکھنا چاہا کہ وہ کہاں ہے اور کس قسم کا خطرہ لاحق ہے کہ پیچھے سے دو کالے ہاتھ اس کے گلے میں آئے اور پھر تیز دانتوں نے آناً فاناً اس کی گردن ادھیڑ دی۔ سناتن یہ بھی نہ دیکھ پایا کہ اس پر حملہ کرنے والا کون ہے۔ اب وہ تیزی سے برف پر پھسلتا جا رہا تھا۔ اس کی گردن میں جیسے آگ لگی تھی۔ اس پر غشی طاری ہوتی جا رہی تھی۔ پھر وہ پھسلتے پھسلتے جہاں رکا۔ وہاں اس کا گھوڑا موجود تھا۔ سناتن اپنے گھوڑے کی گردن سے جھول کر کسی طرح اس کی پیٹھ پر سوار ہو گیا اور اس نے اپنے دونوں ہاتھوں سے گھوڑے کی گردن پکڑ لی۔ چند لمحوں بعد باز بھی گھوڑے کی پیٹھ پر آ بیٹھا۔ تب وہ گھوڑا سنبھل سنبھل کر مگر تیزی سے نیچے اترنے لگا۔

☆......☆......☆

جب وہ گھوڑا سناتن کو اپنی پیٹھ پر لادے تھکن سے چور، شام ڈھلے بستی میں داخل ہوا تو سب سے پہلے بکوزان کی اس پر نظر پڑی۔ وہ اپنی کٹاری میں کہیں باہر کا چکر لگا کر بستی میں داخل ہو رہا تھا۔ جب وہ اس گھوڑے کے پاس سے گزرا اور اس نے گھوڑے کی پیٹھ پر کسی کو بے سدھ لپٹا ہوا دیکھا تو وہ اپنی کٹاری روک کر گھوڑے کی طرف بھاگا۔ جب اس نے گھوڑے پر لدے شخص کی صورت دیکھی تو اس کے دل میں سناٹا اتر گیا۔

ایک اور موت!

ابھی تو بزبران کا غم ہلکا نہ ہوا تھا کہ بستی کے ایک اور اہم ستون کی لاش آ گئی۔ بکوزان نے سناتن کی لاش جو اب پتھر ہو چکی تھی، گھوڑے کی پیٹھ سے اٹھا کر اپنی کٹاری میں ڈالی اور رمز شناس کے محل کی طرف روانہ ہو گیا۔

بستی ایک مرتبہ پھر غم کی لپیٹ میں آ گئی۔ جس جس کو خبر ہوتی گئی وہ بکوزان کی کٹاری کے ساتھ ہوتا گیا۔ بکوزان نے سناتن کی پتھر لاش کو دوسروں کی مدد سے رمز شناس کے محل کے سامنے بنے چبوترے پر رکھ دیا۔ رمز شناس سمار ملوک فوراً ہی محل سے باہر نکل آیا۔ بابا صاعق کو بھی وہاں پہنچتے دیر نہ لگی۔

دونوں نے مل کر سناتن کی لاش کا معائنہ کیا۔ اس کی گردن کا بھی وہی حال تھا جو بزبران کی گردن کا تھا۔ کسی وحشی جانور نے اس کا نرخرہ چبا ڈالا تھا۔

''یہ کیا ہو رہا ہے؟...... ہماری بستی کے امن کو کس کی نظر کھا گئی۔'' بابا صاعق کے لہجے میں اداسی تھی۔

''ابھی تو وہ بدبخت اپنے مدفن میں موجود ہے اس پر اس نے لاشوں کے انبار لگا دیئے ہیں۔ کہیں وہ اپنے مدفن سے نکل آیا تو جانے کیا ہو۔ کیسی تباہی پھیلے۔'' سمار ملوک نے الجھے ہوئے انداز میں کہا۔

''سناتن کے پانچ جانور ہلاک...... ہمارے دو ہنرمند بزبران اور سناتن اور دو محنتی...... ان سب کی زندگیاں چھین لی گئیں اور ہم کچھ نہیں کر سکے۔ ابھی تو اس کے مدفن کے علاقے کا تعین بھی نہیں ہو سکا، مدفن کا پتہ چلانا تو دور کی بات ہے۔'' بابا صاعق فکر میں ڈوبے بول رہے تھے۔

"اے بابا...... تعین تو ہو گیا ہے۔ میں اب یقین سے یہ بات کہہ سکتا ہوں کہ راعین کا مدفن کوہ ویراں پر کسی جگہ ہے۔ ہو سکتا ہے یہ مدفن کوہ ویراں کے اس طرف ہو۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ہماری طرف ہو لیکن یہ بات یقینی ہے کہ وہ منحوس کوہ ویراں پر کسی جگہ دفن ہے۔" بکوزان نے بڑے یقین سے کہا۔

"اب کوہ ویراں پر کون جائے گا...... وہاں تو پہلے ہی جانا مشکل تھا۔ ان نئے واقعات کے بعد اب میں کس سے کہوں کہ کوہ ویراں کا سفر کر...... میں بستی کا رمز شناس ہوں۔ میں کسی کو جان بوجھ کر موت کے منہ میں نہیں دھکیل سکتا۔" سارملوک نے افسردگی سے کہا۔

"اے رمز شناس آپ فکر نہ کریں...... بکوزان کوہ ویراں کا سفر کرے گا۔" بکوزان نے بڑے پر جوش انداز میں کہا۔

"نہیں بکوزان...... میں تجھے وہاں اکیلا جانے کی اجازت نہیں دے سکتا۔"

"اے رمز شناس میں اکیلا نہیں جاؤں گا...... پوری تیاری سے جاؤں گا۔ میرے ساتھ کم از کم تیس نوجوانوں کا قافلہ ہوگا۔ اب تک تو یہ ہوا ہے کہ جو گیا ہے اس کے بارے میں کچھ نہیں معلوم ہو سکا کہ اس پر کیا بیتی لیکن اب ایسا نہیں ہوگا۔ ہم میں سے کوئی تو زندہ بچے گا۔ وہ آ کر پوری روا داد سنائے گا۔ اس طرح بستی کے رمز شناس آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ وہاں ہم پر کیا بیتی؟"

"ایسی بدفال منہ سے کیوں نکالتا ہے۔ یہ کیوں نہیں کہتا کہ تو جائے گا اس مرتبہ راعین کے مدفن کا کھوج لگا کر آئے گا۔" سارملوک نے اسے ڈانٹ پلائی۔

"ہاں، رمز شناس! ایسا بھی ہو سکتا ہے۔"

"ایسا ہی ہوگا۔" اس مرتبہ بابا صاعق نے زور دے کر کہا۔

رات ہو چکی تھی اس لئے اس وقت فوری تدفین ممکن نہ تھی۔ یہ کام صبح کے لئے چھوڑ دیا گیا۔

صبح تدفین کے بعد میدان فنا میں جمع ہونے والی خواتین سے بستی کے رمز شناس سارملوک نے بڑا جذباتی خطاب کیا۔ اس نے راعین کے بارے میں پوری کہانی سنائی۔ اس نے پھر یہ بتایا کہ اس بدبخت کی تلاش میں ہمارا کتنا جانی نقصان ہو چکا ہے۔ نیز یہ کہ اس کے بارے میں صحیح معلومات حاصل نہیں ہو سکی ہیں۔ آخر میں وہ بستی کی خواتین سے مخاطب ہو کر بولا۔ "اس بستی کی معزز عورتو! اب کچھ قربانی دینے وقت آ گیا ہے۔ بکوزان کو اس مہم کو سر کرنے کے لئے بستی کے تیس نوجوانوں کی ضرورت ہے۔ تم اپنے بیٹے یا بھائی بھتیجے کو اس مہم میں بھیجنا چاہو تو اسے زاد راہ کے ساتھ بابا صاعق کی مختاری پر بھیج دو۔ بعد دوپہر یہ قافلہ اپنی مہم پر روانہ ہو جائے گا۔"

بستی کے رمز شناس کی بات سب عورتوں نے بڑی توجہ سے سنی۔ اس کی بات سنتے ہی بستی کی عورتوں میں کھلبلی مچ گئی۔ وہ سناتن کی قبر پر پھر نچھاور کرتی اپنے اپنے گھروں کو روانہ ہو گئیں۔

دوپہر کو بابا صاعق بکوزان کے ساتھ اپنی مختاری سے باہر آئے تو انہوں نے اپنی مختاری کے احاطے میں تیس کے بجائے سو نوجوانوں کو سفر کیلئے تیار پایا۔

اپنی بستی کے نوجوانوں کا جوش دیکھ کر بابا صاعق کی گردن فخر سے بلند ہو گئی۔ جس بستی میں ایسے جان نچھاور کرنے والے نوجوان ہوں' اس بستی کا بھلا کوئی کیا بگاڑ سکتا ہے۔

بکوزان جس مہم پر جانے والا تھا اس کے بارے میں وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ وہاں کس قدر خطرہ تھا۔ وہ تیس سے زائد نوجوانوں کو لے جا کر خواہ مخواہ ان کی ہلاکت کا باعث بننا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے ان نوجوانوں میں سے تیس کو منتخب کر لیا۔ جن نوجوانوں کا انتخاب نہ ہو سکا وہ بڑے مایوسانہ انداز میں مختاری کے احاطے سے نکل گئے۔ بکوزان نے ان تیس منتخب نوجوانوں کو سفر کی مشکلات اور حالات کے خطرات سے اچھی طرح آگاہ کیا اور آخر میں کہا۔ ''اب کوئی نوجوان اس مہم سے دستبردار ہونا چاہے تو خوشی سے ہو سکتا ہے۔ اسے کچھ نہیں کہا جائے گا۔''

لیکن کسی نوجوان نے جانے سے انکار نہ کیا۔

دوپہر کے بعد بستی کا رمز شناس' بابا صاعق کی مختاری آ پہنچا۔ اس کی آمد کے بعد مہم جوؤں کا یہ قافلہ کوہ ویراں کی طرف روانہ ہوا۔ بابا صاعق نے ان کی کامیابی کی دعا کی۔ رمز شناس سار ملوک نے رخصت ہوتے وقت ہر نوجوان کی پیٹھ تھپکی۔ ''جاؤ اور خوشخبری لے کر آؤ۔''

بکوزان تیس نوجوانوں کو جو ہر طرح سے لیس تھے' جب اپنے ساتھ لے کر چلا تو اس کے دل میں متضاد قسم کے جذبات پیدا ہو رہے تھے۔ کبھی وہ نا امیدی کے گھٹاٹوپ اندھیرے میں ڈوب جاتا' کبھی کامیابی کے چراغ اس کے دل کی فصیلیں روشن کر دیتے۔ بہر حال وہ تذبذب کے عالم میں بستی سے نکلا اور اس نے منہ سے ایک عجیب سی آواز نکالی۔ پھر اس کا گھوڑا ہموار راستے پر سرپٹ دوڑنے لگا۔ اس کی تقلید میں تیس نوجوان گھڑ سواروں نے اپنے اپنے گھوڑوں کو ایڑ لگائی اور پھر وہ چند ثانیوں کے بعد ہی ہوا سے باتیں کرنے لگے۔

رشا ملوک بستی کے باہر اپنی شاہی کٹاری میں بیٹھی پردہ ہٹائے نوجوانوں کے قافلے کو اس وقت تک دیکھتی رہی جب تک وہ پورا قافلہ اس کی آنکھوں سے اوجھل نہ ہو گیا۔

جب نوجوانوں کو یہ معلوم ہوا کہ رمز شناس کی بیٹی رشا ملوک انہیں رخصت کرنے بستی کے باہر تک جا رہی ہے تو ان کا جوش دوچند ہو گیا۔ وہ بار بار پیچھے مڑ کر دیکھ رہے تھے۔ رشا ملوک اپنی بند کٹاری میں تھوڑا سے پردہ ہٹائے ان نوجوانوں کو دیکھتی جا رہی تھی لیکن کسی نوجوان کا اسے دیکھ لینا ممکن نہ تھا۔

رشا ملوک کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ وہ ابھی تک یہ طے نہیں کر پائی کہ اس نے جو کچھ کیا تھا ٹھیک کیا تھا یا اپنے ہاتھوں اپنی بدقسمتی کو دعوت دے دی تھی۔

لیکن وہ کیا کرتی۔ وہ ایسا کرنے پر مجبور تھی۔

ساحل عمر کو جب یہ معلوم ہوا کہ سناتن بھی لاش کی صورت میں بستی میں واپس آ گیا ہے تو اس نے رشا ملوک سے بات کی۔ ''رشا اس مہم پر میں جانا چاہتا ہوں۔''

''آپ تو بستی میں نہیں جا سکتے' آپ مہم پر جانے کی بات کرتے ہیں؟'' رشا ملوک نے سختی سے منع کر دیا۔

ساحل عمر اپنا من مار کر رہ گیا۔ وہ اصل میں بند کمرے میں رہتے رہتے پریشان ہو گیا تھا۔ اب باہر نکلنا چاہتا تھا۔ پھر اسے جانے یہ یقین سا کیوں تھا کہ اس بستی کا کوئی شخص راعین کا مدفن تلاش نہیں کر سکتا' وہ کر سکتا تھا۔

رشا ملوک کے منع کرنے پر اس نے خاموشی اختیار کر لی۔ پھر دوسرے دن مویا نے اسے اطلاع دی کہ بکوزان کی قیادت میں تیس نوجوانوں کا قافلہ راعین کی تلاش میں جا رہا ہے۔ یہ سن کر وہ مچل اٹھا۔ اس نے مویا سے کہا کہ اس قافلے میں شامل ہونے کی وہ کوئی ترکیب بتائے۔ تب مویا نے اس کا اصرار دیکھ کر ایک ترکیب بتادی اور تاکید کر دی کہ وہ اس سلسلے میں اس کا نام نہ لے۔

مویا کے جانے کے بعد جب رشا ملوک اس کے لئے قہوہ لے کر آئی تو اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ رشا ملوک کے سر پر دھیرے سے ہاتھ رکھ دیا اور بولا۔ "اے رشا ملوک تجھے اپنے مور کی قسم...... اگر تو مجھے مہم پر نہ بھیجے تو میرا مرا منہ دیکھے۔"

یہ سن کر رشا ملوک ایک دم سناٹے میں آ گئی۔ یہ ساحل عمر نے کیا کر دیا تھا۔ اس نے کیا کہہ دیا تھا۔ کیسی قسم دے دی تھی۔ وہ اب مجبور ہو گئی تھی۔ اس بستی کی ریت کے مطابق اگر وہ ساحل عمر کو اس مہم پر نہ بھجواتی تو قسم پوری نہ کرنے کی پاداش میں ضرور اس کا مرا منہ دیکھتی۔

یہ ایک بہت خطرناک بات تھی۔ سنگین مسئلہ تھا۔ اس کا کوئی بھی خوفناک نتیجہ نکل سکتا تھا لیکن اب کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ اس سلسلے میں وہ اپنے باپ سے بھی اجازت نہیں لے سکتی تھی کیونکہ وہ یہ بات اچھی طرح جانتی تھی کہ وہ کسی قیمت پر اسے اس مہم پر جانے کی اجازت نہ دیں گے۔ اس طرح اس کی قسم ادھوری رہ جائے گی اور یوں وہ اپنے مور سے ہاتھ دھو بیٹھے گی۔

تب رشا ملوک نے بازغر کو اپنا ہم راز بنایا۔ اس نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے سر پر رکھ کر قسم دی کہ وہ اس راز کو کسی قیمت پر فاش نہیں کرے گا۔ اس قسم کے بعد وہ بھی مجبور ہو گیا اور اس نے وہ کر دیا جو رشا ملوک چاہتی تھی۔ بازغر نے ساحل عمر کو ہر وہ چیز مہیا کر دی جس کی سفر کے لئے ضرورت تھی۔ پھر تیس نوجوانوں کے قافلے میں اکتیسویں نوجوان کی شمولیت کوئی ایسا مشکل کام نہ تھا۔ جب یہ قافلہ بستی سے نکلا تو ساحل عمر ایک چٹان کی اوٹ سے نکل کر ان میں شامل ہو گیا۔ سارے نوجوانوں کے لباس یکساں تھے ان میں ساحل عمر کو الگ کرنا آسان نہ تھا۔ پھر چہرے پر ہر نوجوان نے ایک خاص قسم کا کنٹوپ پہنا ہوا تھا۔ اس اونی کنٹوپ کی وجہ سے سر' چہرہ اور گردن بھی چھپ گئی تھی۔ صرف آنکھیں دکھائی دے رہی تھیں۔

قافلہ روانہ ہوا تو ساحل عمر جو سب سے آخر میں تھا' اس نے مڑ کر رشا ملوک کی کٹاری کی طرف دیکھا۔ رشا ملوک نے اپنا نازک ہاتھ باہر نکال کر لہرایا اور پھر فوراً ہی اپنا ہاتھ اندر کر لیا اور وہ اس قافلے کو اس وقت تک دیکھتی رہی جب تک ساحل عمر اس کی آنکھوں سے اوجھل نہ ہو گیا۔

قافلے کے جانے کے بعد بازغر اچھل کر کٹاری پر بیٹھا۔ اس نے پانچ گھوڑوں کی اس شاہی کٹاری کی باگیں سنبھالیں اور پیچھے مڑ کر بولا۔ "اے رشا ملوک...... کیا اب چلیں؟"

"ہاں بازغر چلو...... دعا کرو کہ میرا مور بخیریت واپس آ جائے۔"

''میں دعا کروں گا لیکن یہ کام ہوا غلط ہے۔'' بازغر نے گاڑی بستی کی طرف موڑتے ہوئے کہا۔

''جو ہونا تھا ہو گیا میں کیا کرتی مجبور تھی۔'' وہ پردے کے پیچھے سے بولی۔

''اب دعا کرو کہ ان لوگوں کے مہم سے واپس آنے تک رمز شناس یا بابا صاعق تیرے مور کو طلب نہ کریں۔ اگر ایسا ہوا تو غضب ہو جائے گا۔ جانے میرا کیا حشر ہو؟''

''بازغر کچھ نہیں ہو گا۔ میں سنبھال لوں گی۔'' رشا ملوک نے بڑے اعتماد سے کہا۔ ''تم فکر نہ کرو۔''

☆......☆......☆

جانبازوں کا یہ قافلہ اندھیرا ہونے تک کوہ ویراں کے دامن میں جا پہنچا۔ بکوزان نے یہاں پہنچ کر نوجوانوں کو اپنے خیمے کھولنے کا حکم دیا۔ اس نے بتایا کہ اب صبح ہوتے ہی سفر کا آغاز کیا جائے گا۔

پھر اجالا ہوتے ہی خیمے سمیٹ لئے گئے۔ بکوزان نے پانچ پانچ نوجوانوں کی ٹولیاں بنا کر انہیں کوہ ویراں کے مختلف راستوں پر روانہ کیا۔ ان تمام ٹولیوں کو مختلف راستوں سے گزر کر کوہ ویراں کی چوٹی پر پہنچنا تھا۔ وہاں اکٹھا ہو کر پھر آگے کا لائحہ عمل طے کرنا تھا۔ بکوزان نے ان نوجوانوں کی ٹولیوں کو اچھی طرح سمجھا دیا تھا کہ کوہ ویراں پر چڑھتے ہوئے اگر کسی قسم کے کوئی آثار' کوئی نشانی یا کوئی غیر معمولی صورت حال دکھائی دے تو اس سے کس طرح نمٹا جائے۔

آخری ٹولی کو ہدایت دے کر بکوزان خود بھی ان کے پیچھے چل دیا۔ ابھی چڑھائی ایسی تھی کہ گھوڑے ان راستوں پر چل سکتے تھے۔ بکوزان نے پورے تیس نوجوان آگے روانہ کئے تھے۔ پانچ پانچ کی چھ ٹولیاں بھیجی تھیں۔ اکتیسواں نوجوان غائب تھا۔

ساحل عمر ان لوگوں کے خیمے سمیٹنے سے پہلے ہی اپنا خیمہ سمیٹ کر کب کا اوپر جا چکا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ کوہ ویراں پر پورا قافلہ ایک ساتھ نہ جا سکے گا اور ایسی صورت میں اس کا نظروں میں آ جانا عین ممکن تھا۔ لہٰذا اس نے اپنا راستہ الگ کر لیا تھا۔ وہ درختوں اور چٹانوں میں سے اپنا راستہ بناتا آگے بڑھ رہا تھا۔ جہاں تک اس کا گھوڑا اوپر جا سکا' وہ اس پر سوار رہا۔ جب اس نے دیکھا کہ اب گھوڑے کے لئے راستہ خطرناک ہو گیا ہے تو اس نے اپنے گھوڑے کو وہیں چھوڑا اور پھر پیدل ہی اوپر چل دیا۔ یہ ایک دشوار گزار راستہ تھا۔ پہاڑ پر چڑھنا آسان کام نہ تھا۔ ہر قدم پر موت اپنا جال بچھائے بیٹھی تھی...... لیکن ساحل عمر پر ایک دھن سوار تھی۔ وہ ایک جوش اور ولولے کے ساتھ آگے بڑھ رہا تھا۔ وہ اس انسانیت کے دشمن کو جاگنے سے پہلے ہی ختم کر دینا چاہتا تھا۔

اس عفریت کو ختم کرنا ابھی دور کا مسئلہ تھا' سردست تو یہ معلوم کرنا تھا کہ وہ خبیث دفن کہاں ہے۔ بکوزان کا خیال تھا کہ وہ کوہ ویراں پر ہی کہیں دفن ہے۔ یہ ممکن تھا کہ وہ کوہ ویراں کے دوسری طرف دفن ہو۔ وہ سوچتا ہوا بہت سنبھل سنبھل کر اوپر چڑھ رہا تھا کہ اچانک اسکا پاؤں پھسل گیا۔ اس نے خود کو بہت سنبھالنے کی کوشش کی لیکن نہیں سنبھال پایا۔ وہ بہت تیزی سے نیچے گرنے لگا۔

اب اسے یقین ہو گیا کہ اس کا بچنا محال ہے۔ ابھی اس کا سر کسی پتھر سے ٹکرا کر پاش پاش ہو جائے گا اور پھر وہ آٹے کی بوری کی طرح کوہ ویراں کے دامن میں جا گرے گا۔

کبھی کبھی برائی میں بھی اچھائی کا پہلو ہوتا ہے۔ اوپر والے کی مصلحت اوپر والا ہی جانتا ہے۔ اسکا پاؤں پھسلا تو وہ نیچے جانے کی بجائے برف کے ڈھیر پر گرا۔ یہ نرم برف تھی۔ وہ تھوڑا سا اس میں دھنس گیا۔ اس کی جان بچ گئی تھی۔ اس نے اللہ کا شکر ادا کیا۔

پھر اس نے بیٹھے بیٹھے اپنے سامنے کا جائزہ لیا۔ اس کے سامنے آٹھ دس فٹ کے فاصلے پر ایک بڑا سا سوراخ تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے برف اس سوراخ سے باہر نکالی گئی ہو یا یوں کہنا چاہئے کہ برف کھود کر یہ سوراخ کیا گیا ہو۔ اسے آس پاس کوئی نظر نہ آیا۔ نہ برف پر کسی قسم کے نشانات تھے۔ اس نے سوچا کہ وہ آگے بڑھ کر اس سوراخ میں جھانک کر دیکھے' پھر اسے خیال آیا کہ کہیں یہ برفانی ریچھوں کا بھٹ نہ ہو۔ وہ اس سوراخ میں گھسے اور وہ اندر سے نکل کر اس پر حملہ کر دیں۔

وہ سمار ملوک کی بخشی ہوئی تلوار اپنے ساتھ لایا تھا لیکن وہ کمبل میں لپٹی گھوڑے کی پیٹھ پر بندھی تھی اور گھوڑا نیچے تھا۔ بازغر نے اسے ایک خنجر بھی دیا تھا جو اس کی پنڈلی سے بندھا ہوا تھا۔ اس نے وہ خنجر اپنی پنڈلی سے کھینچ لیا اور اسے اپنے ہاتھ میں لے کر اس سوراخ میں جانے کی ٹھان لی۔ یہ برف کا ڈھیر اونچا تھا اور سوراخ نیچے تھا اس سوراخ تک ایک ڈھلانی راستہ بنا ہوا تھا۔ وہ کچی برف پر قدم جماتا ہوا اس سوراخ کی طرف بڑھا۔ جب وہ سوراخ کے سامنے پہنچا تو اسے سوراخ گہرائی میں نظر آیا۔ سامنے اندھیرا تھا لہٰذا وہ یہ اندازہ نہ کر پایا کہ سوراخ کتنا اندر تک گیا ہے۔ یہ ایک چار فٹ اونچا اور دو ڈھائی فٹ چوڑا سوراخ تھا۔ وہ اس سوراخ میں جھک کر داخل ہو سکتا تھا۔ کچھ دیر تک وہ سوچتا رہا کہ کیا کرے۔ وہ فوراً فیصلہ نہ کر پایا۔ تب اسے اپنے گلے میں پڑے تعویذ کا خیال آیا۔ اس نے اپنے کوٹ کا ایک بٹن کھول کر اندر ہاتھ ڈال کر تعویذ کو چھوا' تعویذ چھوتے ہی اس کے کانوں میں ایسی آواز آئی جیسے کسی نے کہا ہو۔ "جاؤ۔"

اس آواز کے ساتھ ہی اس کا دل مضبوط ہو گیا۔ وہ اب بے دھڑک اس برفانی غار میں داخل ہو گیا۔ وہ غار میں پاؤں جما کر اور جھک کر چل رہا تھا' لیکن جیسے جیسے وہ آگے قدم بڑھا رہا تھا یہ غار اونچا ہوتا جا رہا تھا۔ جب وہ دس پندرہ قدم اندر چلا گیا تو اس نے محسوس کیا کہ وہ اپنے پورے قد سے کھڑا ہو سکتا ہے۔ لہٰذا وہ پورے قد سے کھڑا ہو گیا۔ راستہ ابھی بند نہیں ہوا تھا۔ سامنے اندھیرا تھا' وہ اندازہ نہیں کر سکتا تھا کہ آگے کیا ہے؟ باہر سے آنے والی روشنی دم توڑتی جا رہی تھی۔

وہ کم ہوتی روشنی میں دھیرے دھیرے ایک مرتبہ پھر آگے بڑھنے لگا۔ راستہ سیدھا اور ہموار تھا اسے آگے بڑھتے ہوئے کسی قسم کی دشواری محسوس نہیں ہو رہی تھی لیکن اندھیرا برابر بڑھ رہا تھا۔ جب اندھیرا خاصا بڑھ گیا تو اس نے کھڑے ہو کر اپنی پیٹھ پر لٹکے ہوئے بیگ کو آگے کیا۔ اس کی زپ کھول کر اس میں سے ٹارچ نکالی۔ زپ بند کر کے بیگ پیچھے کیا اور ٹارچ روشن کر لی۔ اب اس کے بائیں ہاتھ میں ٹارچ اور دائیں ہاتھ میں خنجر تھا۔ وہ پھر محتاط انداز میں بڑھنے لگا۔ ابھی تک اندر سے کسی قسم کی آواز یا حرکت محسوس نہیں ہوئی تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے اندر مکمل سناٹا ہے۔

چند قدم مزید آگے چلنے کے بعد اسے محسوس ہوا کہ غار آگے جا کر چھوٹا ہو گیا ہے۔ لیکن ایسا نہ تھا آگے اصل میں سیڑھیاں تھیں۔ وہ ٹارچ کی روشنی میں سیڑھیاں اترنے لگا مگر غار کی اونچائی اتنی ہی رہی۔ آٹھ دس سیڑھیاں اتر کر وہ ایک گول چھت کے نیچے پہنچ گیا۔ اس نے ٹارچ کی روشنی میں چاروں طرف کا جائزہ لیا۔ سامنے ایک پتھر کا چبوترہ تھا اور اس چبوترے کے چاروں کونوں پر پتھر سے تراشے گئے ستون تھے۔ ان ستونوں کے درمیان چبوترے پر ایک ایسی چیز تھی جسے دیکھ کر ساحل عمر کے دل کی دھڑکن اچانک تیز ہو گئی۔

☆......☆......☆

وہ پانچ پانچ کی ٹولیاں مختلف راستوں سے ہوتی ہوئی اوپر چوٹی پر پہنچ رہی تھیں۔ ابھی صرف دو ٹولیاں چوٹی پر تھیں۔ بکوزان سب سے پیچھے تھا۔

کوئی ایک گھنٹے کے اندر سارے نوجوان بخیریت و عافیت اوپر پہنچ گئے۔ جب بکوزان بھی اوپر پہنچ گیا تو اس نے ایک ایک نوجوان کو بلا کر نیچے سے اوپر آنے کا احوال پوچھا۔ جس پر جو بیتی تھی، وہ اس نے کہہ سنائی مگر ان کی کہانیوں میں اس کے مطلب کی کوئی کہانی نہ تھی۔

کوہ ویراں کے اس طرف تو کچھ ہاتھ نہ لگا تھا۔ اب بکوزان اپنے قافلے کو لے کر کوہ ویراں کے اس طرف اترنا چاہتا تھا۔

اس مرتبہ اس نے حکمت عملی میں تبدیلی کر دی۔ نیچے سے اوپر آتے ہوئے اس نے نوجوانوں کو پانچ پانچ کی ٹولیوں میں بانٹ دیا تھا لیکن اب اس نے نوجوانوں سے کہا کہ وہ دو دو کر کے نیچے اتریں گے اور ہر پارٹی کے درمیان پانچ قدم کا فاصلہ رہے گا تاکہ کسی خطرناک صورت میں اجتماعی طور پر نمٹا جا سکے۔

بکوزان نے کوہ ویراں کی پراسرار کہانیوں کے پیش نظر اور حالیہ اموات کے حوالے سے ہر بات سمجھا دی تھی اور ہر لمحہ مستعد اور چوکس رہنے کی تاکید کی تھی۔

بکوزان کی ہدایت کے مطابق دو دو نوجوان پانچ قدم کا فاصلہ رکھ کر نیچے اترنے لگے۔ اس مرتبہ بکوزان سب سے آگے تھا۔

جب آخری دو نوجوان بھی نیچے اترنے لگے اور وہ اتنے نیچے پہنچ گئے کہ کسی ناگہانی آفت کے پیش نظر ان کا بچ نکلنا ممکن نہ ہو تو وہ ناگہانی آفت ان پر اچانک ٹوٹ پڑی۔

دیکھتے ہی دیکھتے طوفان بادوباراں نے انہیں اپنی گرفت میں لے لیا۔ ہوا اور بارش اس قدر تیز تھی کہ درخت اکھڑ اکھڑ کر نیچے جا رہے تھے۔ ایسی طوفانی ہوا اور وہ بھی ڈھلانی راستے پر کسی کا قدم جما کر کھڑے رہنا ممکن نہ تھا۔ نوجوان لڑھکنے لگے۔

دس منٹ کے اندر آندھی طوفان اور بارش نے وہ تباہی مچائی کہ ایک نوجوان بھی زندہ سلامت نہ رہ سکا۔ وہ لڑھکتے ہوئے اتھاہ گہرائیوں میں جا گرے۔ کچھ درختوں کے نیچے دب کر اپنی جان گنوا بیٹھے۔ بکوزان کا کچھ پتہ نہ چلا کہ اس پر کیا بیتی؟

جب طوفان تھما تو ایک نوجوان جو دو درختوں کے درمیان دبا تھا اس نے اپنی آنکھیں کھول

دیں۔ وہ درختوں کے درمیان کچھ اس طرح پھنسا تھا کہ اس کے جسم پر ایک خراش بھی نہیں آئی تھی۔ صرف اس کو چھوتی ہوئی گزر گئی تھی۔ وہ درخت ایک چٹان پر گرے تھے اور وہ نوجوان خلا میں ہونے کی وجہ سے بچ گیا تھا۔ وہ خلا اتنا بڑا تھا کہ وہ نوجوان کوشش کر کے اس سے باہر نکل سکتا تھا۔

بالآخر وہ اپنی کوششوں سے باہر نکل آیا۔

اس نے سیدھا کھڑے ہو کر گہرا سانس لیا اور وہ نیچے اوپر جہاں تک دیکھ سکتا تھا اس نے دیکھا۔ اسے دور تک کچھ نظر نہ آیا۔ اس کے ساتھی شاید لڑھکتے ہوئے بہت نیچے تک چلے گئے تھے۔ وہ جانتا تھا کہ ایسے طوفان میں ایک بھی زندہ نہ بچا ہوگا۔ کوہ ویراں کے بارے میں اس نے جو کچھ سنا تھا' وہ سب سچ تھا۔ واقعی ادھر آنے والا کبھی لوٹ کر واپس نہیں جا سکتا تھا۔ اس طوفان کے دور تک کوئی آثار نہ تھے بس اچانک ہی تیز ہوا چلنے لگی اور وہ منٹوں سیکنڈوں میں موت کی شکل اختیار کر گئی تھی۔

اس نوجوان نے سر اٹھا کر اوپر دیکھا۔ کوہ ویراں کی چوٹی زیادہ اوپر نہ تھی۔ اس نے طے کیا کہ وہ فوراً اوپر پہنچے۔ اس کے بعد سوچے کہ اب کیا کرنا ہے۔

وہ نوجوان جلدی جلدی اوپر چڑھنے لگا۔ وہ بار بار پیچھے مڑ کر بھی دیکھتا جاتا تھا۔ اسے بار بار یہ احساس ہوتا تھا کہ جیسے کوئی اس کا تعاقب کر رہا ہے لیکن اسکے تعاقب میں کوئی نہ تھا یا اگر کوئی تھا تو اسے نظر نہیں آ رہا تھا۔

جب وہ نوجوان چوٹی پر پہنچ گیا تو اس نے بیٹھ کر اطمینان کا گہرا اور ٹھنڈا سانس لیا۔ وہ یہاں کچھ دیر ستا کر نیچے اترنا چاہتا تھا۔ اب تو نیچے ہی جانا تھا۔ کوہ ویراں کا یہ حصہ محفوظ تھا۔ وہ آرام سے جا سکتا تھا۔ اس نے سوچا تھوڑی دیر یہاں بیٹھ کر نیچے اترنا شروع کرے۔ ہو سکتا ہے اتنی دیر میں کوئی اور ساتھی نظر آ جائے۔ فوراً ہی اس نے گردن گھما کر کوہ ویراں کے پراسرار حصے پر نظر ڈالی۔ اسے دور تک تباہی کے سوا کچھ نہ دکھائی دیا۔ درخت جڑوں سے اکھڑے ہوئے ایک دوسرے پر گرے ہوئے تھے اور نیچے اندھیرے کے سوا کچھ نہ تھا۔

اب وہ نوجوان گردن موڑ کر اٹھنا ہی چاہتا تھا کہ دو کالے ہاتھ اس کے گلے میں آئے اور پھر آناً فاناً اس کا گلا ادھڑ گیا۔ اس کی چیخ گلے میں گھٹ کر رہ گئی۔ اب وہ تیزی سے نیچے لڑھکتا جا رہا تھا۔ اس کی گردن میں جیسے آگ لگی تھی۔ تھوڑا سا نیچے جا کر وہ ایک گرے ہوئے درخت میں اٹک گیا۔ پھر اسے پتھر ہوتے دیر نہ لگی۔

☆......☆......☆

''نہیں۔'' وہ بہت زور سے چیخا۔ اچانک اس کی آنکھ کھل گئی۔ اسے اپنی چیخ کی آواز اجنبی لگی۔ وہ اس سردی میں بھی پسینے میں نہایا ہوا تھا۔ تھوڑی دیر میں جب حواس بحال ہوئے تو اس نے خود کو اپنے کتب خانے میں پایا۔ تب اسے یاد آیا کہ وہ رات کو حساب کتاب لگاتا' کتب خانے میں لگے ایک بستر پر ہی سو گیا تھا۔

اس نے جو خواب دیکھا تھا' وہ بہت بھیانک تھا۔ اس خواب نے اس کے ہوش اڑا دیئے تھے۔ کیں لئے وہ چیخ مارے بنا نہ رہ سکا تھا۔

بستی کے رمز شناس سمارملوک نے گھڑی پر نظر ڈالی۔ صبح ہونے والی تھی۔

سمارملوک اپنے کتب خانے کی سیڑھیاں اتر کر اپنی خواب گاہ میں پہنچا۔ وہاں اس کی بیوی اطمینان سے سوئی ہوئی تھی۔ وہ وہاں سے نکل کر رشاملوک کے کمرے کی طرف بڑھا۔ اس نے بند دروازے پر مخصوص انداز میں دستک دی۔

دستک کی آواز سن کر رشاملوک کسمسائی۔ وہ اپنے نرم بستر پر بڑے مزے کی نیند لے رہی تھی کہ اس مخصوص دستک نے اسے چونکا دیا۔ اس کی آنکھیں فوراً پوری کھل گئیں اور وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔

وہ بھاگتی ہوئی دروازے پر پہنچی۔

دروازہ کھلتے ہی اسے باپ کی صورت نظر آئی۔ باپ کو پریشان دیکھ کر وہ ایک دم گھبرا گئی۔ وہ اپنے باپ کو احترام دینا بھول گئی۔ گھبرا کر بولی۔ ''بابا' خیر تو ہے۔''

''رشاملوک پہلے باپ کو احترام دے پھر بات کر۔'' سمارملوک نے خشک لہجے میں کہا۔

''اوہ' بابا معاف کیجئے گا۔ آپ کو اس وقت اور اس حالت میں دیکھ کر میں پریشان سی ہو گئی۔ آپ کو احترام دینا بھی بھول گئی۔'' یہ کہہ کر وہ گھٹنوں کے بل بیٹھی۔ اس نے سمارملوک کا ہاتھ تھام کر چوما اور پھر کھڑی ہو گئی۔ تب سمارملوک تیزی سے اس کے کمرے میں آیا اور سات کرسیوں میں سے ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔

''رشاملوک میں نے بہت برا خواب دیکھا ہے اور تو جانتی ہے کہ میں کتنے سچے خواب دیکھتا ہوں۔''

''ہاں' بابا...... میں جانتی ہوں۔'' رشاملوک کی اچانک دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ ساحل عمر کوہ ویراں کی مہم پر نکلا ہوا تھا۔ خدانخواستہ بابا نے اس کے بارے میں تو کوئی خواب نہیں دیکھ لیا۔ ''بابا' جلدی بتائیں آپ نے کیا دیکھا ہے۔''

''اے رشاملوک میں نے دیکھا کہ وہ سب کے سب مارے گئے۔ بکوزان بچا' نہ اس کے ساتھ گئے نوجوان بچے۔ انہیں موت کا طوفان لے اڑا' یہ دیکھا ہے میں نے۔'' سمارملوک نے افسردگی سے کہا۔

''یہ تو آپ نے بہت برا دیکھا ہے...... اب کیا ہوگا؟'' رشاملوک کو ساحل عمر کی طرف سے اطمینان ہو گیا۔

''پہلے میرا خیال تھا کہ میں ساحل عمر کو اس وقت بھیجوں گا جب مجھے راعین کے ٹھکانے کا معلوم ہو جائے گا لیکن اب مجھے اندازہ ہوا کہ یہ ہماری بستی کے لوگوں کے بس کی بات نہیں۔ ہمارے تین ہنرمند مارے گئے۔ تیس نوجوانوں کی جانیں تلف ہوئیں۔ اب مجھے تیرے مور کو اس مہم پر روانہ کرنا پڑے گا۔ اب وہی اسے ڈھونڈے گا اور وہی اس سوئے فتنے کو نیست نابود کرے گا۔ میرا علم کہتا ہے کہ اسے اس بستی میں اسی کام کے لئے بھیجا گیا ہے۔ وہ اس بستی کا نجات دہندہ ہے۔ جا اسے اٹھا کر لا' وہ سو رہا ہوگا' اسے کہنا تجھے اس بستی کے رمز شناس سمارملوک نے طلب کیا ہے۔'' سمارملوک یہ کہہ کر بڑے

اطمینان سے ٹانگیں پھیلا کر بیٹھ گیا۔
"اچھا ٹھیک ہے بابا...... میں جاتی ہوں' اسے بلا کر لاتی ہوں۔ آپ یہاں آرام سے بیٹھیں۔" رشا ملوک نے یہ بات اتنے آرام سے کہہ تو دی لیکن وہ اندر سے پریشان ہوگئی۔
وہ جانتی تھی کہ ساحل عمر کمرے میں نہیں ہے۔ وہ کوہ ویراں کی مہم پر گیا ہوا ہے۔ وہ اسے کہاں سے بلائے۔ بہر حال اس نے سوچا۔ اس کمرے سے تو باہر نکلے۔ وہ ایک دروازے سے باہر نکل کر ساحل عمر کے کمرے کی طرف چل دی۔ ساحل عمر کا کمرہ محل کے ایک گوشے میں تھا۔ وہ مینار سے نکل کر اس کے گنبد کی طرف بڑھ رہی تھی اور سوچ رہی تھی کہ اب کیا کرے۔ پھر ایک فکر نے اسے اور آن گھیرا۔ ساحل عمر ان تیس نوجوانوں کے ساتھ مہم پر نکلا تھا اور انہی جیسا بن کر گیا تھا۔ بابا نے ان نوجوانوں کو مرتے دیکھا ہے کہیں ایسا تو نہیں...... آگے وہ سوچ نہ سکی۔ اس کا کلیجہ ایک دم منہ کو آ گیا۔ کہیں اس کا مور ان نوجوانوں کے ساتھ طوفان کی نذر تو نہیں ہوگیا۔ اگر ایسا ہوگیا تو وہ کہیں کی نہ رہے گی۔ زندہ درگور ہو جائے گی۔
سردست تو یہ مسئلہ تھا کہ وہ سمار ملوک کو کیا جواب دے۔ کیا وہ انہیں سچ سچ بتا دے کہ وہ ان کی خواہش سے پہلے ہی مہم پر جا چکا ہے۔ کہیں یہ جواب انہیں غضبناک نہ کر دے۔ کہیں وہ غصہ ہو جائیں کہ ان کی اجازت کے بغیر خطرناک کام کیوں کیا گیا۔ بازغر بے چارہ مفت میں لپیٹ میں آجائے گا۔ بابا جانے اس کا کیا حشر کریں۔ پھر اس کے کمرے کی طرف بڑھتے ہوئے اچانک ہی ایک ترکیب اس کے ذہن میں آ گئی اور وہ اس کے دروازے سے واپس پلٹ آئی۔
جب وہ اپنے کمرے میں داخل ہوئی تو اس بستی کا رمز شناس سمار ملوک بے چینی سے کمرے میں ٹہل رہا تھا۔ اس نے ایک نظر اپنی بیٹی کے چہرے پر ڈالی اور پھر پوچھا۔ "ہاں کیا ہوا......؟ کہاں ہے ساحل عمر؟"
"بابا غضب ہوگیا۔" رشا ملوک نے گھبرا کر کہا۔
"کیا ہوا؟" سمار ملوک نے پوچھا۔
"میرا مور اپنے گنبد میں نہیں ہے۔"
"کیا تو نے اچھی طرح گنبد دیکھ لیا؟"
"ہاں' بابا...... میں نے اچھی طرح گنبد دیکھ لیا۔ وہ وہاں نہیں ہے۔" رشا ملوک نے بڑے یقین سے کہا۔
"وہ آخر کہاں جا سکتا ہے۔" سمار ملوک سوچ میں پڑ گیا۔
"میں کیا کہہ سکتی ہوں بابا...... میری سمجھ میں خود کچھ نہیں آ رہا۔"
"یہ بہت برا ہوا...... اچھا تو پریشان مت ہو...... میں بابا صاعق سے مشورہ کرتا ہوں۔" یہ کہہ کر سمار ملوک اس کے کمرے سے نکل گیا اور رشا ملوک کمرے کے درمیان پریشان کھڑی رہ گئی۔

☆......☆......☆

راستے کٹھن ہوں اور منزل کا دور تک کہیں پتہ نہ ہو پھر یوں ہو کہ منزل پلک جھپکتے ہی

سامنے آ جائے تو بندے پر خوشگوار حیرت کی کیفیت طاری ہونا لازمی امر ہے۔ ساحل عمر کا اس وقت یہی حال تھا۔ اس کا دل خوشی سے بلیوں اچھل رہا تھا۔

سامنے چبوترے پر برف کا ڈھیر تھا اور اس برف میں ایک تابوت نظر آ رہا تھا۔ اس تابوت کا اوپر کا کچھ حصہ شیشے کا تھا۔ اس شیشے سے ایک شخص کی صورت نظر آ رہی تھی۔

یہ یقیناً راعین تھا۔ وہ ایک خبیث صورت شخص تھا۔ طوطے جیسی ناک، بھاری بھنویں، گنجا سر، بند آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئی، دہانہ باہر کو نکلا ہوا۔ اس کے چہرے کے سہارے دائیں بائیں دو کتابیں کھڑی ہوئی تھیں۔ یہ کتاب سحر کی دونوں جلدیں تھیں۔ اس کتاب نے کیسی کیسی قیامتیں ڈھائی تھیں۔

ساحل عمر نے چبوترے پر چڑھ کر اس برف میں دبے تابوت کا اچھی طرح جائزہ لیا۔ یہ تابوت دو تین فٹ برف کے اندر تھا۔ برف شفاف تھی۔ ساحل عمر نے اپنے ہاتھ میں دبے تیز دھار کے خنجر سے برف کی نرمی کا جائزہ لینے کے لئے برف پر خنجر مارا۔

خنجر کی نوک جیسے ہی برف سے ٹکرائی تو ایک دم نیلا سا شعلہ لپکا۔ یہ شعلہ ویسا ہی تھا جیسے ویلڈنگ کرتے ہوئے سولڈر سے نکلتا ہے۔ ساتھ ہی اس کے ہاتھ کو جھٹکا لگا۔ یہ جھٹکا بجلی کے کرنٹ جیسا تھا۔ ساحل عمر چبوترے سے گرتے گرتے بچا۔ ساحل عمر نے اس جگہ غور سے دیکھا جہاں اس نے خنجر مارا تھا، وہاں کوئی اثر نہ تھا برف پر خراش تک نہ پڑی تھی۔ اسے لگا یہ برف نہ ہو کرسٹل ہو۔

ساحل عمر نے خنجر جیب میں ڈال کر ڈرتے ڈرتے اپنی ایک انگلی سے اس برف کو چھوا۔ انگلی برف پر لگتے ہی شعلہ تو نہ لپکا لیکن اسے احساس ہو جیسے جلتے توے پر انگلی رکھ دی ہو۔

وہ دہکتی برف تھی۔

اب وہ پیچھے ہٹ آیا اور پیچھے پلٹ کر ستون کا جائزہ لینے لگا۔ ان ستونوں کا مقصد سمجھ میں نہ آیا۔ یہ آخر چبوترے کے ساتھ کیوں بنائے گئے تھے۔ ان چاروں ستونوں میں ساحل عمر نے ایک خاص بات محسوس کی کہ ہر ستون میں، ایک ہی جگہ ایک مختلف رنگ کا چوکور پتھر لگا تھا۔ یہ پتھر کچھ اس انداز سے لگا ہوا تھا کہ اگر چاقو کی نوک سے اس پتھر کو ہلایا جائے تو وہ تھوڑی سی محنت کے بعد نکل سکتا تھا۔ ساحل عمر نے اہرام مصر کے بارے میں خاصا پڑھا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ جب کوئی فرعون مرتا تو اس کی ممی کے ساتھ بہت سا خزانہ دفن کر دیا جاتا تھا۔ ساحل عمر نے سوچا کہ کہیں ان ستونوں میں خزانہ ہی تو بھرا ہوا نہیں ہے، کیا حرج ہے اگر ایک ستون سے پتھر نکال کر دیکھ لیا جائے۔

ایک مرتبہ پھر اس نے مختلف رنگ کے اس چوکور پتھر کا اچھی طرح جائزہ لیا اور پھر اپنے کوٹ کی جیب سے خنجر نکال لیا۔

اسی وقت پیچھے سے دو کالے ہاتھ اس کی طرف بڑھے۔

☆......☆......☆

یہ قیامت کے ہاتھ تھے۔

یہ وہ ہاتھ تھے جو کسی کی گردن میں حمائل ہو جاتے تو پھر اس کا زخرہ ادھڑنا چند لمحوں کی بات ہوتی۔ اسی وقت اس کی زندگی کی شام ہو جاتی۔ وہ چل بستا۔

اب یہی ہاتھ ساحل عمر کی طرف بڑھے تھے۔ ساحل عمر اپنے خنجر سے پتھر کے اس چوکور ٹکڑے کو ڈھیلا کر کے نکالنا چاہتا تھا جو اس ستون میں نصب تھا۔ اس کا خنجر والا ہاتھ پتھر کی طرف بڑھ رہا تھا۔ وہ اس بات سے قطعاً بے خبر تھا کہ اس کی موت کالے ہاتھوں کی صورت میں اس کے پیچھے کھڑی ہوئی ہے اور قیامت کے آنے میں بس چند ساعتوں کی دیر ہے۔

وہ کالے ہاتھ جیسے ہی اس کی گردن میں حمائل ہوئے اور اس نے اس کی گردن جکڑ کر اپنے نوکیلے دانتوں سے اس کا نرخرہ ادھیڑنا چاہا تھا تو اسے ایک جھٹکا سا لگا۔ اس کی گرفت ایک دم ڈھیلی ہو گئی۔ وہ قیامت بے اختیار پیچھے ہٹ گئی۔

اس قیامت کا ہاتھ چاندی کے تعویذ پر پڑ گیا تھا جسے ابھی کچھ دیر پہلے ساحل عمر نے چھو کر کپڑوں سے باہر نکال لیا تھا۔ ساحل عمر کو جیسے ہی کسی کی گرفت میں آنے کا احساس ہوا۔ وہ بہت تیزی سے پلٹ کر پیچھے ہٹا۔ ٹارچ کی روشنی ایک دم اس کے چہرے پر پڑی۔ اس کی شکل دیکھ کر ساحل عمر کانپ گیا۔

وہ کالے رنگ کی کوئی چیز تھی۔ چھ فٹ قد' جسم پر ریچھ جیسے بال' سرخ انگارہ آنکھیں' دو چمکتے نوکیلے دانت باہر کو نکلے ہوئے۔ وہ نہ انسان تھا' نہ جانور۔ جانے وہ کیا تھا۔ وہ جو بھی تھا اتنا بھیانک تھا کہ اگر نرخرہ ادھیڑنے کے بجائے وہ ویسے ہی کسی کے سامنے آ جاتا تو اسے دیکھ کر ہارٹ فیل ہو جانا یقینی تھا۔

ایک لمحے کو ساحل عمر کی سمجھ میں نہ آیا کہ یہ کون ہے اور اچانک کہاں سے نمودار ہو گیا ہے۔ اپنے چہرے پر روشنی پڑتے دیکھ کر اس نے اپنے دہشت ناک منہ پر ہاتھ پھیر کر روشنی ہٹانے کی کوشش کی۔ اس کے منہ سے غراہٹیں برآمد ہو رہی تھیں۔ پھر اس نے اپنا بھاڑ سا منہ پھاڑ دیا۔

ساحل عمر کے پاس وقت کم تھا۔ وہ کسی لمحے اس پر حملہ کر سکتا تھا۔ ساحل عمر کے پاس محض ایک خنجر تھا۔ یہ چھوٹا سا خنجر بھلا اس کا کیا بگاڑ سکتا تھا۔ اسے اچانک تلوار یاد آئی کہ اگر وہ اس وقت اس کے ہاتھ میں ہوتی تو وہ بآسانی اسکا کام تمام کر دیتا۔

پھر ایک خیال بجلی کی سی تیزی سے اس کے دماغ میں کوندا۔ اس خیال کے آتے ہی اس نے اپنے خنجر کی نوک تیزی سے چاندی کے تعویذ پر رکھ دی۔ پھر اس نے جلدی جلدی خنجر کی نوک کو تعویذ پر رگڑا۔ اسی وقت اسے یوں لگا جیسے کسی نے کہا ہو۔ "اس خنجر کو اس کے پیٹ میں گھونپ دو۔"

اسی وقت وہ عفریت ساحل عمر کی طرف بڑھا اس نے اپنے ہاتھ بڑھا کر اسے گرفت میں لینا چاہا۔ ساحل عمر اس کے ہاتھوں کی گرفت سے بچنے کے لئے نیچے جھکا اور پھر تیزی سے آگے بڑھ کر وہ خنجر اس کے پیٹ میں گھونپ دیا۔ خنجر گھونپتے ہی وہ کسی غبارے کی طرح پھٹ گیا۔ جس طرح ایک بڑے غبارے کو کسی سوئی کی نوک چبھو کر پھاڑ دیا جائے تو اس کے نتیجے میں جو آواز آتی ہے بالکل ویسی ہی آواز خنجر گھونپتے ہوئے ہوئی اور پھر وہاں کچھ نہیں رہا۔

ساحل عمر نے ٹارچ کی روشنی میں اچھی طرح چبوترے پر دیکھ لیا۔ اب وہاں کچھ نہیں تھا۔ فرش پر کوئی نشان تک نہیں تھا۔ اس عفریت سے نجات پا کر اس نے اطمینان کا ایک لمبا سانس لیا۔ اپنے

گلے میں پڑے ہوئے تعویذ کو ہلکی سے تھپکی دی۔ اب اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ مشکل وقت میں اس تعویذ کے ذریعے اس کی کس طرح مدد ہو جاتی تھی۔ فوراً ہی کوئی خیال اس کے دماغ میں آتا تھا جس پر عمل کر کے اس کے دماغ میں کوئی آواز گونجتی تھی اور اس طرح اس مصیبت سے نجات مل جاتی تھی۔ تعویذ کے استعمال کا ایک طریقہ کار اس کے ہاتھ آ گیا تھا۔

اب وہ پھر ستون کی طرف متوجہ ہوا۔ ستون میں لگا یہ مختلف رنگ کا پتھر بار بار اسے اپنی طرف متوجہ کر رہا تھا۔ اس نے خنجر کی نوک پتھر کی درز میں ڈالی۔ پھر کچھ سوچ کر اس نے خنجر اٹھا لیا۔ اس نے سوچا پتھر نکالنے کی وجہ سے وہ کسی نئی مصیبت میں نہ پھنس جائے۔ یہ ضروری نہیں کہ اس ستون میں خزانہ ہی بھرا ہو۔ فرض کرو اگر اس میں خزانہ بھی موجود ہے تو وہ اس کا کیا کرے گا۔ اس کا مسئلہ تو راعین تھا' جو اس وقت برف میں دفن تھا۔

ایک مرتبہ پھر اس نے برف میں خنجر مارا۔ نتیجہ وہی برآمد ہوا۔ ایک نیلا شعلہ نکلا اور اس کے ہاتھ کو بجلی کا سا جھٹکا لگا۔ اسے اندازہ ہوا کہ یہ خنجر اس برف کا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا۔ برف کے اس تودے کو توڑنے کے لئے کچھ سوچنا پڑے گا۔ بستی واپس جا کر ان لوگوں سے مدد لینا ہو گی۔ ایک بڑا مسئلہ تو حل ہو ہی گیا تھا۔ اسے راعین کا مدفن معلوم ہو گیا تھا اور ابھی اس عفریت کے جاگنے میں کئی ہفتے باقی تھے۔ پھر کسی قسم کی جلد بازی کا شکار ہو کر کوئی اقدام اٹھانے سے کہیں بہتر تھا کہ بستی واپس چلا جائے۔

پھر واپسی کا خیال اس کے دل میں جڑ پکڑتا گیا اور وہ فوراً ہی اس غار سے نکل آیا۔

☆......☆......☆

بستی کے رمز شناس سارملوک کا خواب سن کر بابا صاعق پر جیسے بجلی سی گر پڑی۔ وہ جانتے تھے کہ سارملوک سچے خواب دیکھتا ہے لیکن یہ اس نے کیا دیکھ لیا تھا۔ ایسے بھیانک خواب کا تو وہ تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔ اتنا بڑا حادثہ بستی کے تیس خوبرو نوجوان...... اور ایک ہنرمند۔ اس خواب کی اندوہناکی کا دھیرے دھیرے اثر بڑھتا گیا۔ یہاں تک کہ ان کا دل بھر آیا۔ آنکھوں میں نمی تیرنے لگی۔

''اے سارملوک صبح صبح تم نے کیا خواب سنا دیا۔'' وہ گلوگیر آواز میں بولے۔

''بابا...... میں کیا کروں۔ آپ کو نہ سناؤں تو پھر کس سے کہوں۔ اس خواب نے خود میری حالت بگاڑ دی ہے۔'' وہ ہاتھ ملتے ہوئے بولا۔ ''میں بستی والوں کو کیا جواب دوں گا۔ انہیں کیا بتاؤں گا کہ ان کے نوجوان کہاں گئے؟''

''بستی والوں کو سمجھانا ہو گا۔ یہ کام میں کروں گا۔ تم پریشان مت ہو۔'' انہوں نے تسلی دی۔

''بابا' پریشان کیسے نہ ہوں۔ کوئی ایک پریشانی ہو تو برداشت کر جاؤں۔ یہاں تو پریشانیوں کی زنجیر ہے۔ میرے علم نے مجھے بتایا تھا کہ راعین کے مدفن کا پتہ چلانا ہم بستی کے لوگوں کے بس کی بات نہیں۔ یہ کام بس ساحل عمر کر سکتا ہے۔ سوچا اس سے بات کروں' اسے کوہ ویراں کی طرف روانہ کروں......'' اتنا کہہ کر سارملوک رک گیا۔ اس نے اداس نظروں سے بابا صاعق کیطرف دیکھا۔

''پھر کیا ہوا......؟ اسے تم نے کیوں نہیں بھیجا۔'' بابا صاعق نے پوچھا۔

"بابا کسے بھیجوں۔" سمار ملوک نے سرد آہ بھری۔ "وہ اپنے گنبد میں نہیں...... غائب ہے۔"
"ہیں' یہ کیا کہہ رہے ہو تم؟" بابا صاعق پریشان ہو کر سمار ملوک کی طرف دیکھنے لگے۔
"بابا' جو کہہ رہا ہوں...... سچ کہہ رہا ہوں۔" سمار ملوک نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا۔
ابھی بابا صاعق کچھ کہنے کے لئے لب کھولنے والے تھے کہ راہداری میں دوڑتے قدموں کی آواز سنائی دی۔ ساتھ ہی کوئی پکار رہا تھا۔ "بابا' بابا۔"
"ارے' یہ تو رشا ملوک کی آواز ہے؟" سمار ملوک چونک کر کھڑا ہو گیا۔ وہ پلٹ کر دروازے کی طرف جانے ہی والا تھا کہ رشا ملوک ہانپتی ہانپتی کمرے میں داخل ہوئی۔
اس نے جلدی جلدی دونوں کو احترام دیا اور پھر چڑھتی ہوئی سانسوں کے دوران بولی۔ "بابا میرا مور آ گیا۔ اس کے پاس بہت بڑی خوشخبری ہے۔"
"وہ چلا کہاں گیا تھا؟" بابا صاعق نے پوچھا۔
"بابا' مجھ سے ایک غلطی ہو گئی ہے۔" رشا ملوک اپنے باپ کا ہاتھ پکڑتے ہوئے بولی۔ "میں نے آپ کی اجازت کے بغیر اپنے مور کو تیس نوجوانوں کے ساتھ مہم پر بھیج دیا تھا۔ بابا میں مجبور ہو گئی تھی اس نے مجھے قسم دے دی تھی۔ اب وہ اس مہم سے واپس آ گیا ہے اور اپنے ساتھ ایک ایسی خوشخبری لایا ہے کہ آپ سن کر جھوم جائیں گے۔"
"پہلے خوشخبری سنا تاکہ تیری معافی کے بارے میں سوچوں۔" سمار ملوک نے سنجیدگی سے کہا۔ "تو نے جو غلطی کی ہے اس کی سزا تو اچھی طرح جانتی ہو گی۔ اب اس سزا کا انحصار خوشخبری پر ہے۔ چل جلدی کر...... سنا۔"
"بابا...... میرے مور نے' میرے بہادر مور نے' میرے انوکھے مور نے راعین کا مدفن معلوم کر لیا ہے۔" رشا ملوک نے بڑے فخریہ انداز میں اعلان کیا۔
"کیا؟" بابا صاعق اور رمز شناس سمار ملوک دونوں ہی بیک وقت چیخ اٹھے۔
"ہاں بابا...... یہ کارنامہ انجام دیا ہے میرے مور نے۔" اس کی آنکھوں میں بے پناہ چمک تھی۔
"کہاں ہے وہ؟" بابا صاعق نے پوچھا۔
"اپنے گنبد میں۔" رشا ملوک نے جواب دیا۔
"چلو سمار ملوک اٹھو...... آؤ اس کے پاس چلیں...... اس سے مل کر احوال پوچھیں۔" بابا صاعق کھڑے ہوتے ہوئے بولے۔
پھر وہ تینوں کمرے سے باہر نکل آئے۔ رشا ملوک ان دونوں کے آگے آگے چل رہی تھی خوشی سے جھومتی ہوئی۔

☆......☆......☆

سمار ملوک نے مدفن کا کھوج لگتے ہی سب سے پہلا کام یہ کیا کہ وہاں مستعد اور مسلح نوجوانوں کا پہرہ بٹھا دیا۔ پھر اس نے اپنے علم کو آزمایا۔ مختلف زائچے تیار کیے۔ ستاروں کی چال

دیکھی۔ تب وہ ساعت نکلی۔ یہ ساعت اس فتنے راعین کے جاگنے سے تین دن پہلے کی تھی۔

راعین کو نیست و نابود کرنے کی ساعت نکالنے کے بعد اس نے بستی کے ایک ایک نوجوان' بوڑھے اور بچے کو کوہ ویراں کے سفر پر روانہ کر دیا۔ ابھی اس فتنے کے جاگنے میں اکیس دن باقی تھے۔ ان اکیس دنوں میں اس کے مدفن سے لے کر کوہ ویراں کے دامن تک جہاں تک ممکن ہو سکا' راستہ ہموار کیا گیا۔

یہ راستہ ہموار کرنا اس لئے بھی ضروری تھا کہ بابا صاعق مور سارملوک دونوں نے مدفن تک جانے کی خواہش ظاہر کی تھی۔ سارملوک کا وہاں تک جانا اتنا مشکل نہ تھا' اس کی صحت بہت اچھی تھی اور بابا صاعق کے مقابلے میں عمر خاصی کم تھی لیکن بابا صاعق کا پہنچنا واقعی دشوار تھا۔ اس مشکل کام کو آسان بنایا گیا ان کے لئے۔

پھر وہ گھڑی آئی جب کوہ ویراں کی طرف کوچ کا ارادہ کیا گیا۔ بازغر نے ایک سونے کے تھال میں رکھا بندھا ہوا صافہ سارملوک کے سامنے پیش کیا۔ سارملوک نے اس صافے کو اٹھا کر ساحل عمر کے سر پر رکھا۔ اپنی خاندانی تلوار جو وہ پہلے ہی اسے تحفہ میں دے چکا تھا' دوبارہ اس کے ہاتھ میں پکڑائی۔ پھر سارملوک نے خود اسے ایک خوبصورت گھوڑے پر سوار کیا اور کوچ کا اعلان کیا۔

رات ہوتے ہوتے یہ قافلہ کوہ ویراں کے دامن میں پہنچ گیا۔ رات گزارنے کے لئے خیمے لگائے گئے۔ سارملوک نے ساحل عمر کو اپنے ساتھ خیمے میں رکھا۔ اس خیمے کی حفاظت کے لئے ایک خصوصی دستہ متعین کیا گیا تھا۔ ویسے بھی بستی کے لوگوں سے ساحل عمر کو دور رکھا گیا تھا تاکہ وہ کم سے کم بستی والوں کی نظروں میں آئے۔

صبح ہوتے ہی خیمے اکھاڑ لیے گئے اور جہاں تک گھوڑے جا سکتے تھے' وہاں گھوڑوں پر سفر کیا' راستہ ہموار کئے جانے کی وجہ سے گھوڑے خاصے اونچائی تک چلے گئے تھے۔ پھر جب گھوڑوں کا کوہ ویراں پر چڑھنا ناگزیر ہو گیا۔ گھوڑے پھسلنے شروع ہو گئے تو گھوڑے روک دیئے گئے۔

پھر ان لوگوں نے پیدل سفر شروع کیا۔ سب سے آگے ساحل عمر تھا۔ اس کے ہاتھ میں ننگی تلوار تھی۔ وہ اس تلوار کی نوک کو جگہ جگہ برف میں گاڑتا چل رہا تھا۔ ساحل عمر کے پیچھے بابا صاعق تھے۔ ان کے ہونٹ مستقل ہل رہے تھے۔ وہ زیر لب کچھ پڑھ رہے تھے۔ ان کے پیچھے رمز شناس سارملوک تھا۔ اس کا دماغ حساب کتاب میں الجھا ہوا تھا۔

ان تینوں کے بعد بستی کے مستعد اور مسلح نوجوان تھے۔ ایک دستہ پہلے ہی مدفن پر متعین تھا۔ جب یہ لوگ مدفن کے دہانے پر پہنچے تو سارملوک نے وہاں موجود نوجوان سے مدفن کا احوال پوچھا۔

"کہو کوئی پریشانی تو نہیں ہوئی۔"

"نہیں رمز شناس' سب خیر ہے۔" مستعد نوجوان نے جواب دیا۔

"اچھا" پھر سامنے سے ہٹو...... ہمیں اندر جانے دو۔" سارملوک نے حکم دیا۔

وہ مستعد نوجوان فوراً ایک طرف ہو گیا اور سر جھکا کر کھڑا ہو گیا۔

"دیکھو ہم تینوں اندر جا رہے ہیں' ہمارے بعد کوئی اندر نہ آئے۔ اس وقت تک جب تک

میں اندر آنے کا نہ کہوں۔'' سار ملوک نے وہاں موجود نوجوانوں کو مخاطب ہو کر کہا۔
''ٹھیک ہے رمز شناس ایسا ہی ہوگا۔'' ایک نوجوان نے بڑی فرمانبرداری سے کہا۔
ساحل عمر جو سب سے آگے تھا' جھک کر اس غار میں داخل ہونے لگا تو سار ملوک بولا۔
''ایک منٹ ساحل عمر۔''
ساحل عمر اندر جاتے جاتے رک گیا۔ پھر وہ واپس نکل کر سیدھا کھڑا ہو گیا۔
''ذرا تلوار مجھے دو۔'' سار ملوک نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا۔
ساحل عمر نے اس کے ہاتھ میں تلوار تھما دی۔
سار ملوک نے تلوار پکڑ کر اس کی نوک سے زمین پر کچھ آڑی ترچھی لکیریں بنائیں۔ اس کے بعد ان لکیروں کو ایک دائرے میں بند کر دیا۔ اس کے بعد تلوار اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''اے ساحل عمر اس دائرے پر پیر رکھ کر اندر جاؤ۔''
ساحل عمر نے تلوار تھام کر پیر دائرے پر رکھا اور جھک کر غار میں داخل ہوا۔ اس کے پیچھے سار ملوک اور پھر بابا صاعق تھے۔ بابا صاعق کچھ اجنبی لفظوں کا ورد کرتے آگے بڑھ رہے تھے۔
ساحل عمر کے ایک ہاتھ میں ٹارچ اور دوسرے میں تلوار تھی۔ جب وہ سیڑھیاں اتر کر چبوترے کے سامنے پہنچا اور ٹارچ کی روشنی ڈال کر اس نے تابوت کا جائزہ لیا تو اسے اندازہ ہوا کہ تابوت پر سے برف خاصی کم ہو چکی ہے۔ اب تابوت پر صرف ایک فٹ اونچی تہہ تھی۔ اس فتنے کے اٹھنے میں ابھی تین دن باقی تھے۔ ان تین دنوں میں شاید یہ برف تابوت سے بالکل ختم ہو جاتی۔
ساحل عمر کے ساتھ وہ دونوں بھی چبوترے پر چڑھ آئے۔ بابا صاعق اور سار ملوک نے بغور رائین کا چہرہ دیکھا۔ اس کے چہرے پر نحوست برس رہی تھی۔
''اے رمز شناس...... پہلے جب میں یہاں آیا تھا تو اس تابوت پر خاصی برف جمی تھی۔ اگرچہ اب یہ برف کم ہو گئی ہے۔ اس کے باوجود اس کا توڑنا آسان کام نہیں۔ یہ برف کسی پتھر کی طرح سخت ہے اور خنجر مارنے پر نیلا شعلہ نکلتا ہے اور ہاتھ میں بجلی کا سا جھٹکا لگتا ہے۔'' ساحل عمر نے بتایا۔
''اے ساحل...... وہ خنجر تھا' یہ مقدس تلوار ہے۔ ذرا اس کو آزماؤ۔'' سار ملوک نے ہدایت کی۔
ساحل عمر نے تھوڑا پیچھے ہٹ کر تلوار کی نوک اس برف میں چبھوئی...... تلوار کی نوک ٹکرانے سے نہ کوئی شعلہ برآمد ہوا اور نہ کوئی جھٹکا لگا۔ اسے خوشگوار حیرت ہوئی۔ پھر اس نے تلوار کی نوک پر دباؤ ڈالا تو آہستہ آہستہ برف میں دھنسنے لگی۔ ساحل عمر نے فوراً تلوار ہٹالی تو برف پر تلوار کا نشان واضح ہو گیا۔ چلو یہ مسئلہ تو حل ہوا' اب اس تلوار کے ذریعے تابوت کی برف ہٹائی جا سکتی تھی۔
ساحل عمر تابوت کے پاس سے ہٹ کر ایک ستون کے پاس آیا اور اس نے مختلف رنگ کا وہ پتھر سار ملوک اور بابا صاعق کو دکھایا۔ اس پتھر کو نکالنے کے لئے ساحل عمر کا دل بے چین تھا۔ اس دن تو اکیلا تھا' اس لئے اس نے اس پتھر کو نکالنے کا خطرہ مول نہیں لیا تھا لیکن آج وہ اکیلا نہ تھا۔ اس کے ساتھ دو طاقتور بندے موجود تھے۔ پھر کسی ایمرجنسی کی صورت میں غار کے باہر مستعد اور مسلح نوجوان

ایک اشارے کے منتظر تھے۔ آج خطرہ مول لینے میں کوئی حرج نہ تھا۔ اسے جانے یہ یقین کیوں تھا کہ ان ستونوں میں خزانہ بھرا ہوا ہے۔

بابا صاعق اور سمار ملوک دونوں نے چاروں ستونوں کا اور ان ستونوں میں لگے اس مختلف رنگ کے پتھروں کا اچھی طرح جائزہ لیا۔ پھر وہ دونوں اپنا اپنا علم آزما کر اس بات پر متفق ہو گئے کہ واقعی ان ستونوں میں خزانہ ہے جو اس پتھر کو نکالتے ہی باہر آنا شروع ہو جائے گا۔

''بابا صاعق...... کیا خیال ہے ایک ذرا سا پتھر نکال کر دیکھ نہ لوں۔'' ساحل عمر نے پوچھا۔

''کیوں رمز شاس کیا کہتے ہو۔'' بابا صاعق نے خود فیصلہ دینے کے بجائے فیصلہ سمار ملوک پر چھوڑ دیا۔

''میرا خیال ہے کہ پہلے وہ کام کیا جائے جس کے لئے ہم یہاں آئے ہیں۔ پھر اس خزانے کو دیکھیں گے۔'' سمار ملوک نے کہا۔

''پھر شاید دیر ہو جائے۔'' بابا صاعق نے دھیرے سے کہا۔

یہ بات ساحل عمر نے سنی نہ سمار ملوک نے...... وہ دونوں فوراً ہی تابوت کی طرف متوجہ ہو گئے تھے۔

''اے رمز شاس اب کیا کروں......؟ کیا اس تلوار سے برف کو توڑنا شروع کروں۔'' ساحل عمر نے تابوت کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''نہیں تلوار سے توڑنا نہیں ہے...... لاؤ یہ روشنی مجھے دو۔ میں روشنی دکھاتا ہوں۔ تم دونوں ہاتھ میں تلوار لے کر اس برف کی قبر پر زور سے وار کرو۔'' یہ کہہ کر سمار ملوک نے اس کے ہاتھ سے ٹارچ لے لی۔

ساحل عمر نے دونوں ہاتھ سے تلوار پکڑنے سے پہلے اپنے گلے میں پڑا تعویذ کپڑوں سے باہر نکالا۔ پھر اس نے اپنے دائیں ہاتھ کی مٹھی میں اسے لے لیا۔ تعویذ کو زور سے دبایا۔ اسے قوت کی ایک لہر پورے بدن میں سرایت کرتی ہوئی محسوس ہوئی۔ پھر اس نے اس تعویذ کو بائیں ہاتھ کی مٹھی میں تھام کر زور سے بھینچا۔ فوراً ہی طاقت کا دریا اس اپنے بدن میں موجزن محسوس ہوا' پھر جیسے کسی نے کہا۔ ''وار کر فتح تیری ہوگی۔''

اس اشارے کے بعد اب ساحل کو کسی مزید اشارے کی ضرورت نہیں تھی۔ اس نے اللہ کا نام لے کر برف کی قبر پر دونوں ہاتھوں سے وار کیا۔ تلوار برف میں دھنس گئی اور برف کا شیشہ چیخ گیا۔ جب اس نے تلوار کھینچی تو پوری تلوار خون آلود تھی۔ برف پر بھی خون دکھائی دے رہا تھا۔

اس خون کو دیکھ کر سمار ملوک کے چہرے پر خوشی دوڑ گئی۔ اس کا ایک اور خواب سچا ہو گیا تھا۔ اس نے فخر سے بابا صاعق کی طرف دیکھا۔ بابا صاعق نے مسکرا کر گردن اثبات میں ہلائی جیسے کہہ رہے ہوں' میں جانتا ہوں کہ تم سچے خواب دیکھتے ہو۔

چند لمحوں بعد وہ خون اچانک تلوار سے غائب ہو گیا۔ برف پر بھی خون کا کوئی نشان باقی نہ رہا۔ اب ساحل عمر نے ذرا سا فاصلہ دے کر دوسرا وار کیا' تلوار باہر نکالی تو وہ خون آلود تھی۔ برف پر بھی

تازہ تازہ خون دکھائی دے رہا تھا۔ چند لمحوں بعد تلوار پھر صاف ہو گئی۔
اس طرح ساحل عمر نے فاصلہ دے کر سات وار کئے۔ جب اس نے ساتواں وار کر کے تلوار اوپر اٹھائی تو وہ برف کی قبر سات حصوں میں تقسیم ہو گئی۔ برف کی سلیں پھسل پھسل کر چبوترے سے نیچے جا گریں۔ چبوترے پر صرف تابوت رکھا رہ گیا۔
ساحل عمر نے پھر تلوار اٹھائی اور شیشے والے حصے پر ایک زوردار ضرب لگانا چاہی تو سارملوک نے فوراً اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ "اے ساحل عمر نہیں۔"
"کیوں آخر؟"
"ہم اسے مع تابوت اپنی بستی میں لے جائیں گے۔ وہاں جا کر بستی والوں کے سامنے اس کا حساب کتاب کریں گے۔" سارملوک نے یہ فیصلہ اچانک ہی کیا تھا۔ اس فیصلے کی تائید کے لئے اس نے بابا صاعق کی طرف دیکھا۔ "کیوں بابا کیا کہتے ہو؟"
"ہاں تم نے ٹھیک سوچا۔"
"بابا صاعق آپ ساحل عمر کو لے کر نیچے پہنچیں، میں تابوت اٹھوا کر آپ کے پیچھے آتا ہوں۔"
"اور اے رمز شناس...... اس خزانے کو کب نکالیں گے۔" ساحل عمر نے سوال کیا۔
"ساحل عمر...... یہ خزانہ نکالنے کا مناسب وقت نہیں۔ خزانہ یہاں سے کہیں نہیں جائے گا۔ خزانے کو راعین کے خاتمے کے بعد نکالیں گے۔" پھر وہ بابا صاعق سے مخاطب ہوا۔ "کیوں بابا ٹھیک ہے نا۔"
"ہاں ٹھیک ہے۔" بابا صاعق نے گردن ہلائی۔ "تو پھر چلیں آپ۔" سارملوک نے کہا۔
بابا صاعق ساحل عمر کو ساتھ لے کر غار سے باہر نکل آئے اور دھیرے دھیرے قدم جماتے ہوئے کوہ ویراں سے نیچے اترنے لگے۔
ان کے جانے کے بعد رمز شناس سارملوک نے بستی کے نوجوانوں کی مدد سے راعین کے تابوت کو غار سے باہر نکالا اور پھر وہ اس تابوت کو لے کر بہت احتیاط سے نیچے اترنے لگا۔

☆......☆......☆

جب یہ تابوت بستی میں پہنچا تو ہر طرف ہلچل مچ گئی۔ کیا بچے، کیا عورتیں، کیا بوڑھے...... سب اپنے اپنے گنبدوں سے نکل کر اس تابوت کے ساتھ لئے۔
راعین کے تابوت کو چھ نوجوانوں نے اپنے کندھوں پر اٹھایا ہوا تھا۔ وہ بہت بھاری تابوت تھا۔ اتنا بھاری کہ ان نوجوانوں کے کندھے بھاری بوجھ سے جلدی ٹوٹنے سے تھے۔ پچاس قدم چلنا بھی دوبھر ہو جاتا تھا۔ فوراً ہی چھ نوجوانوں کی دوسری ٹولی ان کی جگہ لے لیتی تھی۔
تابوت کے آگے بابا صاعق، سارملوک اور ان کے درمیان ساحل عمر گھوڑوں پر سوار چل رہے تھے۔ ساحل عمر کے ہاتھ میں ننگی تلوار موجود تھی۔ بستی کا بچہ بچہ جانتا تھا کہ یہ تلوار کس کی ہے۔ سب کو اس بات پر حیرت تھی کہ بستی کے رمز شناس سارملوک کی شاہی تلوار اس شخص کے ہاتھ میں کیسے

آئی...... یہ کون ہے؟

ساحل عمر کا چہرہ کنٹوپ میں چھپا ہوا تھا' صرف آنکھیں نظر آرہی تھی۔ آنکھوں سے یہ اندازہ لگانا مشکل تھا کہ آیا یہ کوئی بستی کا نوجوان ہے یا کسی اور دنیا کی مخلوق ہے۔ کہیں اور سے آیا ہے۔

بابا صاعق کا خیال تھا کہ اس تابوت کو میدان فنا میں لے جایا جائے۔ لیکن سارملوک نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ ہمیں اپنی بستی کا قبرستان اس خبیث کے وجود سے گندا نہیں کروانا۔ پھر یہ طے ہوا کہ اس تابوت کو ایسی جگہ لے جا کر رکھا جائے جہاں بستی کا ہر بچہ بآسانی اس کی موت کا نظارہ کر سکے اور اس کے وجود سے اس جگہ کا تقدس بھی خراب نہ ہو...... ایسی جگہ بستی کے مغرب میں ہی ہو سکتی تھی اور وہ مقام تھا کالا پہاڑ...... کالا پہاڑ کے بارے میں روایت مشہور تھی کہ اس کے آس پاس کبھی ایک بستی آباد تھی جو اپنی نافرمانی کی وجہ سے تباہ و برباد ہوگئی۔ اس پہاڑ پر آسمانی بجلی گری جس سے پہاڑ جل کر کالا ہو گیا۔ آس پاس کی آبادی بھی جل کر راکھ ہوگئی۔ اس کے بعد سے یہ علاقہ کبھی آباد نہ ہو سکا۔ یہ ایک بہت وسیع و عریض میدان تھا جس کے دمیان میں کالا پہاڑ کھڑا تھا۔ یہ پہاڑ زیادہ اونچا نہ تھا اس پر چڑھنا بھی مشکل نہ تھا۔ پھر یہی طے ہوا کہ اس تابوت کو اس پہاڑ کی چٹان پر رکھ دیا جائے۔

جس بستی والوں کو یہ معلوم ہوا کہ اس تابوت کو کالے پہاڑ کی طرف لے جایا جا رہا ہے تو بستی کے بچوں نے فوڑا ادھر کا رخ کیا۔ نوجوان لڑکیاں بھی اس طرف دوڑیں تا کہ انہیں سب سے آگے جگہ مل سکے۔

جب یہ تابوت کالے پہاڑ کے دامن میں پہنچا تو بستی کا ایک ایک بچہ یہاں پہلے سے موجود تھا۔ ایک اونچی چٹان پر اس تابوت کو رکھا گیا۔

پھر اس تابوت کو کھول کو رائین کی ''زندہ لاش'' اور کتاب سحر باہر نکالی گئی اور پھر تابوت بند کر کے اس پر ''زندہ لاش'' کو رکھ دیا گیا اور یہ کتاب اس کے سینے پر رکھ دی گئی۔

اس کے بعد اعلان ہوا کہ بستی کا جو بھی آدمی اس ''زندہ لاش'' کا قریب سے نظارہ کرنا چاہتا ہے۔ وہ اوپر آ جائے۔ اس اعلان سے بستی والوں میں ایک جوش و ولولہ پیدا ہو گیا۔ بھلا کون ایسا تھا جو اس منحوس کا چہرہ دیکھنا نہ چاہتا ہو۔ فوڑا ایک لائن لگ گئی۔ لوگ آتے گئے' دیکھتے گئے۔

اب اس عفریت کے جاگنے میں صرف چوبیس گھنٹے باقی تھے۔ اسکے چہرے پر زندگی کے آثار پیدا ہوتے جا رہے تھے۔ غور سے دیکھنے پر یوں محسوس ہوتا تھا جیسے اس کی پلکیں لرز رہی ہوں۔

پھر اس بستی کا رمز شناس سارملوک باوقار چال چلتا اس چٹان پر آیا جہاں تابوت پر رائین کی لاش رکھی تھی۔ اس کے اوپر آتے ہی بستی کا کوئی بھی فرد بستی پر کھڑا نہ رہ سکا۔ سب نیچے چلے گئے۔ تب سارملوک نے بابا صاعق کو اشارہ کیا تو وہ دھیرے دھیرے چلتا چٹان پر پہنچ گیا۔

پھر سارملوک نے رائین کے بارے میں بستی والوں کو تفصیل سے بتایا کہ وہ کون ہے؟ جب وہ اس کا مکمل تعارف کروا چکا تو پھر اس نے بتایا۔ ''بستی والو! اس عفریت کے جاگنے میں صرف چوبیس گھنٹے باقی ہیں۔ اسے جاگنے سے پہلے ہی ابدی نیند سلانا ہو گا اور یہ کام کرے گا ایک بہادر نوجوان

ساحل عمر۔"

"یہ کون ہے؟ کہاں سے آیا ہے؟" چاروں طرف سے ایک شور اٹھا۔

"بستی والو...... بس اتنا جان لو کہ یہ ہماری بستی کا نہیں ہے۔ ہم سا نہیں ہے۔ ہم میں سے نہیں ہے۔ کہیں اور سے آیا ہے لیکن یہ ہمارا نجات دہندہ ہے۔ ہمارے لئے قابل احترام ہے۔ تمہیں جان کر خوشی ہو گی کہ اس نوجوان نے اس عفریت کا مدفن تلاش کیا اور اب یہ عفریت اس نوجوان کے ہاتھوں ابدی نیند سوئے گا۔"

اتنی دیر میں ساحل عمر چٹان پر پہنچ چکا تھا۔ اس کے ہاتھ میں تلوار موجود تھی اور اس کا چہرہ ابھی تک ڈھکا ہوا تھا۔ تب مجمعے سے ایک دم شور اٹھا۔

"اے رمز شناس...... ہمیں اپنے نجات دہندہ کا چہرہ دکھا۔"

تب سار ملوک، ساحل عمر کی طرف بڑھا اور اس نے کنٹوپ کا پھندا پکڑ کر ایک جھٹکے سے کھینچ لیا۔ ایک دم کنٹوپ اسکے سر، چہرے اور گردن سے سرک کر سار ملوک کے ہاتھ میں آ گیا۔

ساحل عمر کا چہرہ سامنے آیا تو بستی کے لوگ دم بخود تھے۔ ایسا حسین نوجوان انہوں نے آج تک نہ دیکھا تھا۔ وہ اسے دیکھتے رہ گئے۔ اس بستی کی لڑکیوں کا تو سانس رک گیا۔ کئی لڑکیوں کے دل میں ہوک اٹھی۔ کاش وہ اس کا ہاتھ پکڑ سکیں، وہ اس کا مور بن سکتا۔ جشن شادی میں صرف چوبیس گھنٹے باقی تھے۔ سب لڑکیاں اپنے اپنے مور منتخب کر چکی تھیں۔

تابوت کے قریب ہی الاؤ تیار کیا جا رہا تھا کہ کتاب سحر کو جلایا جا سکے۔ جب الاؤ بھڑک اٹھا تو سار ملوک نے ساحل عمر کو اشارہ کیا کہ وہ کتاب اٹھا کر الاؤ میں جھونک دے۔ ساحل عمر اشارہ پا کر "ربطول" کی طرف بڑھا۔ پھر وہ راعین کی لاش کے سامنے ٹھہر گیا۔ ربطول کو ہاتھ لگانے سے پہلے اس نے تعویذ کو اپنے کپڑوں سے باہر نکالا اور اسے اپنی مٹھی میں لے لیا۔ پھر یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے کہا ہو۔"اس تعویذ کو اپنی پیشانی پر رکھ کر آہستہ سے دباؤ۔"

ساحل عمر نے وہ تعویذ فوراً اپنی پیشانی پر رکھ لیا اور اسے دھیرے سے دبایا۔ دباتے ہی اس کے جسم کے اندر بجلیاں سے کوند گئیں۔ اسے اپنے اندر بے پناہ طاقت اور تحفظ کا احساس ہوا۔

پھر اس نے تعویذ چھوڑ کر کتاب سحر "ربطول" اٹھائی۔ اس کتاب کو چمڑے کے باریک ورقوں پر سفید رنگ سے کسی نامانوس زبان میں لکھا گیا تھا۔ کتاب کے صفحات کا رنگ گہرا بھورا تھا۔ اس نے اس کتاب کا ایک ورق جھٹکے سے الگ کیا اور اس ورق کو بابا صاعق کے ہاتھ میں دے کر کہا۔"بابا! شروع کیجئے۔"

بابا صاعق نے اس ورق کو آگے بڑھ کر الاؤ میں ڈال دیا۔ اس ورق کو الاؤ میں ڈالتے ہی بابا صاعق کو گرمی سی لگی اور پھر یہ تپش آہستہ آہستہ بڑھنے لگی۔

دوسرا ورق پھاڑ کر اس نے سار ملوک کو دیا۔ اس نے جلدی سے آگے بڑھ کر اس ورق کو الاؤ میں جھونک دیا۔ اس ورق کو الاؤ میں ڈالتے ہی سار ملوک کو گرمی سی لگی اور پھر یہ تپش آہستہ آہستہ بڑھنے لگی۔

تیسرا ورق پھاڑ کر اس نے پھر بابا صاعق کے حوالے کیا۔
بابا صاعق نے کتاب سحر کا تیسرا ورق پکڑ کر الاؤ میں ڈال دیا۔ ان کے اندر کی گرمی میں مزید اضافہ ہو گیا۔

ساحل عمر ایک ایک کر کے کتاب کے ورق پھاڑ پھاڑ کر باری باری دونوں کو دیتا گیا۔ جب سات سات ورق دونوں آگ میں جھونک چکے تو ان کے اندر کی گرمی ناقابل برداشت ہو گئی۔ انہیں یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ دونوں خود الاؤ میں کھڑے ہوں اور آگ انہیں جلا رہی ہو۔ یہ ایک ایسی آگ تھی جو لگی ہوئی تو تھی لیکن دکھائی نہیں دے رہی تھی جب پندرہواں ورق ساحل عمر نے سار ملوک کی طرف بڑھایا تو وہ خوف سے پیچھے ہٹ گیا اور بولا۔ ''نہیں۔'' ''کیا ہوا؟'' ساحل عمر نے اسے پریشان ہو کر دیکھا۔

''میرے اندر آگ لگی ہوئی ہے۔ مجھ پر پانی ڈالو'' سار ملوک اپنے دونوں ہاتھوں سے پنکھا جھلتا ہوا بولا۔

''میرا بھی یہی حال ہے۔'' بابا صاعق بھی فوراً گھبرا کر بولے۔ ''ہم کس مصیبت میں پھنس گئے۔''

ابھی ساحل عمر سوچ ہی رہا تھا کہ کیا کرے۔ اتنے میں مجمع سے آواز آئی۔ ''آگ' آگ۔''

ساحل عمر نے سامنے کھڑے لوگوں پر نظر ڈالی۔ وہ سارے کے سارے اذیت میں تھے اور دردناک انداز میں چیخ رہے تھے۔ ''آگ' آگ۔''

لیکن آگ کہیں نہیں دکھائی دے رہی تھی۔ آخر یہ کیسی آگ تھی جو لگی ہوئی تو تھی لیکن دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ شاید وہ جسموں کے اندر لگی ہوئی تھی۔ ساحل عمر اس آگ سے محفوظ تھا۔ وہ پورے اطمینان سے کھڑا تھا۔ پھر اسے تعویذ کو چھونے کا خیال آیا۔ اس نے فوراً تعویذ پر اپنا انگوٹھا رکھ دیا۔ اسی وقت کہیں سے آواز آئی۔ ''اس منحوس کتاب کو فوراً الاؤ میں پھینک دو۔''

ساحل عمر اس ہدایت کو سنتے ہی تیزی سے آگے بڑھا اور کتاب سحر کی دونوں جلدیں الاؤ میں اچھال دیں۔ ادھر وہ کتاب آگ میں گری ادھر سار ملوک اور بابا صاعق کے چہروں پر سکون چھا گیا۔ مجمع سے بھی آگ' آگ کی آواز آنا بند ہو گئی۔

یہاں سے وہاں تک ہر شخص کا دل ٹھنڈا ہو گیا۔ اس کے جسم میں لگی ہوئی آگ پر جیسے پانی پڑ گیا۔

لوگوں کے اندر کی آگ بجھی تو اچانک چیخوں کی آواز آنے لگی۔ یہ بہت بھیانک چیخیں تھیں۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے سینکڑوں مرد اور عورتیں مل کر زور زور سے رو رہے ہوں' کراہ رہے ہوں' چیخ رہے ہوں۔

ساحل عمر نے گھبرا کر مجمع کی طرف نظر ڈالی لیکن مجمع بڑے اطمینان سے کھڑا ہوا تھا۔ سار ملوک اور بابا صاعق کے چہرے بھی پرسکون تھے لیکن وہ چیخیں اب بھی بلند ہو رہی تھیں۔ پھر ان چیخوں میں بادلوں کی گرج اور بجلیوں کی کڑک بھی شامل ہو گئی۔ چند ساعتوں کو گھپ اندھیرا چھا گیا جیسے پورا

سورج اچانک گرہن میں آ گیا ہو۔ کتاب سحر دھڑ دھڑ جل رہی تھی۔ یہاں تک کہ اس کا آخری ورق بھی جل کر خاک ہو گیا۔

پوری کتاب کے جلتے ہی نہ چیخوں کی آواز رہی' نہ بجلی کی کڑک اور نہ ہی اندھیرا۔ ہر چیز اپنے معمول پر آ گئی۔ بابا صاعق اور سمار ملوک نے ساحل عمر کو بڑے فخر سے دیکھا۔ اس نے اس دنیا کو اس شیطانی کتاب سے نجات دلا دی تھی جو انسانیت کی دشمن تھی جس کے شر سے کوئی بھی مخلوق محفوظ نہ تھی۔

کتاب شر جو اللہ کی مخلوق کے لئے باعث اذیت تھی' وہ نیست و نابود ہو چکی تھی لیکن ابھی وہ فتنہ باقی تھا جسکے جگنے سے قیامت سے پہلے قیامت آ سکتی تھی۔ ابھی اس عفریت کا خاتمہ باقی تھا۔

اب ساحل عمر راعین کی لاش کی طرف متوجہ ہوا۔ اس نے اپنی تلوار کی نوک سے اس کا جسم چھوا تو وہ پتھر کی طرح سخت محسوس ہوا۔ اس نے تلوار اس کے سینے پر دوبارہ ماری۔ یوں محسوس ہوا جیسے تلوار کسی پتھر سے ٹکرائی ہو۔ کھٹ کھٹ کی آوازیں آئیں۔ تب ساحل عمر نے راعین کے جسم کا ایک ایک حصہ تلوار سے بجا ڈالا' ہر حصہ پتھر کی طرح سخت تھا۔

ساحل عمر نے بابا صاعق اور سمار ملوک کی طرف باری باری دیکھا اور بولا۔ ''یہ تو چٹان کی طرح سخت ہے۔ اس پر تلوار کا وار کارگر نہ ہو گا۔''

''وار کر کے تو دیکھو۔'' سمار ملوک نے ہدایت کی۔

''اچھا!'' ساحل عمر نے یہ کہہ کر تلوار اپنے دونوں ہاتھوں میں تھامی اور ذرا سا پیچھے ہٹ کر راعین کے پیٹ پر ایک بھرپور وار کیا۔

لاش کا کچھ نہ بگڑا' البتہ ساحل کے ہاتھ ضرور جھنجھنا گئے۔ تلوار جیسے کسی پتھر پر پڑی تھی۔ کھٹ کی زوردار آواز آئی تھی۔ یہ دیکھ کر سمار ملوک پریشان ہو گیا۔ اس نے ساحل عمر کے نزدیک آ کر کہا۔ ''ذرا' اس کی گردن پر وار کر کے دیکھو۔''

ساحل عمر نے گردن اثبات میں ہلائی اور اس کی گردن کے سامنے کھڑے ہو کر ایک بھرپور وار کیا لیکن نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات...... لاش کا کچھ نہ بگڑا' پتھر سے ٹکرانے جیسی آواز پیدا ہوئی۔

وار کی ناکامی نے بابا صاعق اور سمار ملوک کے چہرے ایک دم سفید کر دیئے۔ وہ دونوں گھبرا گئے۔ اب کیا ہو گا۔ اگر اسکو نیست و نابود نہ کیا گیا تو یہ جاگ کر وہ فتنے اٹھائے گا کہ اس بستی کا نام و نشان تک نہیں رہے گا۔

''اسے جلتے الاؤ میں ڈال کر دیکھا جائے۔'' بابا صاعق نے سمار ملوک کی طرف دیکھا۔

''یہ پتھر کی طرح سخت ہے...... بھلا پتھر کا آگ کیا بگاڑے گی۔'' سمار ملوک فکر مند ہو کر بولا۔

تب ساحل عمر کے دل میں تعویذ پکڑنے کا خیال آیا۔ اس نے دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''پریشان نہ ہوں' میں کرتا ہوں کچھ۔''

یہ سن کر دونوں کی آنکھوں میں چمک آ گئی۔ ''ہاں تم ہی کچھ کر سکتے ہو۔''

ساحل عمر نے اپنے گلے میں پڑے چاندی کے تعویذ کو مٹھی میں لے لیا۔ اسی وقت اسے ایسا محسوس ہوا جیسے کسی نے کہا ہو۔ ''اس منحوس کی آنکھوں پر وار کرو۔''

''اوہ!'' اس آواز کو سن کر ساحل عمر کے چہرے پر خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ ''یہ ہوئی نہ بات۔''

وہ راعین کی لاش کے قریب ہوا۔ اس نے جھک کر اس کی آنکھوں میں بغور دیکھا۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے اس کی پلکوں میں ہلکی سی لرزش ہو۔ اب اسے یقین ہو گیا کہ اس کی آنکھوں کے ذریعے ہی اسے مارا جاسکتا ہے۔ اس نے اللہ کا نام لے کر تلوار اونچی کی اور پوری طاقت سے اس کی دائیں آنکھ پر وار کیا۔ تلوار کی نوک بہت آسانی سے آنکھ کے اندر گھستی چلی گئی۔

اس نے جلدی سے دائیں آنکھ سے تلوار نکال کر بائیں آنکھ میں گھسیڑ دی۔

بائیں آنکھ سے تلوار نکلتے ہی خون ابل کر باہر آیا' یہ کالے رنگ کا خون تھا اور کسی فوارے کی طرح نکلا تھا۔ ساحل عمر نے جلدی سے اس کی دائیں آنکھ سے بھی تلوار کھینچ لی اور فوراً پیچھے ہٹ گیا۔ دائیں آنکھ سے بھی کالا خون کسی فوارے کی مانند باہر نکلا۔

اس کی دونوں آنکھوں سے یہ کالا خون بہت تیزی سے نکل رہا تھا۔ یہ خون چٹان پر بہتا ہوا نیچے جا رہا تھا۔ جیسے جیسے اس کی آنکھوں سے خون نکلتا جا رہا تھا' ویسے ویسے اس کی لاش پچکتی جا رہی تھی۔

کہیں دور سے زبردست دھماکوں کی آوازیں آ رہی تھیں جیسے کسی محاذ پر جنگ ہو رہی ہو۔ توپ کے گولے پھٹ رہے ہوں۔ بم گرائے جا رہے ہوں۔ ان دھماکوں کی دھمک سے کالا پہاڑ بھی لرز رہا تھا۔

پھر جب تک اس کی آنکھوں سے خون فواروں کی مانند نکلتا رہا' دھماکوں کی آوازیں آتی رہیں جیسے ہی خون بند ہوا' دھماکوں کی آوازیں آنا بند ہو گئیں۔

اب تابوت پر جو ڈھانچہ رہ گیا تھا اس کی ہڈیاں بھی پگھل کر بہہ رہی تھیں۔ کچھ دیر کے بعد یہ ہڈیاں بھی نہ رہیں۔ اس کی پوری لاش پانی بن کر بہہ گئی۔ البتہ اس کی کھوپڑی کو کچھ نہ ہوا۔ کھوپڑی کا ڈھانچہ سلامت رہا۔

ساحل عمر نے اس کی کھوپڑی کو اپنی تلوار کی نوک پر اٹھا لیا اور اپنا ہاتھ اونچا کر کے چٹان سے نیچے اترنے لگا۔

اسی وقت پیچھے سے آواز آئی۔ ''ٹھہرو!''

ساحل عمر کو فوراً ہی اپنی غلطی کا احساس ہو گیا۔

☆......☆......☆

وہ اصل میں جوش میں آ گیا تھا۔ راعین کی موت کی خوشی میں اسے اس بات کا خیال نہیں رہا تھا کہ وہ کسی اور کی بستی میں ہے اور اس بستی کا مالک و مختار رمز شناس سمار ملوک ہے' اس کی اجازت کے بغیر اسے راعین کا سر لے کر نیچے نہیں جانا چاہیے تھا۔

''ٹھہرو۔'' کی آواز پر اس کے بڑھتے قدم فوراً رک گئے اور پھر وہ فوراً واپس آ کر سمار ملوک کے سامنے آ کھڑا ہوا۔

''اے ساحل عمر! ہمیں بھی اپنی خوشی میں شامل کر۔'' سمار ملوک خوشدلی سے بولا۔ ''تم اکیلے ہی نیچے بھاگے جا رہے ہو۔ ہمیں بھی اپنے ساتھ لے کر چلو۔''

''اے رمز شناس ضرور...... مجھ سے غلطی ہوئی' معافی کا طلب گار ہوں۔''

''ایسا نہ کہو...... تم ہمارے نجات دہندہ ہو' ہمارے محسن ہو' ہمارے لیے قابل احترام ہو۔'' یہ کہہ کر سمار ملوک نے ساحل عمر کا اٹھا ہوا ہاتھ جس میں تلوار تھی اور تلوار کی نوک پر کھوپڑی تھی پکڑ لیا۔ پھر بابا صاعق نے بھی ایسا ہی کیا۔ اس کے بعد وہ تینوں آہستہ آہستہ چٹان سے نیچے اترنے لگے۔

ان کو نیچے اترتا دیکھ کر مجمع میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ اس عفریت کی موت نے بستی کے ہر شخص میں ایک جوش بھر دیا تھا۔ وہ اس کھوپڑی کو قریب سے دیکھنے کے لئے بے چین تھے۔

مجمع ان کو اپنے قریب دیکھ کر کائی کی طرح چھٹ گیا۔ وہ تینوں لوگوں کے درمیان سے گزرنے لگے۔ رمز شناس کا چہرہ خوشی سے تمتمایا ہوا تھا۔ بابا صاعق کے چہرے پر بھی چمک تھی۔ ساحل عمر تو خوش تھا ہی کہ یہ سارا کارنامہ ہی اس کا تھا۔ وہ مجمع میں کسی کو ڈھونڈ رہا تھا مگر اس کی نظریں تلاش میں ناکام ہو کر بار بار پلٹ رہی تھیں' بھٹک رہی تھیں۔

ساحل عمر کو بڑی حیرت تھی۔ بستی کا بچہ بچہ یہاں موجود تھا لیکن نہیں تھی تو وہ نہیں تھی۔ لیکن یہ بات قرین قیاس نہ تھی۔ یہ ممکن ہی نہ تھا کہ وہ یہاں نہ ہو۔ وہ یہاں ضرور ہو گی۔ اتنے رش میں اسے دیکھ لینا بھی تو آسان نہ تھا۔ اگر وہ یہاں ہو گی تو خود ہی سامنے آئے گی۔ یہ سوچ کر وہ پورے اطمینان سے مجمع کے درمیان سے گزرنے لگا۔

پھر یہ جلوس بستی کے چوک پر پہنچ کر رک گیا۔

اس کھوپڑی کو جائے عبرت بنا دینا چاہیے۔ لہٰذا فوراً ہی اس کا انتظام کیا گیا۔ ایک مضبوط نیزے پر اس کھوپڑی کو منتقل کر دیا گیا اور یہ نیزہ چوک کے درمیان میں گاڑ دیا گیا۔

اس کے بعد بستی کے رمز شناس سمار ملوک نے ایک خاص اعلان کیا۔ کل رات کو شادی کا جشن منایا جانا تھا۔ سمار ملوک چاہتا تھا کہ اس جشن کو سات دن کے لئے ٹال دیا جائے لیکن اس التواء کے لئے اسے ان لڑکیوں سے اجازت لینا ضروری تھی جن کی کل شادی ہونے والی تھی۔

تب سمار ملوک نے ان لڑکیوں سے مخاطب ہو کر کہا۔ "اپنے اپنے موروں کو منتخب کرنے والی لڑکیو! میں چاہتا ہوں کہ تمہاری شادی کا جشن سات دن کے لئے آگے بڑھا دوں...... کیا تم اس بات کے لئے راضی ہو۔"

"اے رمز شناس...... آخر ایسا کیوں؟" ایک امیدوار دوشیزہ نے سوال اٹھایا۔

"میں اس جشن کو یادگار بنانا چاہتا ہوں۔" سمار ملوک نے پرجوش انداز میں کہا۔

"وہ کیسے؟" کئی دوشیزاؤں نے بیک وقت پوچھا۔

"اگر اس جشن میں رشا ملوک بھی شامل ہو جائے تو کیا یہ جشن یادگار نہیں ہو جائے گا۔" سمار ملوک نے اطلاع دی۔

"ہو جائے گا' ضرور ہو جائے گا۔" کئی لڑکیوں نے بیک وقت کہا۔ "کیا رشا ملوک نے اپنا مور منتخب کر لیا۔"

"یہ بات تو ہمیشہ راز رہتی ہے۔ یہ بات تو اسی رات ظاہر ہو گی۔" سمار ملوک نے اس کا راز نہ کھولا۔

"ٹھیک ہے۔"

"بس تو پھر طے ہوا کہ شادی کا جشن سات دن بعد منایا جائے گا۔"

"طے ہوا؟" بہت سی لڑکیوں نے یک زبان ہو کر نعرہ لگایا۔

"بس پھر اپنے اپنے گنبدوں کو جاؤ اور جشن کی رات کا انتظار کرو۔" سمار ملوک نے اعلان ختم کیا۔

یہ سنتے ہی بستی کے مرد' عورتیں' بچے اور لڑکیاں چھٹنے لگیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے چوک خالی ہو گیا۔

اب جو ساحل عمر نے نظر گھمائی تو اس کے دل میں انار پھوٹنے لگے۔ رشا ملوک اور مویا اس کے سامنے کھڑی تھیں۔

رشا ملوک نے ایک نظر ساحل عمر کی طرف دیکھا اور پھر فوراً ہی پلکوں کی چلمن گرالی۔ اس کے چہرے پر حیا کی سرخی دوڑ گئی۔ وہ سر جھکا کر شرمیلی مسکراہٹ کے ساتھ مویا کا ہاتھ پکڑ کر نزدیک کھڑی شاہی کٹاری کی طرف بھاگی۔ پھر وہ پردے میں چھپ کر بیٹھ گئی اور کٹاری فوراً ہی محل کی جانب روانہ گئی۔

☆......☆......☆

راعین جہنم واصل ہو چکا تھا۔ کتاب سحر جل کر خاک ہو چکی تھی۔ دو بڑے اور اہم کام ہو گئے تھے لیکن ابھی ایک کام اور باقی تھا اور یہ کام بھی چھوٹا نہ تھا' غیر اہم نہ تھا۔

اسے ایک مرتبہ اور راعین کے مدفن جانا ہوگا۔ ان چار ستونوں میں جو خزانہ بھرا ہے اسے نکالنا ہوگا۔ اگرچہ یہ بات یقینی نہ تھی کہ ان ستونوں میں خزانہ ہی بھرا ہے لیکن غالب امکان یہی تھا کہ ستون خالی نہیں ہیں۔ ان میں ضرور ہیرے جواہرات بھرے ہیں۔ اچھا یہ ہوتا کہ وہ ایک پتھر نکال کر اس بات کی تصدیق کر لیتا لیکن بابا صاعق اور سمار ملوک نے ایسا نہ کرنے دیا۔ انہیں اس بات کا یقین تھا کہ ستونوں میں خزانے کے سوا کچھ نہیں۔ اس لئے انہوں نے وقت کے ضیاع سے بچنے کے لئے اس طرف توجہ نہ دی۔ اصل مسئلہ تو راعین اور کتاب سحر کا خاتمہ تھا۔ اس کام میں دیر نہیں ہونا چاہیے تھی۔ اگر ستونوں میں خزانہ تھا تو وہ کہیں نہیں بھاگا جا رہا تھا۔

اب وہ دونوں کام بخیر و خوبی ہو چکے تھے۔ اب خزانہ نکال لینے کا فریضہ بھی انجام دے لینا چاہیے تھا۔ ابھی سات دن باقی تھے۔ یہ کام تین چار دن میں بآسانی انجام دیا جا سکتا تھا۔

اس کام کے لئے اس کو خود ہی جانا ہوگا۔ ممکن ہے سمار ملوک بھی اس کے ساتھ جانا چاہے۔ اس سلسلے میں اس سے بات کرنا ہوگی۔

ساحل عمر کے اصرار پر سمار ملوک نے اسے اس مہم پر جانے کی اجازت تو دے دی لیکن خود نہیں گیا۔ اس نے اس کے ساتھ بازغر کو بھیج دیا۔ بازغر سمار ملوک اور بابا صاعق کا اک بااعتماد شخص تھا۔ پھر ساحل عمر بھی اسے اچھی طرح جانتا تھا اس کے ساتھ وہ سفر بھی کر چکا تھا۔ اب بازغر پھر اس کے ساتھ مہم پر جا رہا تھا' یہ بات ساحل عمر کیلئے خوشی کی تھی۔ بازغر ایک بہت سمجھدار شخص تھا۔ وہ بہت اچھی باتیں کیا کرتا تھا۔

بازغر نے اس مہم کے لئے چالیس نوجوانوں کا انتخاب کیا' اس حساب سے خچر اور گھوڑوں کا انتظام کیا گیا۔ خزانہ لانے کی صورت میں کن کن چیزوں کی ضرورت پڑے گی' وہ اکٹھا کی گئیں اور پھر یہ قافلہ چل پڑا۔

رات کو اس قافلے نے کوہ ویراں کے دامن میں پڑاؤ ڈالا۔ پھر صبح ہوتے ہی یہ لوگ کوہ ویراں کی بلندی کو ناپنے لگے۔ پھر ایک وقت آیا کہ انہیں اپنے گھوڑے' خچر چھوڑنے پڑے۔ اب پیدل سفر شروع ہوا۔

بالآخر ساحل عمر اور بازغر نے راعین کے مدفن کو پالیا۔ ان کے پیچھے پیچھے نوجوان بھی پہنچ گئے۔ ساحل عمر نے ان میں سے چار نوجوانوں کو اپنے ساتھ لیا' باقی نوجوانوں کو باہر کھڑے ہو کر انتظار کرنے کا حکم دیا۔ پھر وہ بازغر اور ان چار نوجوانوں کے ساتھ برف کے غار میں داخل ہوا۔

جب وہ سیڑھیاں اتر کر چبوترے کے نزدیک پہنچا اور اس نے ٹارچ کی روشنی میں غار کا جائزہ لیا تو سب کچھ ویسا ہی پایا جیسا چھوڑ کر گیا تھا۔ البتہ اس غار کی ویرانی مزید بڑھ گئی تھی۔ ایک دہشت اور خوف کی سی فضا تھی۔

ساحل عمر نے ان چاروں نوجوانوں میں سے دو کو چبوترے پر چڑھنے کو کہا' جب وہ نوجوان اوپر چڑھ گئے تو اس نے ٹارچ کی روشنی ستون کے اس چوکور پتھر پر ڈالی جو مختلف رنگ کا تھا۔

''اس پتھر کو خنجر کے ذریعے ڈھیلا کر کے بہت احتیاط سے باہر نکالو۔'' ساحل نے چبوترے

کے نیچے سے ہدایت دی۔ باز غر اس کے برابر کھڑا تھا۔

اس نوجوان نے ساحل عمر کا حکم سن کر اپنی کمر سے بندھا خنجر نکالا اور بہت احتیاط سے پتھروں کے درمیان درز میں خنجر ڈال کر اس پتھر کو ڈھیلا کرنے لگا۔

چند منٹ کی محنت کے بعد وہ پتھر اتنا ڈھیلا ہو گیا کہ اسے انگلی کی گرفت میں لے کر کھینچا جا سکتا تھا۔ اس نوجوان نے پتھر کھینچنے سے پہلے ساحل عمر کی طرف دیکھا۔

''نکالو۔'' ساحل عمر نے کہہ کر ٹارچ کا دائرہ اس پر مرکوز کر دیا اور باز غر کا ہاتھ پکڑ کر خود سیڑھیوں کے نزدیک ہو گیا۔ ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ وہ پتھر نکلتے منظر کو قریب ہو کر دیکھتا لیکن جانے کیا ہوا کہ وہ آگے بڑھنے کی بجائے پیچھے ہٹ گیا اور باز غر کو بھی اپنے ساتھ پیچھے ہٹا لیا۔

بعض اوقات غیر ارادی حرکتوں کے پیچھے قسمت کا فیصلہ چھپا ہوتا ہے۔

اس نوجوان نے ساحل عمر کا حکم سنتے ہی پتھر باہر کھینچ لیا۔ پتھر کا باہر کھنچنا تھا کہ ایک قیامت کا ظہور ہوا۔

پتھر باہر نکالتے ہی وہ ستون دو ٹکڑوں میں اس طرح تقسیم ہو گیا جیسے اسی پتھر کے سہارے کھڑا تھا۔ ستون کا ایک حصہ نوجوان پر گرا۔ دوسرا نوجوان جو اس کے پیچھے کھڑا تھا اس نے ستون کو گرتے دیکھا تو چبوترے سے چھلانگ لگا دی۔ اس ستون کے ساتھ ہی وہ غار بیٹھنے لگا۔ اندر ایک زلزلہ سا آ گیا۔

ساحل عمر سیڑھیوں کے نزدیک تھا۔ اس نے جیسے ہی صورت حال سنگین ہوتے دیکھی۔ وقت ضائع کئے بغیر سیڑھیوں پر چڑھ گیا اور زور سے چیخا۔ ''باز غر بھاگو!''

باز غر نے بھی ستون گرتے دیکھ لیا تھا۔ وہ فوراً ہی اس کے پیچھے لپکا۔

ایک ستون کے گرتے ہی دوسرا' تیسرا ستون ہلا اور پھر چاروں ستون زمین پر آ گرے۔ ستونوں کے گرتے ہی غار کی چھت بیٹھ گئی۔ پتھر نکالنے والے نوجوان کو تو بھاگنے کی مہلت نہ ملی لیکن دوسرا نوجوان جس نے چبوترے سے چھلانگ لگا دی تھی' وہ بھی اس غار سے زندہ نہ نکل سکا۔ سیڑھیوں پر چڑھتے ہی غار کا دہانہ بند ہو گیا۔

وہ تو خیر ہوئی کہ ساحل عمر اور باز غر باہر نکل گئے تھے ورنہ چند لمحوں کی دیر ان کی زندگی چھن جانے کا باعث بن جاتی۔

ساحل عمر نے اوپر والے کا شکر ادا کیا کہ ان کی زندگیاں چھن جانے سے بچ گئیں تھیں۔

اب یہاں رکنا بیکار تھا۔ جو ہونا تھا وہ ہو گیا تھا۔

ساحل عمر کے ساتھ بابا صاعق اور سمار ملوک کو بھی قوی امید تھی کہ ان ستونوں میں خزانہ بھرا ہوا ہے۔ ان ستونوں میں وہ مختلف رنگ کے پتھر کچھ اس طرح لگائے گئے تھے کہ یہ شبہ یقین میں بدل جاتا تھا۔ وہ تو اچھا ہوا کہ ساحل عمر نے اس دن پتھر کھینچ کر نہیں دیکھا ورنہ سمار ملوک اور بابا صاعق کے ساتھ وہ بھی مدفون ہو جاتا۔ وہ اس بات کو سوچ سوچ کر خوش ہو رہا تھا کہ اس دن اس نے پتھر نہ نکال کر کس قدر زبردست کام کیا تھا۔

"بازغر یہاں سے جلد نکل چلو۔" ساحل عمر نے تیز قدم اٹھاتے ہوئے کہا۔ "ابھی ہم نظروں میں ہیں۔"

بازغر نے تائیدی انداز میں گردن ہلائی اور وہ ساحل عمر کے ساتھ تیزی سے نیچے اترنے لگے۔

☆......☆......☆

تیسرے دن صبح کو جب یہ قافلہ واپس بستی میں داخل ہوا تو فوراً ہی یہ خبر سمارملوک کو پہنچائی گئی۔ سمارملوک اطلاع ملتے ہی اپنی شاہی کٹاری پر سوار ہو کر اس قافلے کے استقبال کے لئے نکل کھڑا ہوا...... اس وقت تک یہ قافلہ چوک تک پہنچ چکا تھا۔ اس چوک تک جہاں ایک اونچے نیزے پر راعین کی کھوپڑی لٹکی ہوئی تھی جو سب کے لئے درس عبرت تھی۔

ساحل عمر اور بازغر نے چوک میں کھڑی شاہی کٹاری دیکھی تو دونوں نے اپنے گھوڑوں کو ایڑی لگائی اور آناً فاناً شاہی کٹاری کے نزدیک پہنچ گئے۔

اس بستی کے رمز شناس سمارملوک نے کٹاری سے اتر کر ساحل عمر کے چہرے پر نظر ڈالی تو اسے وہاں خوشی محسوس نہ ہوئی۔ یہی حال بازغر کا تھا۔ وہ دونوں گھوڑوں سے اتر کر خاموشی سے سمار ملوک کے سامنے کھڑے ہو گئے۔

"کیا ہوا؟" سمارملوک کے لہجے میں فکرمندی تھی۔

"ہم اس بستی کے دو نوجوان گنوا بیٹھے۔"

"کیا کہتے ہو۔" سمارملوک کی پیشانی پر بل پڑ گیا۔ "یہ کیسے ہوا......؟ اور خزانہ......"

"اے رمز شناس...... ہم سے غلطی ہوئی...... ہم نے غلط اندازہ لگایا۔ وہاں کوئی خزانہ نہ تھا...... وہ دراصل موت کا شکنجہ تھا۔ اس شکنجے سے ہم تو بچ گئے مگر ہم اپنے دو نوجوانوں کو نہیں بچا سکے۔"

یہ کہہ کر ساحل عمر نے مختصر الفاظ میں وہاں جو بیتی تھی، وہ کہہ سنائی۔

"چلو جو ہوا سو ہوا...... بستی کے دو نوجوانوں کا غار میں دب جانے کا دکھ ہے۔ یہ منحوس......" سمارملوک نے راعین کی کھوپڑی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "ابھی تک ہماری بستی کے لوگوں کو نقصان پہنچائے جا رہا ہے۔"

"بس یہ اس کا آخری داؤ تھا...... اب یہ قصہ ختم ہوا۔ یہ کھوپڑی ہمیشہ کیلئے درس عبرت بنی رہے گی۔"

ساحل عمر نے بڑے یقین سے کہا۔

"بازغر...... تم ساحل عمر کو لیکر اس کی رہائش گاہ جاؤ...... میں جانے والے نوجوانوں کے گنبد ہو کر آتا ہوں۔" سمارملوک نے کہا اور اپنی کٹاری پر چڑھ گیا۔

ساحل عمر اور بازغر گھوڑوں پر سوار ہو کر محل کی طرف چل دیئے۔

☆......☆......☆

جشن کی تیاریاں زور شور سے جاری تھیں۔ میدان جشن کو نت نئی چیزوں سے سجایا جا رہا تھا۔

اس جشن کو یادگار بنانے کے لئے ہر سطح پر کوششیں جاری تھیں۔ اس جشن کو آخری یادگار کیوں نہ بنایا جاتا' اس مرتبہ اس بستی کے رمز شناس کی اکلوتی بیٹی کی شادی تھی۔

اس جشن کے ہر طرف چرچے تھے۔ بستی کی لڑکیاں ایک دوسرے سے پوچھ رہی تھیں۔۔ کسی کو کچھ معلوم نہیں تھا کہ رشا ملوک نے آخر کس کو اپنا مور منتخب کیا ہے' محض اندازے تھے اور قیاس آرائیاں تھیں۔

جشن شادی میں ابھی دو دو راتیں باقی تھیں۔ اس رات مویا اسے کھانا کھلا کر گئی تو وہ اس کول کمرے میں کچھ دیر چہل قدمی کرتا رہا۔ جیسے جیسے شادی کا وقت نزدیک آ رہا تھا' اسے اپنے لوگ یاد آتے جا رہے تھے۔ کاش! وہ اس شادی میں اپنے دوستوں کو شریک کر سکتا۔ اپنی ماں کو اس خوشی میں شامل کر سکتا۔ انہیں کتنی آرزو تھی اس کی شادی کی۔ جب انہیں معلوم ہو گا کہ وہ شادی کر لایا ہے تو وہ لوگ کس قدر ناراض ہوں گے۔ پھر وہ کیا کرے۔ یہ اس کے بس کی بات نہیں۔ وہ بات اچھی طرح جانتا تھا کہ ان کی شمولیت کسی طور ممکن نہیں۔

پھر وہ سونے کے لئے لیٹا تو اس کی آنکھوں میں بڑی دیر تک یادوں کی شمعیں جھلملاتی رہیں۔ وہ یادوں کی برات میں گھرا جانے کب سو گیا۔

جانے وہ رات کا کون سا پہر تھا کہ اچانک اس کی آنکھ کھل گئی۔ کمرے میں ہلکی روشنی موجود تھی۔ اس روشنی میں اس نے دیکھا کہ اسکے کمرے کا دروازہ خوف میں مبتلا کر دینے والی چرچراہٹ کے ساتھ کھل رہا ہے۔ اس کے ساتھ ہی سردی کی ایک تیز لہر اندر داخل ہو رہی ہے۔

یہ بات اسے اچھی طرح یاد تھی کہ وہ رات کو سونے سے پہلے دروازہ اچھی طرح بند کر کے سویا تھا۔ پھر یہ دروازہ کیسے کھلا یہ اتنی برفانی ہوا اندر کس طرح آ رہی ہے۔ کیا باہر کا دروازہ بھی کھلا ہوا ہے۔

وہ فوراً اٹھ کر بیٹھ گیا اور اس نے سرہانے رکھی تلوار فوراً اپنے ہاتھ میں اٹھالی۔ اسے دروازے میں کوئی دکھائی نہ دیا لیکن وہ دروازہ اب بھی آہستہ آہستہ کھل رہا تھا۔

جب وہ پورا دروازہ کھل گیا تو ساحل عمر نے اسے دہلیز پر دیکھا۔ وہ بڑے اطمینان سے اندر داخل ہو رہا تھا۔ اس کا رخ سیدھا بستر کی طرف تھا۔ جوں جوں وہ بستر کی طرف بڑھتا آ رہا تھا' رفتہ رفتہ اس کا سائز بڑا ہو رہا تھا۔ یہاں تک کہ وہ ایک بڑے کچھوے کے برابر ہو گیا...... وہ بچھو تھا' اعور تھا۔

اس سے پہلے کہ اعور بستر پر چڑھ کر اس پر حملہ آور ہو جاتا' ساحل عمر بہت تیزی سے بستر سے نکل کر ایک طرف ہوا اور اس نے تلوار کا ایک بھرپور وار کیا۔

اس وار کا اعور پر کوئی اثر نہ ہوا۔ تلوار جیسے کسی پتھر کے ٹکڑے سے ٹکرائی۔ اس وار پر بس وہ ایک لمحے کے لئے رکا اس کے بعد وہ بستر پر سے گزرتا آگے بڑھ گیا۔ اس نے ساحل عمر کی طرف کوئی توجہ نہ کی۔ ساحل عمر اسے حیرت زدہ ہو کر دیکھنے لگا۔

اعور پورے اطمینان سے چلتا ہوا ساحل عمر کی تصویر کے پاس پہنچا جو دیوار پر بنی ہوئی تھی۔

وہ بچھو تصویر پر چڑھ کر اس کی پیشانی تک پہنچا اور پھر ساحل عمر نے اعور کو صافے کے نیچے گھستے ہوئے دیکھا۔ ساحل عمر نے یہ یقین کرنے کے لئے کہ وہ جو کچھ دیکھ رہا ہے صحیح دیکھ رہا ہے اپنی پلکیں جھپکائیں۔ اتنی دیر میں وہ بچھو اس کے صافے میں داخل ہو چکا تھا۔ اب تصویر پر کوئی چیز نہ تھی۔

اس منظر نے ساحل عمر پر گھبراہٹ طاری کردی۔ اس کے ہاتھ سے تلوار چھوٹ کر فرش پر گری۔

اسی وقت اس کی آنکھ کھل گئی۔ اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ اس پر گھبراہٹ طاری تھی۔ جب اس نے سامنے دروازے پر نظر ڈالی تو اسے بند پایا۔ کمرے میں ہلکی روشنی تھی۔ اس نے پلٹ کر تصویر کی طرف دیکھا۔ تصویر اپنی جگہ جوں کی توں موجود تھی۔ اس کی تلوار بھی سرہانے رکھی تھی۔

اس نے اٹھ کر دروازہ چیک کیا۔ دروازہ اچھی طرح بند تھا۔ پھر اس نے نزدیک سے اپنی تصویر دیکھی۔ صافے پر ہاتھ پھیر کر دیکھا۔ تصویر میں کوئی فرق موجود نہ تھا۔

اب اسے یقین ہو گیا کہ اس نے جو کچھ دیکھا خواب میں دیکھا تھا...... لیکن یہ خواب تھا کتنا خطرناک...... کتنا بھیانک...... وہ خواب کو دیکھ کر فکر مند ہو گیا تھا۔ جانے کتنی دیر وہ یونہی بستر پر گم صم بیٹھا رہا تھا۔

☆......☆......☆

آج جشن کی رات تھی۔

آج کی رات تیرہ لڑکیوں کی شادی ہونا قرار پائی تھی۔ چودھویں رشا ملوک تھی۔

جشن کا میدان بقعہ نور بنا ہوا تھا۔ بستی کے تمام لوگ اکٹھا ہو چکے تھے اور اپنی اپنی نشست سنبھال چکے تھے اب سب کی نظریں انتخابی محراب پر لگی ہوئی تھیں۔ سب سے پہلے رشا ملوک نے اپنے مور کے ساتھ اس محراب سے نکل کر میدان میں آنا تھا۔

سب رشا ملوک کے لئے بے چین تھے۔ وہ رشا ملوک کے مور کو دیکھنے کے لئے بے قرار تھے۔ آخر بستی کا وہ کون سا نوجوان ہے جو رشا ملوک کا انتخاب بن گیا ہے۔

پھر انتظار کی گھڑیاں ختم ہوئیں۔ موسیقی کی آواز بلند ہوتے ہی رشا ملوک محراب میں نظر آئی۔ اس کے پیچھے اس کا مور تھا جس کا اس نے ہاتھ پکڑا ہوا تھا اور وہ اسے تیزی سے کھینچتی ہوئی محراب سے نکل کر میدان میں داخل ہوئی۔

رشا ملوک کے مور کو دیکھ کر چند لمحوں کے لئے ہجوم پر سکتہ طاری ہو گیا۔ سب خوشگوار حیرت میں ڈوب گئے۔ پھر اچانک سب کو ہوش آیا تو ایک دم شور اٹھا۔ تالیاں، سیٹیاں، ہاؤ ہو...... موسیقی کے دھماکے۔

رشا ملوک، ساحل عمر کو تیزی سے دوڑاتی ہوئی سیڑھیاں چڑھ کر اس گھومنے والے سجے ہوئے تخت پر بیٹھ گئی جو اونچائی پر میدان کے درمیان نصب تھا۔

تخت گھومتا رہا اور لوگ شور مچا مچا کر داد تحسین دیتے رہے اور رشا ملوک فخر سے گردن

اکڑائے داد تحسین وصول کرتی رہی۔ وہ بہت خوش تھی۔ آج اسے اپنے خوابوں کا شہزادہ مل گیا تھا۔
جب تخت نے تین چکر لگا لئے اور ساری بستی نے اسے اور اس کے مور کو دیکھ لیا وہ تخت سے اتر آئی۔ رشا ملوک نے پھر اس کا ہاتھ پکڑا اور دوڑتی ہوئی سمار ملوک کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔
تب سمار ملوک اور اس کی بیوی عروہ اپنی کرسیاں چھوڑ کر کھڑے ہو گئے۔ ان کے کھڑے ہوتے ہی میدان میں موجود ہر شخص کھڑا ہو گیا۔ اب یہ وقت تھا شادی کے بندھن کا۔
سمار ملوک نے باری باری دونوں کی طرف دیکھا اور با آواز بلند بولا۔ ''اے رشا ملوک کیا تو اپنے مور کے ساتھ خوش ہے۔''
''ہاں' بابا میں خوش ہوں۔'' رشا ملوک نے فوراً جواب دیا۔ پھر اس جملے کو اس نے تین بار دہرایا۔
''اور تیرا مور کیا کہتا ہے۔ کیا یہ بھی خوش ہے۔'' یہ کہہ کر سمار ملوک نے ساحل عمر کی طرف دیکھا۔
رشا ملوک نے اس کا ہاتھ دبا کر اشارہ کیا۔ ''بولو!'' تب ساحل عمر فوراً بولا۔ ''ہاں بہت خوش ہوں۔''
پھر یہ بات اس نے تین مرتبہ دہرائی۔ اس ایجاب و قبول کے بعد بستی کا ہر شخص بیٹھ گیا۔ پھر کوئی کچھ نہ بولا۔ ایک منٹ کے لئے میدان میں مکمل خاموشی چھائی رہی۔ جیسے دل میں ہر شخص اس نوبیاہتا جوڑے کے لئے دعا کر رہا ہو۔ اس لمحے سمار ملوک نے اپنے دونوں ہاتھ آسمان کی طرف اٹھائے اور با آواز بلند بولا۔
''وقت تمہاری حفاظت کرے۔ قسمت تم پر مہربان ہو۔ ستارے تمہیں اپنا بنائیں۔''
سمار ملوک خاموش ہوا تو پوری فضا بیک وقت مبارکباد سے گونج اٹھی۔ موسیقی نے انگڑائی لی۔ فضا پر ایک خوشگوار تاثر چھا گیا۔ ماحول مہک اٹھا۔ میدان جگمگا اٹھا۔
''مبارک ہو...... اے رشا تجھے تیرا مور مبارک ہو۔'' پوری بستی بیک وقت پکار اٹھی۔
جب آخری لڑکی کی بھی شادی پایہ تکمیل کو پہنچی تو پھر شربت کی دیگ کھل گئی۔ بستی کے لوگ بڑے اطمینان اور سکون سے اس دیگ کے سامنے سے گزرتے گئے اور شربت کا گلاس لے کر آگے بڑھتے گئے۔
جو شربت پی لیتا' نوبیاہتا جوڑوں کی کرسیوں کے سامنے سے گزرتا ہوا' انہیں مبارکباد دے کر محراب سے باہر چلا جاتا۔ بالآخر جشن کا میدان بستی والوں سے خالی ہو گیا۔ اب میدان میں نوبیاہتا جوڑے اپنے لواحقین کے ساتھ رہ گئے۔
پھر وہ بھی اٹھ کھڑے ہوئے۔ ساحل عمر کا ہاتھ رشا ملوک کی ماں عروہ نے تھاما اور رشا ملوک کا ہاتھ اس کے باپ سمار ملوک نے پکڑا۔ اس طرح وہ اس محراب سے نکل کر باہر آ گئے۔
باہر دو سفید گھوڑوں کی ایک چھوٹی سی کٹاری موجود تھی...... ساحل عمر اور رشا ملوک کو اس پر سوار کرا دیا گیا۔ اس کے بعد کٹاری کا پردہ گرا دیا گیا۔ بازغر نے کٹاری پر چڑھ کر آواز لگائی۔ ''رشا

ملوک چلوں۔"

"ہاں، چلو بازغر۔" رشا ملوک نے پردے کے پیچھے سے جواب دیا۔

اس جواب کے فوراً بعد کٹاری ہوا سے باتیں کرنے لگی۔

☆......☆......☆

کٹاری کے رکتے ہی ساحل عمر کے کان میں نقرئی قہقہوں کی آوازیں پڑیں۔ اس نے پردہ ہٹایا تو کٹاری کے سامنے رشا ملوک کی سہیلیوں کو پایا۔ مویا سب سے آگے تھی اس کے ہاتھ میں سونے کی چمکتی ہوئی تھالی تھی۔ اس تھالی میں سات مختلف رنگوں کی موم بتیاں روشن تھیں۔

ساحل عمر کو کٹاری سے اتار کر مویا نے اپنی سات سہیلیوں کے ساتھ ساحل عمر کے گرد سات چکر لگائے۔ پھر یہی عمل رشا ملوک کے ساتھ دہرایا گیا۔ اس کے بعد مویا نے تھالی بائیں ہاتھ پر رکھ کر دائیں ہاتھ سے ساحل عمر کا ہاتھ پکڑ لیا اور دراوازے کی طرف بڑھنے لگی۔

یہ اسی کا گنبد تھا لیکن جب وہ دروازے سے اندر داخل ہوا تو اسے محسوس ہوا جیسے وہ کسی نئے کمرے میں آ گیا ہے۔ وہ کمرہ جس میں ایک بستر کے سوا کچھ نہ تھا، اب ایک خوبصورت بیڈ روم میں تبدیل ہو چکا تھا۔ اگر اس کمرے میں دیوار پر بنی تصویر نہ ہوتی تو وہ یہی سمجھتا کہ کسی اور کمرے میں آ گیا ہے۔

مویا نے اس کمرے میں دو اونچی مرصع کرسیوں میں سے ایک پر ساحل عمر کو بٹھایا اور خاموشی سے واپس چلی گئی۔ چند لمحوں بعد وہ پھر کمرے میں داخل ہوئی۔ اس مرتبہ اس کے ساتھ رشا ملوک تھی۔ اس نے رشا ملوک کو اس کے برابر بٹھایا۔

پھر اس نے اس روشن تھالی کو ساحل عمر کے قدموں میں رکھا۔ پھر خود بھی بیٹھ گئی۔ اس نے سات موم بتیوں کو ایک ایک کر کے اٹھایا۔ اس کے چہرے کے نزدیک کیا اور پھر تھالی میں جما دیا۔ ساتوں موم بتیوں کی روشنی دکھا کر اس نے تھالی اٹھائی اور خود بھی کھڑی ہو گئی۔

اس کے بعد وہ سات قدم پیچھے ہٹی۔ مسکرا کر باری باری دونوں کی طرف دیکھا اور پھر میٹھے لہجے میں بولی۔ "رشا ملوک تجھے یہ شادی مبارک ہو۔ اب میں چلتی ہوں۔ وقت تجھ پر مہربان ہو۔"

"شکریہ مویا۔" رشا ملوک نے مسکرا کر کہا۔

مویا نے دروازہ کھولا اور بغیر پیچھے دیکھے دروازہ آہستہ سے بند کیا اور باہر چلی گئی۔

اب وہ کمرے میں اکیلے رہ گئے تو ساحل عمر نے برابر بیٹھی رشا ملوک کی طرف ذرا سا جھک کر دیکھا۔ اسے اپنی طرف دیکھتے پا کر رشا ملوک نے اپنا چہرہ جلدی سے دوسری طرف گھما لیا۔

"اے رشا کیا اب بھی کوئی رسم باقی ہے۔ آج تو مجھے رسموں نے مار ڈالا۔"

"ہاں، ایک رسم اور باقی ہے۔" رشا ملوک نے منہ پھیرے پھیرے کہا۔

ساحل عمر نے اس کی تھوڑی پکڑ کر چہرہ اپنی طرف گھمایا اور گہری نظروں سے دیکھتا ہوا بولا۔ "کون سی رسم؟"

"آخری رسم!" رشا ملوک نے دھیرے سے اپنی جھکی پلکیں اٹھائیں۔ اپنی نیم باز آنکھوں

سے اسے دیکھا اور پھر فوراً ہی اپنی آنکھوں پر پلکوں کا شامیانہ ڈال لیا۔ اس کا چہرہ شرم سے گلنار ہونے لگا۔

"وہ کیا؟" ساحل عمر نے شرارت سے پوچھا۔

"میں کیا جانوں۔" یہ کہہ کر اس نے اپنا سر اس کے بازو پر رکھ دیا۔

ساحل عمر نے اس کا چہرہ اس کی تھوڑی پر اپنی انگلی رکھ کر اٹھایا اور پھر اپنے دونوں ہاتھوں میں لے کر اسے غور سے دیکھنے لگا۔ رشا ملوک ایک بے حد حسین لڑکی تھی۔ ایک ایسی لڑکی جسے دیکھ کر فوراً اس کے خالق کی یاد آتی تھی۔ اس کا حسن بے مثال تھا۔ بے نظیر تھا...... ایسا حسن کہ آدمی دیکھے تو پلکیں جھپکانا بھول جائے۔ اسے کچھ یاد نہ رہ، بس وہ یاد رہ جائے۔

اس کا چہرہ دیکھتے دیکھتے ساحل کی کمر کو اچانک ایک جھٹکا لگا۔ اس نے دیکھا کہ وہ اس کے چہرے پر موجود ہے اور اسی جگہ موجود ہے جہاں اس نے اسے کبھی بنایا تھا۔

اس نے فوراً اپنی پلکیں جھپکائیں۔ سوچا یہ اس کا وہم ہے۔ جو کچھ دیکھ رہا ہے فریب نظر ہے۔

رشا ملوک کو فوراً ہی خطرے کا احساس ہو گیا۔ اس نے آنکھیں کھول کر ساحل عمر کی طرف دیکھا۔

"اتنے غور سے کیا دیکھ رہے ہیں۔" اس کے لہجے میں پریشانی تھی۔

دیکھ تو خیر میں تمہیں رہا تھا لیکن اس وقت تمہاری پیشانی پر مجھے وہ منحوس نظر آ رہا ہے۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے؟" یہ کہہ کر رشا ملوک نے فوراً اپنی پیشانی پر ہاتھ رکھا۔

اس کے ہاتھ رکھتے ہی وہ غائب ہو گیا۔

"یہاں تو کچھ نہیں۔" رشا ملوک نے اپنی پیشانی پر اچھی طرح ہاتھ پھیر کر دکھایا۔

جب اس نے اپنا ہاتھ نیچے کیا تو وہ ساحل عمر کو وہیں بیٹھا نظر آیا۔ وہ اس کی پیشانی کا جھومر بنا ہوا تھا۔

رشا ملوک نے ساحل عمر کی آنکھوں میں دیکھا تو اسے وہاں پریشانی نظر آئی۔ رشا ملوک نے اپنی آنکھوں سے سوال کیا۔ ساحل عمر نے اپنی آنکھیں بند کر کے دھیرے سے گردن ہلائی۔ جس کا مطلب تھا کہ وہ اب بھی اسے دیکھ رہا ہے۔

رشا ملوک نے پھر اپنی پیشانی پر ہاتھ لے جانا چاہا تو ساحل عمر نے اس کا ہاتھ روک دیا۔ تعویذ چھونے کا خیال اس کے دل میں پیدا ہو چکا تھا۔ اس نے کوٹ کے بٹن کھول کر تعویذ کو اندر ہی اپنے ہاتھ میں تھاما تو فوراً ہی آواز سنائی دی۔ "لاحول پڑھو۔"

یہ سنتے ہی ساحل عمر نے فوراً لاحول پڑھی تو وہ بچھو رشا ملوک کی پیشانی سے اس طرح غائب ہوا جیسے گدھے کے سر سے سینگ...... ساحل عمر یہ اندازہ نہ کر پایا کہ بچھو کی موجودگی اس کا وہم تھا یا حقیقت...... جو بھی تھا...... تھا ضرور کچھ نہ کچھ...... اگر کچھ نہ ہوتا تو اسے لاحول پڑھنے کو نہ کہا جاتا۔ اب اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ یہ شیطانی قوتیں مسلسل اس کے پیچھے لگی ہوئی تھیں۔ ان طاغوتی قوتوں نے

اسے فریب کے جال میں پھنسایا ہوا تھا۔ وہ چاہتی تھیں ساحل عمر کسی طرح چین نہ پائے۔
اور دوسری طرف اس بستی کے رمز شناس اس بستی کے مالک سمار ملوک کی کوشش تھی کہ وہ قرار پائے۔ اسے یہاں ہر طرح کا آرام اور سکون میسر آئے۔ ایک چین رشا ملوک کی صورت میں اس کے سامنے بیٹھا تھا۔ اس نے سوچا کہ اب کچھ وقت کے لئے سب کچھ بھول جائے' سب کو بھول جائے بس رشا ملوک کو یاد رکھے۔ رشا ملوک کا ہو جائے۔ اسے قرار دے کر خود بھی قرار پائے۔
تب وہ کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا' اس نے بڑی نرمی سے رشا ملوک کا ہاتھ تھاما اور مخمور نگاہوں سے بچی ہوئی سیج کو دیکھنے لگا۔

☆......☆......☆

پھر وہ وقت آیا جو ہر بیٹی کے باپ پر آتا ہے۔ اس کی ماں پر آتا ہے۔ رشا ملوک کی ماں عروہ صبح سے روئے جاتی تھی۔ اس کی آنکھ کے آنسو تھمتے ہی نہ تھے۔ اس بستی کا رمز شناس' رشا ملوک کا باپ اپنی بیوی کو روتے ہوئے دیکھ رہا تھا اور خاموش تھا۔ وہ کیا کہتا' وہ کیا کرتا...... وہ خود رو رہا تھا۔ یہ اور بات تھی کہ اس کے آنسو کسی کو دکھائی نہ دے رہے تھے۔ وہ آنسو اندر ہی اندر کہیں دل پر گر رہے تھے۔

رشا ملوک کی رخصتی مکمل ہو چکی تھی۔ اب وہ چند الفاظ باقی تھے جو رخصتی سے پہلے سمار ملوک نے رشا ملوک سے کہنے تھے۔ اس کے بعد چاند کے پیالے میں بھرا وہ مشروب رشا ملوک کو پلا دیا جانا تھا۔

تب سمار ملوک نے عروہ کو اشارہ کیا۔ اشارہ پا کر عروہ نے میز پر رکھا چاندی کا پیالہ اٹھایا اور اپنے شوہر کے برابر آ کر کھڑی ہو گئی۔ رشا ملوک سامنے کرسی پر بیٹھی تھی۔ اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھری تھیں اور سر جھکا ہوا تھا۔
تب رشا ملوک کا باپ سمار ملوک گویا ہوا۔
"اے رشا ملوک...... اب وقت رخصت ہے تو اچھی طرح جانتی ہے کہ ہماری حالت کیا ہوگی۔ ہمارے دل پر کیا گزرتی ہو گی۔ تیری ماں اور میں نے یہ سب اس لئے قبول کرلیا کہ تیری خوشی اسی میں تھی۔ ہم تیری خوشی پر قربان ہو گئے ہم نے تیری خوشی کو احترام بخشا۔ ساحل عمر تیرا خواب تھا۔ اس خواب کو تو نے حقیقت کرلیا۔ وہ حقیقت کا روپ دھار کر تیرے سامنے آ گیا۔ تو نے اسے اپنے لئے منتخب کرلیا۔ تیرا انتخاب لاجواب ہے لیکن تو جانتی ہے کہ وہ کون ہے......؟ کہاں سے آیا ہے۔ خیر جب تو نے اسے اہم جانا تو وہ ہمارے لئے بھی قابل احترام ہوا' ویسے بھی وہ اس بستی کا نجات دہندہ ہے۔ اس بستی کا محسن ہے۔ اے رشا ملوک' اب تو جان لے کہ تجھے ساحل عمر کی دنیا میں جانا ہے۔ تیرے پاس کتنا وقت ہے تو جانتی ہے یہ بات بھی تو اچھی طرح جانتی ہے کہ تیرے لئے یہ وقت' وقت کے خالق سے لیا گیا ہے اور یہ کام بابا صاعق نے کیا ہے۔ جب وقت پورا ہونے لگے تو سمجھ لینا کہ اب تیرا وقت پورا ہوا' پھر تو جانتی ہے کہ تجھے کیا کرنا ہوگا۔ تو جانتی ہے ناں۔"
"ہاں بابا...... جانتی ہوں' اچھی طرح جانتی ہوں۔" اس کی آواز میں لرزش تھی۔

''بس پھر رشا ملوک ...... تو ہم سے رخصت ہو۔ وقت تیرا حامی و ناصر ہو۔'' سار ملوک نے چاندی کا پیالہ اپنی بیوی عروہ سے لے لیا اور اسے رشا ملوک کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔ ''لے یہ پی لے...... الوداع اے رشا ملوک۔''

''الوداع...... میرے باپ۔'' رشا ملوک نے ڈبڈبائی آنکھوں سے سار ملوک کو دیکھا۔

''الوداع...... میری ماں۔'' اس کے آنسو اب آنکھوں میں ٹھہر نہ سکے۔ روتے روتے اس نے وہ مشروب پیا اور پھر اٹھ کر اپنے بستر پر لیٹ گئی۔

☆......☆......☆

باز غر نے رات ہی کو آگاہ کر دیا تھا کہ کل صبح ہی صبح آپ کا سفر شروع ہو جائے گا۔ ساحل عمر تیار ہو کر بیٹھا تھا اور باز غر کا انتظار کر رہا تھا۔

کچھ دیر بعد دروازے پر دستک ہوئی۔ دروازہ اندر سے بند نہ تھا۔ اس نے بلند آواز میں کہا۔ ''کون ہے آ جاؤ۔''

جب دروازہ کھلا تو اسے دروازے پر عروہ نظر آئی۔ اس کے ہاتھ میں ایک چاندی کا ایک پیالہ تھا۔ عروہ کے پیچھے سار ملوک تھا۔ اور سار ملوک کے بعد باز غر نظر آیا۔

ساحل عمر عروہ کو دیکھ کر فوراً احتراماً کھڑا ہو گیا۔ سار ملوک نے نزدیک آ کر اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ ساحل عمر کرسی پر دوبارہ بیٹھ گیا۔ سار ملوک اور عروہ برابر برابر اس کے سامنے کھڑے ہو گئے جبکہ باز غر ان دونوں کے پیچھے کھڑا ہو گیا۔

''اے ساحل عمر...... تمہارے جانے کی تیاریاں مکمل ہیں۔ رشا ملوک تمہاری منتظر ہے۔ مجھے تم سے زیادہ کچھ نہیں کہنا بس اتنا کہوں گا کہ رشا ملوک کا خیال رکھنا...... وہ دور دیس جا رہی ہے اور وہاں تمہارے سوا اس کا کوئی اور نہیں۔ اس بستی کا بچہ بچہ تمہارا احسان مند ہے۔ یہاں کے لوگ تمہیں کبھی نہ بھول پائیں گے۔ ہمارا تو ذکر ہی کیا' تم تو ہمارے دل میں بس گئے ہو اور ہمیشہ بسے رہو گے۔'' پھر سار ملوک عروہ سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''لاؤ' یہ پیالہ مجھے دو۔''

عروہ نے مشروب سے بھرا پیالہ سار ملوک کے ہاتھ میں دے دیا اور رخصتی نگاہوں سے ساحل عمر کو دیکھنے لگی۔

''لو ساحل عمر' یہ مشروب پی لو اور ہم سے رخصت ہو جاؤ۔ وقت تمہاری نگہبانی کرے۔''

ساحل عمر نے ہاتھ بڑھا کر وہ پیالہ سار ملوک سے لے لیا اور پیالے میں بھرے مشروب کو غور سے دیکھنے لگا۔ وہ سرخ رنگ کا نہایت خوشبودار مشروب تھا۔ اس نے خاموشی سے اس پیالے کو ہونٹوں سے لگا لیا اور پھر تیزی سے مشروب اپنے حلق سے اتارنے لگا۔

''الوداع اے ساحل عمر...... الوداع!'' سار ملوک نے بڑے رقت آمیز لہجے میں کہا۔

ساحل عمر نے اس الوداع کا جواب دینا چاہا لیکن وہ باوجود کوشش کے کچھ بول نہ سکا۔ اس کی آنکھیں بند ہونے لگیں۔ چند لمحوں بعد وہ اپنے ہوش سے بیگانہ ہو گیا اور اس سے پہلے کہ وہ کرسی سے لڑھک کر فرش پر گرتا باز غر نے بہت تیزی سے آگے بڑھ کر اسے سنبھال لیا۔

پھر بازغر نے اسکے بازو میں اپنی گردن ڈال کر اسے کرسی سے اٹھالیا۔ سار ملوک آگے بڑھا۔ دونوں نے مل کر اسے بآسانی بستر پر لٹا دیا۔ ساحل عراب مکمل بے ہوش ہو چکا تھا۔

☆......☆......☆

پھر جب ساحل عمر کو ہوش آیا تو اس نے خود کو ایک خیمے میں پایا۔ اس نے اچھی طرح آنکھیں کھول کر خیمے کا جائزہ لیا۔ یہ وہی خیمہ تھا جس میں جھیل سیف الملوک کے کنارے اس نے رات گزاری تھی۔ خوبصورت چاندنی رات، جھیل پر رشاملوک کی آمد...... اسے سب کچھ یاد آ گیا۔

اس رات جب وہ چاندنی رات میں ٹہل ٹہل کر تھک گیا اور چاندنی بے نور ہونے لگی تو وہ خیمے میں آ کر لیٹ گیا تھا۔ دو کمبل اوڑھ کر جب اس نے آسودگی سے پاؤں پھیلائے تو پھر نیند نے اسے آغوش میں لیتے دیر نہ کی۔

اس وقت وہ اسی خیمے مین تھا۔ اس نے دو کمبل اوڑھے ہوئے تھے اور اسی طرح لیٹا تھا جس طرح وہ سونے سے پہلے لیٹا تھا۔

یہ کیا ہوا؟

اس کے دل میں سناٹا اترنے لگا۔

کیا اس نے یہ سب خواب میں دیکھا ہے۔ اتنا حسین اور طویل خواب۔ اس کی تو رشاملوک سے شادی ہو گئی تھی۔ پھر وہ کہاں گئی۔ کیا ان لوگوں نے اس کے ساتھ دھوکا کیا ہے۔ یہ شادی فراڈ تھی۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔

پھر اس نے اپنے اوپر سے کمبل اتار پھینکا۔ اپنے لباس پر نظر ڈالی یہ تو وہی لباس تھا جو اس نے شادی کی رات پہنا تھا۔ اگر یہ سب خواب تھا تو پھر لیٹے لیٹے لباس کس رح تبدیل ہو گیا۔ تب اس کی نظر گلے میں پڑی اس انگوٹھی پر پڑی جو سار ملوک نے شادی کی رات اسے بخشی تھی۔ اس نے تو اسے اپنی خاندانی تلوار بھی دی جسے وہ مقدس تلوار کہتا تھا اور اس تلوار سے اس نے راعین کا خاتمہ کیا تھا۔

تب اسے فوڑا ہی تلوار کا دستہ نظر آیا۔ اس نے کمبل ہٹایا۔ تلوار بستر پر اس کے پہلو میں موجود تھی۔ اب اس نے سوچا کہ تلوار موجود ہے۔ گلے میں انگوٹھی پڑی ہے، جسم پر شادی والا لباس موجود ہے۔ تو پھر یہ خواب نہیں ہو سکتا۔ اگر یہ خواب نہیں ہے تو پھر رشاملوک کہاں ہے۔

کیا سار ملوک نے رشا کو روک کر اسے دھکا دلوا دیا۔ اسے خیمے میں لا ڈالا گیا لیکن یہ تو بدعہدی ہے۔ وہ لوگ ایسے نہ تھے۔ اسے خیمے سے باہر نکل کر دیکھنا چاہئے کہ باہر کیا جگہ ہے۔ اس کا خیمہ کہاں نصب ہے۔

اس خیال کے آتے ہی وہ گھٹنوں کے بل چلتا خیمے کے پردے کے نزدیک آ گیا۔ اس نے جوتے پہن کر خیمے کی ڈوریاں کھولیں اور پھر تیزی سے باہر آ گیا۔

یہ وہی مقام تھا جہاں اس نے رات گزاری تھی۔ اب صبح ہو رہی تھی۔ جھیل پر اب بھی سناٹا تھا۔

پھر جب اس نے چاروں طرف نظریں گھما کر دیکھا تو اپنے خیمے کے پیچھے ایک اور خیمے کو

پایا۔ اس کا اپنا خیمہ سرخ رنگ کا تھا جبکہ اس کے پیچھے والا خیمہ سبز رنگ کا تھا۔
اس خیمے میں کون ہے؟ اس کے دل میں خوشی سی جاگی۔ وہ دوڑ کر اپنے خیمے کے پیچھے گیا۔
اس نے جلدی جلدی خیمے کی ڈوریاں کھولیں اور پھر فوراً ہی پردے کے دونوں پٹ الٹ دیئے۔
سامنے جو کچھ تھا اسے دیکھ کر ساحل عمر حیران رہ گیا۔

☆......☆......☆

حیرت سے زیادہ اسے خوشی ہوئی۔ خوشی کیوں نہ ہوتی سامنے رشاملوک جو بیٹھی تھی۔ وہ اسے دیکھ کر بے اختیار مسکرائی اور گہری نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بولی۔ ''کیا ہوا؟''

''کچھ نہیں ہوا...... اگر تم نہ ملتیں تو پھر ضرور کچھ ہو جاتا۔'' وہ گردن ہلا کر بولا۔

''کیا ہو جاتا؟'' وہ خیمے سے باہر نکلتے ہوئے بولی

''میں پاگل ہو جاتا۔'' ساحل عمر اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے بولا۔

''واقعی...... آپ میرے لئے پاگل ہو جاتے۔'' رشاملوک خوشگوار حیرت سے بولی۔ جیسے اسے یقین نہ آیا ہو۔

''ہاں واقعی...... اس میں اتنی حیرت کی کیا بات ہے۔''

''اتنی محبت کرتے ہیں مجھ سے۔'' اس نے جیسے تصدیق چاہی۔

''یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔'' اس نے کہا۔

''ہاں، کیوں نہیں...... یہ پوچھنے کی بات بھی ہے اور کہنے کی بات بھی ہے۔''

''گویا میں یہ کہوں کہ مجھے تم سے پیار ہے۔''

''ہاں کہیں...... ایسا سننا اچھا لگتا ہے۔''

''اور کہنا؟'' اس نے پوچھا۔

''کہنے سے زیادہ سننا اچھا لگتا ہے۔'' اسکی آنکھوں میں شرم اترنے لگی۔ اس کی آنکھیں جھکنے لگیں۔

''اور اگر سامنے والا بھی یہی چاہے۔''

''تو میں اسے ایسا سناؤں گی کہ زندگی بھر یاد رکھے گا۔''

اس کے لہجے میں شرارت تھی۔

''اچھا۔'' ساحل عمر اس کی ذومعنی بات سن کر مسکرائے بنا نہ رہ سکا۔

وہ باتیں کرتے جھیل کے کنارے آ گئے۔

صبح ہو رہی تھی۔ سردی اپنے عروج پر تھی۔ پہاڑوں پر بادل دھویں کی صورت نظر آ رہے تھے۔ چاند ماند پڑ چکا تھا۔ مشرق سے اجالا پھوٹتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ ٹھنڈی اور تازہ ہوا۔ ہوا کے زور پر لہریں لیتا جھیل کا پانی۔ اس وقت ایسا حسین منظر تھا۔ ایسا دلکش سماں تھا کہ ساحل عمر کے دل پر سکون کی شبنم سی گرنے لگی تھی۔

''اے رشاملوک ذرا یہ بتاؤ کہ یہ جھیل کتنی گہری ہے؟'' ساحل عمر نے سوال کیا۔

"مجھے کیا معلوم۔"
"تمہاری آنکھوں جتنی گہری تو ہوگی۔" وہ یہ کہہ کر مسکرایا۔
"مجھے کیا پتہ؟"
"تمہیں نہیں معلوم...... حیرت ہے۔ کیا تم اس رات جھیل میں نہائی نہیں تھیں۔"
"کیا آپ نے دیکھا تھا۔" وہ چونک کر بولی۔
"ضرور دیکھتا' لیکن تمہاری سہیلیوں نے اتنا ڈرایا تھا کہ اندھا ہونے کی ہمت نہ کر پایا۔"
"بہت اچھا کیا ورنہ تمہاری آنکھوں کو نقصان پہنچ جاتا۔"
"رشا ملوک...... ایک بات بتاؤ...... تمہاری بستی کہاں ہے؟" ساحل عمر نے پہاڑوں کی طرف اشارہ کیا۔ "کیا ان پہاڑوں کے پیچھے؟"
"میں نہیں جانتی کہ میری بستی کہاں ہے؟" وہ کھوئے ہوئے انداز میں بولی۔
"اب اگر ہم وہاں جانا چاہیں تو کیا نہیں جاسکتے؟" ساحل عمر نے سوال کیا۔
"نہیں...... ہرگز نہیں۔" وہ دوٹوک لہجے میں بولی۔
"کیوں آخر؟" سوال ہوا۔
"میری بستی گم ہوگئی۔ میرا اس سے رابطہ منقطع ہوگیا...... وہ ماضی کا حصہ بن گئی۔"
"میں تمہاری بستی میں زیادہ دن نہیں رہا...... لیکن جتنے دن بھی رہا' وہاں کی یادیں میرے دل پر نقش ہیں۔ میں تمہارے والدین کو' تمہاری سہیلی مویا کو' بابا صاعق اور بازغر کو...... کسی کو نہیں بھول سکوں گا۔ بہت اچھے لوگ تھے۔ بہت پیارے لوگ تھے۔"
"وہ بستی بادل تھی اور وہ لوگ پانی تھے۔ بارش برس چکی۔ بادل چھٹ چکے۔ اب آسمان پر کچھ نہیں۔ سب وقت کی دھند میں گم ہو گئے۔" وہ بہت سنجیدگی سے بول رہی تھی۔ اس کی آواز کانپ رہی تھی۔ پھر اس نے ساحل عمر کی طرف دیکھا اور اس کے کندھے پر سر رکھ دیا۔ "اب میں آپ کی دنیا میں ہوں اور آپ جیسی ہوں۔"
"آؤ' پھر سامان سمیٹو...... چلو یہاں سے...... تمہاری دنیا' تمہارا گھر تمہیں آواز دے رہا ہے۔"
"ہاں چلیں۔" رشا ملوک نے خوشی بھرے لہجے میں کہا۔

☆......☆......☆

جھیل سیف الملوک سے انہوں نے ناران تک سفر کیا۔ ایک رات ناران میں رہے۔ دوسرے دن کاغان پہنچے۔ ایک رات وہاں قیام کیا۔ پھر راستے میں جو قابل دید مقامات آتے گئے' ان کی سیر کرتے ہوئے مری کا رخ کیا۔ ناران اور جھیل سیف الملوک دیکھنے کے بعد مری آنکھوں میں بالکل نہ جچی۔ یوں لگا جیسے کسی سرسبز وادی سے نکل کر اجاڑ جگہ پر آگئے ہوں۔ وہاں ایک رات سے زیادہ قیام نہ کیا اور دوسرے دن مری سے اسلام آباد پہنچے پورا دن گھوم پھر کر رات پنڈی کے ایک ہوٹل میں قیام کیا اور دوسرے دن ٹرین میں سوار ہو کر کراچی کی طرف روانہ ہو گئے۔

جوں جوں کراچی نزدیک آتا جا رہا تھا ساحل عمر کا دل جوش اور ولولے سے بھرتا جا رہا تھا۔ اپنے شہر سے نکلے ہوئے اسے کافی عرصہ ہو چکا تھا۔

جانے اماں کا کیا حال ہو گا۔ وہ اس کی شدت سے منتظر ہوں گی۔ واپسی کے سفر میں اس نے کئی بار سوچا بھی کہ گھر فون کر کے اماں کو مطلع کر دے کہ وہ کراچی پہنچ رہا ہے لیکن پھر کچھ سوچ کر رہ جاتا۔ اچانک پہنچنے میں جو بات ہے' وہ مطلع کر کے پہنچنے میں کہاں؟

اماں کے لیے تو وہ دہری خوشی لے کر جا رہا تھا۔ ایک تو وہ خود جا رہا تھا۔ دوسرے اپنے ساتھ ایک ایسی ہستی کو لے جا رہا تھا جس کی آس میں وہ زندگی کی سانسیں گن رہی تھیں۔ وہ رشا ملوک کو دلہن کے روپ میں دیکھیں گی تو کس قدر خوش ہوں گی۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ خوشی سے مر ہی جائیں۔

ساحل عمر انہیں خوش تو دیکھنا چاہتا تھا لیکن مارنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ اماں رشا ملوک کے ساتھ ایک طویل عرصے تک رہیں۔

بالآخر ٹرین دھیمی ہونے لگی۔ کراچی آ گیا تھا۔ ساحل عمر جلدی سے برتھ سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ تیزی سے سامان سمیٹنے لگا۔ رشا ملوک اسے حیرت سے دیکھنے لگی تو وہ بولا۔ ''رشا ملوک شہر آ گیا۔'' اس کے لہجے میں بے پناہ خوشی تھی۔

''اچھا۔'' یہ سن کر وہ بھی خوش ہو گئی۔

گاڑی کے پلیٹ فارم پر رکتے ہی دھڑا دھڑ قلی اندر آنے لگے۔ ساحل عمر کے پاس زیادہ سامان نہ تھا لیکن اتنا کم بھی نہ تھا کہ وہ خود اٹھا کر اسٹیشن سے باہر نکل آتا۔ راستے میں اس نے خاصی شاپنگ کی تھی۔ اسکے پاس دو بڑے سوٹ کیس تھے اور ایک بڑا بیگ تھا۔

اس نے ایک قلی کر لیا۔ قلی سامان اٹھا کر چلنے لگا تو ساحل عمر رشا ملوک کا ہاتھ پکڑ کر ڈبے سے نکل آیا۔ پہلے وہ خود پلیٹ فارم پر اترا' پھر اس نے سہارا دے کر رشا ملوک کو نیچے اتار لیا۔ پھر وہ ساتھ ساتھ چلنے لگے۔

جب وہ کراچی کینٹ کے گیٹ کی سیڑھیاں اتر رہے تھے تو سامنے ذرا فاصلے پر واسم ایک ٹیکسی میں ابھی ابھی سوار ہوا تھا۔ ٹیکسی چلنے ہی والی تھی کہ اچانک اس کی نظر ساحل عمر پر پڑی۔ وہ بری طرح چونک گیا۔ اس کے جسم میں زبردست بجلی کا سا جھٹکا لگا۔ اس نے ٹیکسی والے کا ہاتھ پکڑ کر اسے رکنے کا اشارہ کیا۔

اس کی نظریں سامنے جمی ہوئی تھیں۔ وہ بہت غور سے ساحل عمر کو دیکھ رہا تھا۔ ساحل عمر اکیلا نہ تھا اس کے ساتھ ایک بے حد حسین لڑکی بھی تھی۔ صاف پتہ لگ رہا تھا کہ وہ ساحل عمر کی بیوی ہے۔ اس نے شادی کر لی تھی اور اس وقت شاید وہ ہنی مون منا کر واپس آ رہے تھے۔ ساحل عمر کو دیکھ کر واسم جیسے جی اٹھا تھا۔ اس کا رواں رواں خوشی سے سرشار تھا۔ آج صبح ہی صبح اس کے ہاتھ زبردست خبر لگ گئی تھی۔ وہ برکھا کو یہ خبر سنا کر اسے خوش کر دے گا۔

وہ ٹیکسی میں بیٹھا' اس وقت تک ساحل عمر اور رشا ملوک کو دیکھتا رہا جب تک وہ ٹیکسی میں

پلٹ کر اس کے سامنے سے گزر نہیں گئے۔
ان کے جانے کے بعد واسم اپنے ٹیکسی والے سے بولا۔ "چلو استاد۔"
"صاحب جی...... کیا اس ٹیکسی کے پیچھے جانا ہے۔" ٹیکسی والے نے واسم کو مسکرا کر دیکھا۔
"اوہ...... بڑے استاد ہو...... تم نے اندازہ لگا لیا کہ میں نے تمہیں کیوں روکا۔" واسم نے کہا۔
"سر جی، ہم بھی اسی شہر میں رہتے ہیں۔ دن رات ہر طرح کے بندوں سے واسطہ پڑتا ہے۔" وہ بڑے فخریہ انداز میں بولا۔
"اچھا اب جلدی نکلو تم یہاں سے...... گارڈن ایسٹ چلو۔"
"سر جی، ابھی تو آپ رام سوامی جا رہے تھے۔"
"اب نہیں جا رہا۔" واسم نے بات ختم کرنے کے انداز میں اس کی طرف فیصلہ کن نگاہوں سے دیکھا۔
"ٹھیک ہے...... جیسی آپ کی مرضی...... ہمارے لئے دونوں جگہ ایک سی ہیں۔" یہ کہہ کر اس نے ٹیکسی اسٹارٹ کر دی اور پھر انگلش گانوں کا کیسٹ لگا کر مزے سے ڈرائیونگ کرنے لگا۔
وہ ٹیکسی والا اپنے حلیے، اپنے چہرے مہرے سے قطعاً پڑھا لکھا نہ لگتا تھا لیکن گانے وہ انگلش سن رہا تھا۔ واسم کی سمجھ میں یہ راز نہ آیا۔ اس نے سوچا۔ اس سے پوچھے کہ کیا وہ اس گانے کے بول سمجھ رہا ہے۔ پھر وہ یہ سوچ کر سوال کرنے سے باز رہا کہ یہ اس کا ذاتی معاملہ ہے۔ وہ جو مرضی آئے سنے وہ اس پر اعتراض کرنے والا کون؟
برکھا کے بنگلے پر گاڑی رکوا کر اس نے کرایہ کی ادائیگی کی تو ٹیکسی والے نے پیسے لے کر کھڑکی سے باہر منہ نکالا اور بڑی سنجیدگی سے بولا۔ "سر جی، آپ کو یہ کیسٹ کیسا لگا۔"
"یار، میں انگلش تھوڑی بہت جانتا ہوں...... یہ انگلش گانے تو میری بالکل سمجھ میں نہیں آتے۔"
"تو سر جی مجھے کون سی انگریزی آتی ہے۔ مجھے ان گانوں کا میوزک پسند ہے...... بس اس لئے سنتا ہوں۔" وہ ہنس کر بولا۔ پھر اس نے اپنی گردن اندر کی۔ گاڑی اسٹارٹ کی اور یہ جا وہ جا۔
واسم اس کی گاڑی کو حیرت سے دیکھتا رہ گیا۔ عجیب شخص تھا۔
پھر وہ برکھا کے بنگلے کی طرف متوجہ ہوا۔ گیٹ حسب معمول بند تھا۔ اس وقت دن کے گیارہ بج رہے تھے۔ ہوا ٹھنڈی تھی اور دھوپ میں زیادہ تیزی نہ تھی۔ موسم تبدیل ہو رہا تھا۔ واسم نے گیٹ کے نزدیک پہنچ کر اس کے درمیانی خلا سے اندر دیکھا، جہاں تک وہ دیکھ سکتا تھا، وہاں تک اسے کوئی نظر نہ آیا۔

تب اس نے کال بیل کے بٹن پر ہاتھ رکھا۔ اسے تین مرتبہ وقفے وقفے سے بجایا۔
برکھا اپنے بیڈ پر براجمان تھی اور کسی سے ٹیلی فون پر محو گفتگو تھی۔ گھنٹی کی آواز سن کر اس نے ٹیلی فون ہولڈ کرایا اور پھر گیٹ کی طرف جانے کی بجائے ورشا کے کمرے کی طرف گئی۔ ورشا کے

کمرے کا دروازہ کھلا تھا۔ وہ آرام سے لیٹی رسالہ پڑھ رہی تھی۔

''ورشا...... ذرا دیکھو گیٹ پر کون ہے؟'' وہ دروازے پر کھڑے ہو کر بولی۔ ''میں ٹیلی فون پر بات کر رہی ہوں۔''

''ٹھیک ہے ممی...... آپ بات کیجئے۔ میں دیکھتی ہوں۔'' یہ کہہ کر ورشا فوراً کھڑی ہو گئی۔

ابھی ورشا گیٹ کے نزدیک نہ پہنچی تھی کہ ایک مرتبہ پھر بیل بجی۔ اس نے جلدی جلدی قدم بڑھائے اور پھر گیٹ کے نزدیک پہنچ کر گیٹ کے درمیانی خلاء سے باہر جھانکا۔ سامنے ہی واسم کھڑا تھا۔

ورشا نے واسم کو دیکھ کر فوراً ہی گیٹ کھول دیا۔ گیٹ پر ورشا کو دیکھ کر اس نے ادب سے سلام کیا اور پھر پوچھا۔ ''برکھا جی ہیں؟''

''ہاں ہیں...... اپنے کمرے میں ہیں۔'' ورشا نے گیٹ بند کرتے ہوئے کہا۔

''کیا میں وہاں چلا جاؤں۔''

''ہاں چلے جاؤ...... وہ فون پر کسی سے بات کر رہی تھیں...... اب کر چکی ہوں گی۔''

''ٹھیک ہے۔'' یہ کہہ کر واسم برکھا کے کمرے کی طرف بڑھ گیا اور ورشا اپنے کمرے کی طرف چلی گئی۔

واسم نے برکھا کے کمرے میں قدم رکھا تو وہ اس وقت ریسیور رکھ چکی تھی۔ واسم کو دیکھ کر چونکی۔ اس کے چہرے کو بغور دیکھا۔ واسم کا چہرہ غیر معمولی طور پر تمتمایا ہوا تھا۔ اس کے چہرے سے خوشی پھوٹی پڑتی تھی۔

''واسم تو بہت خوش نظر آ رہا ہے...... خیر تو ہے۔'' برکھا نے اسے گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''برکھا جی بالکل خیر ہے...... میں آپ کے لئے ایک زبردست خبر لے کر آیا ہوں۔''

''خبر سنا...... خبر سنائے گا تو پتہ چلے گا کہ کیسی خبر ہے۔''

''برکھا جی...... ایسی خبر ہے کہ آپ سن کر مجھے انعام دیئے بنا نہ رہیں گی۔''

''اچھا خبر سنا...... کہیں ایسا نہ ہو کہ الٹا تجھ کو جرمانہ پڑ جائے۔'' برکھا نے ہنس کر کہا۔

''سوال ہی نہیں پیدا ہوتا' برکھا جی۔'' وہ بڑے یقین سے بولا۔ ''میں اس وقت کینٹ اسٹیشن سے آ رہا ہوں۔

ایک دوست کے لئے سیٹ ریزرو کروانے گیا تھا۔ جب میں واپسی کے لئے ٹیکسی میں بیٹھ چکا اور ٹیکسی چلنے ہی والی تھی کہ میری ان پر نظر پڑ گئی۔ برکھا جی بس چند لمحوں کا فرق تھا۔ اگر میری ٹیکسی آگے بڑھ گئی ہوتی تو میں کتنی بڑی خبر سے محروم ہو جاتا...... جانتی ہیں برکھا جی' میں نے اسٹیشن پر کس کو دیکھا؟''

''واسم بس اب بہت ہو گئی...... اب تو راہ راست پر آ جا...... سیدھی طرح خبر سنا...... کون تھا وہ؟''

"ساحل عمر۔" واسم نے بڑی آہستگی سے اس کا نام لیا۔

"کون......؟ کیا کہا۔" برکھا کے جسم میں جیسے بجلی سے بھر گئی۔ وہ بستر پر فوراً اسیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔ "واسم تو نے کس کو دیکھا؟"

"ساحل عمر صاحب کو۔" واسم نے پر زور لہجے میں ساحل کا نام دہرایا۔

تب برکھا بیڈ سے اتر کر اس کے نزدیک آ گئی اور اپنے زور زور سے دھڑکتے دل پر قابو پاتے ہوئے بولی۔ "واسم کیا تو ٹھیک کہہ رہا ہے۔ تجھے کوئی دھوکا تو نہیں ہوا؟"

"نہیں...... برکھا جی...... میری آنکھوں نے جو دیکھا' وہ صحیح دیکھا...... وہ ساحل عمر ہی تھے اور وہ اکیلے نہ تھے۔"

"کون تھا...... اس کے ساتھ؟"

"ان کے ساتھ ایک بے حد حسین لڑکی تھی جیسے کوئی اپلا پری...... جس انداز سے وہ ان کے ساتھ چل رہی تھی' اس سے ظاہر ہوتا تھا جیسے وہ ان کی بیوی ہے۔"

"اوہ......ساحل عمر نے شادی کر لی۔" برکھا پر جیسے بجلی گر پڑی۔ "واسم یہ تو بہت برا ہوا۔ جتنی خوشی ساحل عمر کی آمد کی خبر سن کر ہوئی تھی' اتنی ہی تکلیف اس کی شادی کی خبر سن کر ہوئی ہے۔ واسم تو نہیں جانتا کہ یہ کتنی بری خبر ہے۔ اس خبر نے میری ساری امیدوں پر پانی پھیر دیا۔"

"برکھا جی' یہ تو بہت برا ہوا۔" واسم کا منہ لٹک گیا۔

"اس میں تیرا کیا دوش...... اچھا بتا کیا تیری ورشا سے کوئی بات ہوئی؟"

"نہی برکھا جی...... میں نے انہیں کچھ نہیں بتایا۔"

"بس پھر اب تو جا...... اور میری کال کا انتظار کر......"

"ٹھیک ہے' برکھا جی...... میں جاتا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ مڑا اور بوجھل قدموں سے دروازے سے نکل گیا۔

اسکے جانے کے بعد بھی وہ گم صم کھڑی رہی۔ اس خبر نے اسے اندر سے ہلا کر رکھ دیا تھا۔ پھر اس نے سوچا ممکن ہے یہ خبر غلط ہو...... یہ ضروری تو نہیں کہ اس کے ساتھ آنے والی لڑکی اس کی بیوی ہی ہو' یہ اچانک وہ شادی کہاں سے کر لایا۔ پھر وہ ورشا کے کمرے کی طرف چل دی اس کی ٹانگیں لرز رہی تھیں اور دماغ میں آندھیاں سی چل رہی تھیں۔

☆......☆......☆

ساحل عمر نے اپنے گھر کے سامنے پہنچ کر ٹیکسی روکنے کا اشارہ کیا۔ ٹیکسی سے اترتے ہوئے اس کے دل کی دھڑکن اچانک تیز ہو گئی۔ وہ رشا ملوک سے مخاطب ہو کر بولا۔ "آؤ' رشا ملوک اترو' تمہارا گھر آ گیا۔"

"آ گیا...... میرا گھر۔" وہ بے اختیار خوش ہو کر بولی اور پھر فوراً ہی ٹیکسی سے اتر آئی۔

ساحل عمر نے ٹیکسی سے سامان اتار کر گیٹ پر رکھا۔ ٹیکسی کا کرایہ ادا کر کے ٹیکسی والے کا شکریہ ادا کیا۔

ٹیکسی کے اسٹارٹ ہوتے ہی اس نے کال بیل کے بٹن کو اپنے مخصوص انداز میں دبایا اور ذرا سا پیچھے ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔ گھر پر سناٹا چھایا ہوا تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے گھر میں کوئی نہیں ہے۔ گھر میں مرجینا موجود تھی۔ وہ اس وقت کچن کی صفائی میں مصروف تھی۔ گھر کی گھنٹی ایک مخصوص انداز میں بجتے سن کر وہ ایک دم چونک اٹھی۔ برتن چھوڑ کر اس نے فوراً اپنے ہاتھ دھوئے اور دوپٹے سے پونچھتی گھر سے باہر نکل آئی۔ اتنی دیر میں گھنٹی ایک بار اور بج اٹھی۔ مرجینا دوڑتی ہوئی گیٹ تک پہنچی۔

اس نے جلدی جلدی گیٹ کھولا اور پھر وہ گیٹ پر ساحل کو کھڑا دیکھ کر مسرت سے چیخ اٹھی۔ ساحل عمر اسے دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔

"صاحب جی آپ؟"

"ہاں' میں۔" ساحل عمر نے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

پھر وہ مڑ کر رشا ملوک سے مخاطب ہوا۔ "رشا ملوک یہ مرجینا ہے۔ میں تمہیں اسکے بارے میں بتا چکا ہوں۔ اس نے ہمارا گھر سنبھالا ہوا ہے۔"

رشا ملوک نے بڑی دلچسپی سے مرجینا کو دیکھا اور اسے دیکھ کر نرمی سے مسکرائی۔

اب مرجینا نے رشا ملوک کی طرف توجہ کی اور جھجکتے ہوئے انگلی سے اشارہ کر کے بولی۔

"صاحب جی' یہ......"

"مرجینا پہچانو...... یہ کون ہیں؟"

"میں نے پہچان لیا۔"

"پہچان لیا تو اچھا کیا...... ہمیں اندر آنے کا راستہ تو دو۔" ساحل عمر گیٹ میں داخل ہوتے ہوئے بولا۔ پھر اس نے سامان اٹھا کر گیٹ کے اندر رکھا۔ مرجینا نے گیٹ اندر سے بند کر دیا اور ساحل عمر سے مخاطب ہو کر بولی۔ "صاحب جی آپ اندر چلیں' میں سامان اٹھا کر لاتی ہوں۔"

نہیں' تم ہمارے ساتھ آؤ' سامان یہیں رہنے دو۔ خاصا وزنی ہے۔ میں آ کر لے جاؤں گا۔ اچھا یہ بتاؤ اماں کہاں ہیں؟" ساحل عمر نے آگے بڑھتے ہوئے پوچھا۔ "کیا انہوں نے میری گھنٹی کی آواز نہیں سنی۔"

"نہیں صاحب جی...... وہ سو رہی ہیں۔ جب سے آپ گئے ہیں ان کی طبیعت ٹھیک نہیں رہتی۔ خاصی دبلی ہو گئی ہیں۔ آج بھی ان کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ ناشتہ کرنے کے بعد اپنے کمرے میں جا کر سو گئیں۔" مرجینا نے بتایا۔

"کوئی بات نہیں...... اب میں آ گیا ہوں۔ ان کی طبیعت منٹوں میں ٹھیک کر دوں گا۔" ساحل نے چٹکی بجا کر کہا۔ "اچھا مرجینا' یہ تو بتاؤ' یہ کون ہیں؟"

"بتاؤں صاحب جی......؟ یہ ہماری مالکن ہیں۔" مرجینا نے رشا ملوک کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "اللہ کتنی پیاری ہیں۔" پھر ایک دم جیسے اسے کچھ یاد آ گیا۔ "ارے' یہ تو تصویر والی ہیں۔"

"تصویر والی؟" ساحل عمر نے سوالیہ انداز میں پوچھا۔

"آپ نے ان کی تصویر نہیں بنائی تھی کیا......؟ صاحب جی وہ تصویر جو آپ کے بیڈ روم میں لگی ہوئی تھی۔" مرجینا نے بتایا۔

"ہاں' مرجینا...... تم نے ٹھیک پہچانا...... میں وہی ہوں۔" ساحل عمر کی بجائے رشا ملوک نے جواب دیا۔

"اوہ...... کتنی اچھی آواز ہے' ہماری مالکن کی۔" مرجینا خوش ہو کر بولی۔

"اچھا مرجینا تم انہیں میرے کمرے میں لے کر چلو۔ انہیں دلہن بنا کر بیڈ پر بٹھاؤ۔ میں اماں کو اٹھا کر لاتا ہوں۔" ساحل عمر گھر میں داخل ہو کر بولا۔

"جی صاحب...... ٹھیک ہے۔" مرجینا نے رشا ملوک کو فوراً دلہنوں کی طرح تھام لیا اور دھیرے دھیرے بیڈ روم کی طرف بڑھی۔

ساحل عمر نے اماں کے کمرے کی طرف رخ کیا۔

اماں کے کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ وہ اندر داخل ہوا' اماں بیڈ پر ایک ہلکا سا کمبل اوڑھے لیٹی تھیں۔ ان کا چہرہ کھلا ہوا تھا اور آنکھیں بند تھیں۔ مرجینا نے ٹھیک کہا تھا۔ وہ واقعی دبلی ہو گئی تھیں۔ ان کا چہرہ ذرا سا نکل آیا تھا۔ وہ چند لمحوں تک اماں کا چہرہ غور سے دیکھتا رہا۔ پھر اس نے دھیرے سے ان کی آنکھوں پر اپنا ہاتھ جما دیا۔ تب اماں نے اپنے دونوں ہاتھ اس کے ہاتھ پر رکھ کر ہٹانے کے لئے زور لگایا۔ پھر اچانک ہی انہیں احساس ہوا کہ یہ تو ساحل عمر کا ہاتھ ہے۔ انہوں نے ایک مرتبہ پھر اس کی ہاتھ پر اپنا ہاتھ پھیرا اور گلو گیر آواز میں بولیں۔ "میرے بچے میرے ساحل۔"

ساحل عمر نے فوراً اپنا ہاتھ ان کی آنکھوں سے ہٹا لیا اور ان کے پاس ان کے سامنے بیٹھ گیا۔ اماں اسے دیکھتے ہی اٹھ کر بیٹھ گئیں جیسے تن مردہ میں جان پڑ گئی ہو۔ انہوں نے اسے لپٹا لیا اور رو پڑیں۔ "میرے ساحل تم کہاں چلے گئے تھے۔"

"اماں' رونے کی نہیں ہو رہی ہے۔" ساحل عمر نے ان کی آنکھوں کے آنسو اپنی انگلی سے صاف کرتے ہوئے کہا۔ "میں آپ کے لئے زبردست خوشخبری لے کر آیا ہوں۔"

"ہیں جلدی بتاؤ۔" اماں کے چہرے پر ایک دم رونق آ گئی۔

"بتاؤں نہیں دکھاؤں۔" ساحل عمر اٹھتا ہوا بولا۔ "آیئے' میرے کمرے میں چلیں۔"

ساحل عمر نے اماں کا ہاتھ پکڑ لیا اور پھر وہ دھیرے دھیرے اپنے بیڈ روم کی طرف بڑھا۔ اتنی دیر میں مرجینا' رشا ملوک کو بیڈ پر بٹھا کر دوپٹہ اڑھا چکی تھی۔ اس نے رشا ملوک کا چہرہ گھونگھٹ میں چھپا دیا تھا۔

ساحل عمر اپنے کمرے کے دروازے پر پہنچ کر رکا۔ دروازے پر مرجینا کھڑی تھی۔ اس نے اماں کو دیکھ کر خوشی سے نعرہ لگایا۔ "اماں جی' آپ کو مبارک ہو۔" یہ کہہ کر وہ سامنے سے ہٹ گئی۔

اب ان کی نظر بیڈ پر پڑی۔ انہوں نے بیڈ پر کسی کو گھونگٹ نکالے بیٹھے دیکھا۔ یہ منظر دیکھنے کے لئے تو وہ ایک عرصے سے آرزو مند تھیں۔ وہ ساحل عمر سے ہاتھ چھڑا کر بیڈ کی طرف لپکیں اور پھر

بیڈ پر بیٹھ کر رشا ملوک کا گھونگٹ الٹنے لگیں۔ پھر وہ گھونگٹ الٹتے الٹتے رک گئیں۔

''ابھی آئی۔'' یہ کہہ کر وہ کمرے سے نکل گئیں۔ پھر وہ فوراً ہی واپس آئیں۔ تو ان کی آنکھوں پر چشمہ لگا ہوا تھا اور ہاتھ میں زیور کا ایک ڈبہ تھا۔

اماں نے دوبارہ بیڈ پر بیٹھ کر رشا ملوک کا گھونگٹ اٹھایا اور دھیرے دھیرے الٹ دیا۔ وہ اس کی شکل دیکھتے ہی ''سبحان اللہ'' پکار اٹھیں۔

پھر جب انہوں نے اس کے چہرے پر غور کیا تو ایک دم پکار اٹھی.. ''ارے یہ تو تصویر والی دلہن ہے۔''

رشا ملوک نے آنکھیں کھول کر اماں کو دیکھا۔ پھر بڑی مترنم آواز میں بولی۔ ''ہاں اماں میں وہی ہوں۔''

''ماشاللہ خوب ہو...... اللہ تمہیں نظر بد سے بچائے۔'' اماں نہال ہوتے ہوئے بولیں۔

انہوں نے جانے کب سے ایک سونے کا سیٹ بنوا کر رکھا ہوا تھا۔ وہ سیٹ انہوں نے بڑے چاؤ سے ساحل عمر کی دلہن کو پہنا دیا اور پھر چٹ چٹ اس کی بلائیں لیں۔

اور جب یہ اطلاع ناصر مرزا اور مسعود آفاقی تک پہنچی تو وہ دونوں بے قرار ہو کر اسی وقت اس کے گھر پہنچ گئے۔ وہ دونوں سخت غصے میں تھے۔

ایک تو غصہ یہ تھا کہ وہ ایسا غائب ہوا کہ اس نے پلٹ کر اپنے بارے میں اطلاع بھی نہیں دی کہ کہاں ہے۔ بس ایک فون اماں کو کیا اور بس...... دوسرے خاموشی سے دلہن لے آیا۔ کسی کو کانوں کان ہوا بھی نہ لگنے دی۔ ان دونوں کو غصہ کرتے دیکھ کر اماں بھی ان کی ہم نوا بن گئیں۔

''ہاں بھیا تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔''

پھر جب ساحل عمر نے ان دونوں کو گھر سے نکل کر گھر واپس آنے تک کی روداد تو سنائی تو ان کا غصہ ٹھنڈا ہوا...... لیکن شادی کے معاملات سے دستبردار ہونے کے لئے وہ پھر بھی تیار نہ تھے۔ ان دونوں نے مل کر منصوبہ بنایا اور اس معاملے میں اماں نے بھرپور ساتھ دیا۔

''ہم اس شادی کو نہیں مانتے...... یہ شادی دوبارہ ہو گی۔'' مسعود آفاقی نے فیصلہ سنایا۔

''ہاں اور کیا بھیا...... ایسی شادی کا کیا فائدہ...... جس میں اپنے شریک ہی نہیں ہوئے۔'' اماں نے ان کے فیصلے سے اتفاق کیا۔

''اچھا بھائی ٹھیک ہے جیسے تم لوگوں کی مرضی۔'' بالآخر ساحل عمر نے ہتھیار ڈال دیئے۔

بس پھر کیا تھا دونوں دوستوں نے شادی کے انتظامات سنبھال لئے۔ کسی نے ہال بک کرایا کسی نے کھانے کا انتظام کیا۔ کسی نے شادی کے جوڑے سلوائے۔ کسی نے زیورات بنوائے۔

ان دنوں اماں کی حالت تو دیکھنے والی تھی ان کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ ہر کام میں خوب بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہی تھیں۔ ادھر سے ادھر بھاگی پھرتی تھیں۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے پھر سے جوان ہو گئی ہوں۔

ایک ہفتے کے اندر شادی ہونا طے پائی تھی۔ سارے انتظامات بہت تیزی سے جاری تھے۔

ساحل عمر کو واپس آئے تین دن ہو چکے تھے کہ اس دن عجیب واقعہ پیش آیا۔

تیسرے دن کی شام...... اس وقت ناصر مرزا اور مسعود آفاقی بھی اتفاق سے گھر پر موجود تھے۔ وہ اس سے کچھ بات کرنے آئے تھے۔ چائے چل رہی تھی کہ کسی نے کال بیل بجائی۔

بیل کی آواز سن کر مرجینا دروازے پر جانے لگی تو ساحل عمر نے اسے اشارے سے روک دیا۔ پھر وہ خود اٹھ کر گیٹ پر چلا گیا۔

گیٹ کھولا تو ساحل عمر سامنے کھڑے شخص کو دیکھتا رہ گیا۔ تہبند اور کرتہ پہنے' ہاتھ میں لاٹھی لئے' سرخ سفید چہرہ' لمبی سفید داڑھی' آنکھیں کھلی ہوئی مگر بے نور۔ آنکھوں کی پتلیاں نہ تھیں۔ اس کے باوجود ان کے چہرے پر اتنا نور تھا۔ ان کی شخصیت میں اتنی کشش تھی کہ آدمی انہیں دیکھتا تھا تو پھر نظر ہٹانے کو جی نہیں چاہتا تھا۔

ساحل عمر کی بھی انہیں دیکھ کر جیب حالت ہوگئی۔ زبان گنگ ہوگئی۔

"بھائی کیا یہ ساحل عمر کا گھر ہے۔" آنے والے نے انتہائی نرم لہجے میں پوچھا۔

ان کی آواز سن کر ساحل عمر ایک دم چونک اٹھا۔ یہ آواز مانوس سی لگی لیکن فوراً اسے یاد نہ آیا کہ یہ آواز اس نے کہاں سنی ہے۔ اس نے بڑے مئودبانہ لہجے میں کہا۔ "جی یہ میرا گھر ہے۔ میں ساحل عمر ہوں۔"

"بھائی میں موسیٰ خان ہوں لوگ مجھے حافظ موسیٰ کہتے ہیں۔" انہوں نے اپنا تعارف کرایا۔

ان کا نام سن کر ساحل عمر کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا۔ ناصر مرزا کے توسط سے وہ حافظ موسیٰ کا خاصا ذکر سن چکا تھا۔ پھر رشا ملوک کی بستی تک اس نام نے اس کا پیچھا کیا۔ اس نام نے اسے تحفظ فراہم کیا' بابا صاعق کے ذریعے حافظ موسیٰ کا بھجوایا ہوا تعویذ ملا۔ اس تعویذ نے کہاں کہاں اس کی مدد نہیں کی۔ اس کے دل میں تعویذ چھونے کا خیال پیدا ہوتا' وہ تعویذ پکڑتا تو ایک آواز سنائی دیتی جو مسئلے کا حل بتاتی...... اوہ' ہاں' اسے یاد آیا یہ آواز تو حافظ موسیٰ کی ہی ہوتی تھی۔

ساحل عمر نے جلدی سے آگے بڑھ کر حافظ موسیٰ کے دونوں ہاتھ چوم لئے اور بڑی عقیدت سے بولا۔ "اعلیٰ حضرت آپ کی آمد میرے لئے کسی عید سے کم نہیں۔ آیئے اندر تشریف لایئے۔"

حافظ موسیٰ نے پیچھے مڑ کر کسی سے کہا۔ "اچھا' بیٹا آپ جائیں...... ہم صحیح ٹھکانے پر پہنچ گئے ہیں۔"

ساحل عمر نے بڑی حیرت سے سامنے دیکھا۔ ادھر ادھر' دائیں بائیں...... سب طرف دیکھا مگر اسے وہاں آدم نہ آدم کی زاد...... کچھ نظر نہ آیا۔ پھر حافظ موسیٰ کس سے مخاطب تھے یہ بات اس کی کچھ میں نہ آئی۔

چند لمحے وہ سڑک کی جانب دیکھتے رہے جیسے نظروں نظروں میں کسی کو رخصت کر رہے ہوں۔ پھر انہوں نے اپنی گردن سیدھی کی اور لاٹھی بجاتے ہوئے گیٹ میں داخل ہو گئے۔

ساحل عمر نے جلدی سے گیٹ بند کیا اور آگے بڑھتے ہوئے حافظ موسیٰ کا ہاتھ تھام لیا۔

حافظ موسیٰ نے بڑی نرمی سے کہا۔ "شکریہ بھائی اس کی ضرورت نہیں...... تم بس میرے

آگے آگے چلو!" یہ کہہ کر انہوں نے اپنا ہاتھ چھڑا لیا اور لاٹھی ٹیکتے ہوئے اس انداز میں چلنے لگے جیسے سب دکھائی دے رہا ہو۔

ساحل عمر نے گھر کے دروازے کے نزدیک پہنچ کر دو چار تیزی سے قدم اٹھا کر جلدی سے گھر میں جانا چاہا تا کہ ناصر مرزا کو ان کی آمد کی اطلاع دے دے۔ اس کی تیزی سے قدم اٹھاتے ہی پیچھے سے آواز آئی۔

"بھائی' آخر ایسی جلدی کیا ہے...... اب ہم گھر میں تو جا ہی رہے ہیں۔"

"جی اعلیٰ حضرت...... آپ نے صحیح فرمایا۔"

"بھائی میں اعلیٰ ہوں نا ادنیٰ ہوں...... میں بس موسیٰ خان ہوں۔" انہوں نے ملائم لہجے میں کہا۔ "تم مجھے حافظ موسیٰ کہہ لو...... حافظ موسیٰ کہہ لو۔ بس اس سے زیادہ نہیں۔"

"جی بہتر...... حافظ صاحب!"

جب ساحل عمر ان کو لئے لاؤنج میں پہنچا تو ناصر مرزا حافظ موسیٰ کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ وہ ایک دم اچھل کر کھڑا ہو گیا اور لپک کر ان کے نزدیک پہنچا۔

"حافظ صاحب آپ!"

"اچھا' یہاں ناصر مرزا بھی براجمان ہیں!" انہوں نے ناصر مرزا کی آواز پہچان کر کہا۔

ناصر مرزا نے ان کا لاٹھی والا ہاتھ پکڑ کر ایک صوفے پر بٹھایا اور خود قالین پر ان کے قدموں میں بیٹھ گیا تو حافظ موسیٰ گویا ہوئے۔

"ناصر مرزا کیا یہاں صوفوں کی کمی ہے۔"

"نہیں...... حافظ صاحب' یہاں بیٹھنے کی بہت جگہ ہے۔" پھر وہ ان کا مطلب سمجھ کر ان کے نزدیک ہی دوسرے صوفے پر بیٹھ گیا۔ مسعود آفاقی انہیں بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔ ان کے بارے میں اس نے ناصر مرزا کی زبانی بہت کچھ سن رکھا تھا۔ اب اپنی آنکھوں سے دیکھا تو وہ اسے کسی اور دنیا کی مخلوق محسوس ہوئے۔

"بھائی ہم یہاں اپنی امانت واپس لینے آئے ہیں۔" حافظ موسیٰ نے کہا۔

ان کی بات کسی کی سمجھ میں نہ آئی۔ ساحل عمر نے ناصر مرزا کو دیکھا۔ ناصر مرزا نے آنکھوں ہی آنکھوں میں ساحل عمر سے سوال کیا۔ مسعود آفاقی نے باری باری دونوں کی طرف دیکھا...... ہر ایک نظر میں سوال تھا' جواب کسی کے پاس نہ تھا۔

"ساحل عمر۔" حافظ موسیٰ براہ راست ساحل عمر سے مخاطب ہوئے۔ "بابا صاعق نے ہمارے نام سے تمہیں کچھ دیا تھا؟"

"جی' حافظ صاحب دیا تھا۔" ساحل عمر کو فوراً وہ تعویذ یاد آ گیا جواب بھی اس کے گلے میں پڑا تھا۔

"بس بھائی...... ہم وہی لینے آئے ہیں۔" حافظ موسیٰ بولے۔ پھر تھوڑے سے توقف کے بعد ناصر مرزا کو مخاطب کیا۔ "ناصر مرزا تم ساحل عمر کے گلے سے وہ تعویذ اتار کر ہمارے گلے میں ڈال

"جی بہت بہتر۔" ناصر مرزا فوراً اٹھا۔ ساحل عمر کے نزدیک پہنچا۔ اس کے گلے سے تعویذ نکال کر حافظ موسیٰ کے گلے میں ڈال دیا۔ انہوں نے اس تعویذ کو چھو کر دیکھا اور پھر بے اختیار مسکرائے۔ ناصر مرزا کو احساس ہوا کہ جیسے وہ کچھ بولیں گے لیکن وہ کچھ نہ بولے۔ چند لمحوں بعد ان کے ہونٹوں سے وہ مسکراہٹ بھی غائب ہو گئی۔

"بھئی وہ لڑکی کہاں ہے؟" حافظ موسیٰ اچانک گویا ہوئے۔ "ساحل عمر تم نے کمال کیا۔ اس بستی کا قیمتی ہیرا نکال لائے۔ وہ بڑے دل گردے کے لوگ ہیں۔ انہوں نے بھی تردد نہ کیا۔ راضی بہ رضا اس لڑکی کو تمہارے ساتھ کر دیا۔ ساحل عمر تمہیں وہ لڑکی مبارک ہو...... کیا نام ہے اس کا۔"

"جی رشا ملوک۔" ساحل عمر نے بتایا۔

"اچھا ہاں۔" جیسے انہیں اس کا نام یاد آ گیا۔ "رشا ملوک...... بھئی رشا ملوک کو عذرا ملوک بناؤ...... ہمیں نکاح کے چھوہارے کھلاؤ۔ بھئی شادی کرو...... ہم نکاح پڑھائیں گے اور نکاح سے پہلے ہم اسے عذرا ملوک بنائیں گے۔"

"یہ تو بہت خوشی کی بات ہے۔ اس سے بڑا اعزاز ہمارے لئے اور کیا ہو سکتا ہے۔" ساحل عمر نے خوش ہو کر کہا۔

"حافظ صاحب، چار دن بعد ساحل عمر کی شادی ہے۔ میں آپ کو خود لینے آؤں گا۔" ناصر مرزا مئودبانہ انداز میں بولا۔

"بھائی، ہمیں ڈھول ڈھمکوں سے کیا لینا...... ہم تو ابھی آ گئے ہیں۔ اسے عذرا بنائیں گے۔ دونوں کا نکاح پڑھائیں گے چھوہارے کھائیں گے اور اپنے گھر کا رستہ لیں گے۔" حافظ موسیٰ نے اپنا سارا پروگرام بتا دیا۔

"حافظ صاحب، اس سے اچھی بات اور کیا ہو سکتی ہے۔ آپ تشریف رکھیں۔ میں ابھی چھوہاروں کا انتظام کرتا ہوں۔" یہ کہہ کر ناصر مرزا اٹھنے لگا۔

"ارے بھائی ناصر اتنا وقت ہمارے پاس کہاں......؟ اب تم کہاں چھوہارے لینے جاؤ گے...... ہماری جیب میں چھوہارے پڑے ہیں...... لو ذرا آؤ یہاں سے نکال لو۔" حافظ موسیٰ نے اپنے کرتے کی جیب کو ہاتھ سے کھولتے ہوئے کہا۔

ناصر فوراً اٹھا۔ ان کی جیب میں ہاتھ ڈالا تو چھوہاروں سے مٹھی بھر گئی۔ اس نے مٹھی باہر نکال کر مسعود آفاقی کو اشارہ کیا۔ وہ اسکے نزدیک آ کر کھڑا ہو گیا اور اپنی قمیض کا دامن پھیلا دیا۔

ناصر مرزا نے اپنی بھری ہوئی مٹھی اس کے پھیلے ہوئے دامن میں کھول دی۔

"اب دامن پھیلایا ہے تو ہمیں شرمندگی سے بچاؤ اور نکال لو چھوہارے۔" حافظ موسیٰ نے بدستور اپنی جیب چوڑی کئے ہوئے کہا۔

ناصر مرزا کے ہاتھ موقع آ گیا۔ وہ مٹھی بھر بھر کر چھوہارے نکال کر مسعود آفاقی کے دامن میں ڈالنے لگا۔ یہاں تک کہ اسکا دامن چھوہاروں سے بھر گیا۔ اتنی دیر میں ساحل عمر ایک ٹرے کچن سے

لے آیا۔ اس طرح وہ چھوہارے ٹرے میں منتقل کر دیئے گئے۔ سب حیران تھے کہ اتنی سی جیب سے اتنے ڈھیر سارے چھوہارے کیسے نکل آئے۔

پھر حافظ موسیٰ نے ایک سفید چادر قالین پر بچھانے کے لئے کہا' ساحل عمر نے فوراً حکم کی تعمیل کی۔ جب سفید چادر قالین پر بچھ گئی تو حافظ موسیٰ صوفے سے نیچے اتر آئے۔ وہ آلتی پالتی مار کر اطمینان سے چادر پر بیٹھ گئے۔ پھر بولے۔ ''لاؤ بھئی لڑکی کو بلاؤ...... وہ کہاں ہے۔ اسے کلمہ پڑھائیں۔ نکاح پڑھائیں اور اپنے گھر کو جائیں۔''

''جی اچھا۔'' ساحل عمر یہ کہہ کر بیڈ روم کی جانب بڑھا کہ اتنے میں ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ گھنٹی کی آواز سن کر حافظ موسیٰ کے کان کھڑے ہوگئے۔ ان کا چہرہ ایک دم سرخ ہوگیا۔ ساحل عمر ٹیلی فون کا ریسیور اٹھانے ہی والا تھا کہ حافظ موسیٰ چیخ اٹھے۔ ''نہیں...... ریسیور نہ اٹھانا۔''

☆......☆......☆

حافظ موسیٰ کی آواز اس قدر گرجدار تھی کہ ساحل عمر کا ہاتھ ریسیور پر جما رہ گیا۔ اس نے بڑی حیرت سے حافظ موسیٰ کی طرف دیکھا۔ ان کا چہرہ ابھی تک غصے سے سرخ تھا۔ ٹیلی فون کی گھنٹی اب بھی بج رہی تھی لیکن ساحل عمر ٹیلی فون سے دور ہو چکا تھا۔

چھ سات گھنٹیوں کے بعد ٹیلی فون خاموش ہو گیا۔ پورے گھر پر ایک سناٹا سا طاری تھا۔ چند لمحوں بعد حافظ موسیٰ کے چہرے میں تبدیلی آئی۔ وہ تھوڑا سا مسکرائے' پھر بولے۔ "ہاں بھئی' جلدی کرو' لڑکی کو لے کر آؤ۔ اسے وضو کروا کر لانا۔"

"جی بہتر۔" ساحل عمر نے کہا۔ اس کے دل میں سوال مچل رہا تھا۔ وہ پوچھنا چاہ رہا تھا کہ کس کا فون تھا اور انہوں نے ریسیور اٹھانے سے کیوں منع کر دیا...... لیکن اس میں ہمت نہ ہوئی' یہ سوال کرنے کی۔ وہ بیڈ روم کی طرف بڑھا۔

"ساحل عمر۔" تب حافظ موسیٰ نے آواز دی۔ ساحل عمر جاتے جاتے رک گیا اور دھیرے سے بولا۔ "جی۔"

"بھائی اس قدر بے قراری کیا ہے۔ اس کا فون دوبارہ آ جائے گا' میں یہ چاہتا ہوں کہ اس کے رابطے سے پہلے تمہارا بندھن مضبوط کر دوں۔" حافظ موسیٰ نے کہا۔ "اسی میں تمہاری بھلائی ہے۔"

"جیسی آپ کی مرضی۔" ساحل عمر کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ کیا کہنا چاہ رہے تھے۔ بہر حال اس نے اس مسئلے کو پس پشت ڈالا اور کمرے میں چلا گیا۔ اس نے اماں کو ہدایت کی۔ "اماں' رشا ملوک کو وضو کروا کر لاؤنج میں لے آئیں۔"

چند منٹ کے بعد اماں' رشا ملوک کو لے کر لاؤنج میں داخل ہوئیں۔ اماں اور رشا ملوک دونوں نے حافظ موسیٰ کو سلام کیا۔ سلام کا جواب دے کر حافظ موسیٰ نے اپنے سامنے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ رشا ملوک ان کے سامنے ادب سے بیٹھ گئی۔ سر پر دوپٹہ تھا اور سر جھکا ہوا تھا۔ حافظ موسیٰ نے اچانک ادھر ادھر گردن گھمائی جیسے کسی کی آمد کا احساس ہوا ہو۔ پھر وہ گویا ہوئے۔ "ساحل عمر گھر کا دروازہ کھول دو۔ ہوا آنے دو بھائی۔"

"حافظ صاحب...... دروازہ باہر کا کھولوں یا اندر کا......" ساحل عمر نے وضاحت چاہی۔

"بھائی اندر کا دروازہ کھلنا زیادہ بہتر ہو گا۔" حافظ موسیٰ نے اپنے مخصوص انداز میں جواب دیا۔

ساحل عمر نے اپنے گھر کا مین دروازہ کھول دیا اور پھر ان کے پاس آ کر بیٹھ گیا۔

"ہاں' رشا ملوک۔" اب وہ رشا ملوک سے مخاطب ہوئے۔ اپنا نام سن کر رشا ملوک نے اپنی پلکیں اٹھائیں۔ ایک لمحے کو حافظ موسیٰ کو دیکھا اور پھر آنکھیں جھکالیں۔

"رشا ملوک جو پوچھوں اس کا جواب دیتی جاؤ...... سوال کا جواب دینے میں تم مکمل طور پر آزاد ہو۔" حافظ موسیٰ نے کہا۔ "میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں' کیا تم اپنی مرضی سے ساحل عمر کے ساتھ آئی ہو۔"

"جی بالکل۔" رشا ملوک نے بلا جھجک جواب دیا۔

"تم جانتی ہو کہ ساحل عمر کا مذہب کچھ اور ہے' تم لوگوں کا عقیدہ کچھ اور...... میں جانتا ہوں کہ تم لوگ وقت کے ماننے والے ہو۔ ہمارے ہاں موت اور زندگی کا وقت مقرر ہے' نہ ایک لمحہ پہلے نہ ایک لمحہ بعد...... وقت پر اللہ کی حکمرانی ہے۔ اس کی مرضی کے بغیر ایک پتا بھی نہیں ہلتا۔ اس بستی میں جو ہوا' سو ہوا۔ وہاں کا قانون کچھ اور ہے یہاں کا قانون کچھ اور ہے۔ یہاں تمہاری شادی اس وقت تک نہیں ہو سکتی جب تک تم اپنے شوہر کا مذہب اختیار نہ کرلو۔ میں تم سے سوال کرتا ہوں' کیا تم اپنے شوہر کا مذہب اختیار کرنے پر خوشی سے راضی ہو۔"

"جی بہت خوشی سے۔" رشا ملوک نے اس مرتبہ بھی جواب دینے میں ایک لمحہ نہ لگایا۔

"تمہارا نام بھی تبدیل ہو گا...... تمہارا نیا نام عذرا ہوگا...... چاہے عذرا ملوک' چاہے عذرا ساحل...... جو تمہیں پسند ہو۔" حافظ موسیٰ نے کہا۔

"عذرا ساحل۔" رشا ملوک نے اپنا نام منتخب کرنے میں ذرا دیر نہ کی۔

"ماشاء اللہ۔" حافظ موسیٰ نے خوشی کا اظہار کیا۔ "چلو بس' اب پڑھو بسم اللہ۔"

تب حافظ موسیٰ نے اسے اللہ کے آخری مذہب کے بارے میں بنیادی معلومات فراہم کیں اور پھر کلمہ پڑھا کر اسے دائرہ اسلام میں لے آئے۔ حافظ موسیٰ سمیت سب نے عذرا ساحل کو مبارک باد دی...... اس کے بعد حافظ موسیٰ نے نکاح پڑھا کر انہیں ازدواجی بندھن میں باندھ دیا۔ اپنے کرتے کی جیب میں ہاتھ ڈال کر دو چھوہارے نکالے۔ ایک ساحل عمر کو دیا' دوسرا عذرا ساحل کے ہاتھ پر رکھا ساحل عمر نے چھوہاروں سے بھری ٹرے ان کے سامنے رکھی حافظ موسیٰ نے ایک چھوہارا اٹھا کر منہ میں ڈال لیا۔

پھر سب نے ساحل عمر کو مبارکباد دی۔ اس مبارک سلامت کے شور میں ساحل عمر اور عذرا پر اچانک پھولوں کی پتیاں برسنے لگیں۔ لاؤنج ایک دم خوشبو سے مہک اٹھا۔ سب حیران رہ گئے کہ یہ گلاب کے پھولوں کی ڈھیروں پتیاں اور خوشبو کہاں سے آئی۔

"تم آخر باز نہیں آئے۔ اسی لئے تم لوگوں کو اندر نہیں بلا رہا تھا۔ اچھا چلو اب جاؤ۔" حافظ موسیٰ جانے کن لوگوں سے مخاطب تھے۔ نظر کوئی نہ آیا۔ نہ آتے ہوئے نہ جاتے ہوئے۔

کچھ دیر کے بعد موسیٰ خود بھی کھڑے ہو گئے اور ناصر مرزا سے مخاطب ہو کر بولے۔ "چلو بھائی' ناصر مرزا ہمیں ہمارے ٹھکانے پر چھوڑ آؤ۔"

"حافظ موسیٰ ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔ ہم آپ کو کھانا کھلائے بغیر نہیں جانے دیں گے۔" ناصر مرزا نے فوراً کہا۔

"ارے نہیں بھائی...... اتنا وقت نہیں ہے میرے پاس...... میری جان کو سو بکھیڑے ہیں۔ اب میں چلوں گا۔ اچھا بھئی ساحل عمر اللہ حافظ...... تم ناصر مرزا کو لے کر میرے پاس آنا اور ہاں سار ملوک کی اس تلوار کا خاص خیال رکھنا۔ اس کے پیچھے چور لگیں گے۔ اس کی حفاظت تم پر لازم ہے۔ ٹھیک ہے میں چلتا ہوں۔"

اتنی دیر میں عذرا ساحل بھی کھڑی ہو چکی تھی۔ اس نے دھیرے سے کہا۔ "حافظ صاحب، اللہ حافظ۔"

"اللہ تمہارے نصیب اچھے کرے۔" یہ کہہ کر انہوں نے عذرا کے سر پر دھیرے سے ہاتھ رکھا اور دروازے کی طرف بڑھے۔ "چلو بھائی ناصر مرزا۔"

☆......☆......☆

ٹیلی فون کی گھنٹی بجی تو ساحل عمر کی نظر دیوار کی گھڑی پر پڑی۔

گیارہ بج کر پانچ منٹ ہوئے تھے۔

وہ لوگ رات کا کھانا کھا کر خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ ان دونوں کے ساتھ اماں بھی ڈائننگ ٹیبل پر موجود تھیں۔ اماں کی خوشی دیکھنے کے لائق تھی۔ وہ عذرا ساحل کو تین دن سے بار بار اس طرح دیکھتی تھیں جیسے اسے پہلی بار دیکھ رہی ہوں۔ ان میں جان پڑ گئی تھی۔ وہ اس پر نہال ہوئی جاتی تھیں۔ ان کی ساری بیماری کافور ہو گئی تھی۔ اب وہ گھر میں اس طرح دوڑی پھر رہی تھیں جیسے ان کے اندر کوئی "پاور ہاؤس" اسٹارٹ ہو گیا ہو۔

عذرا بھی ان کی اس نچھاور ہونے والی محبت سے خاصی متاثر ہوئی تھی۔ وہ اماں کو اپنے پاس ہی بٹھائے رکھتی تھی۔ اماں اسے دن بھر نت نئے قصے سناتی رہتی تھیں۔ کبھی وہ ساحل عمر کے بچپن کے قصے سناتی رہتی تھیں۔ کبھی وہ اسے ساحل کے والدین کے بارے میں بتاتیں۔ غرض عذرا کے لئے اس وقت اماں معلومات کا خزانہ ثابت ہو رہی تھیں۔

اور آج تو اماں کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ ہی نہ تھا۔ انہیں رشا ملوک کے بارے میں زیادہ معلومات نہ تھیں کہ وہ کون تھی، کہاں سے آئی تھی، نہ ہی اس سلسلے میں ان کے ذہن میں کوئی تجسس تھا۔ انہیں تو ساحل عمر کی دلہن درکار تھی سو وہ انہیں میسر آ گئی تھی۔ حافظ موسیٰ نے اسے دائرہ اسلام میں لا کر اور نکاح پڑھا کر اضافی خوشیاں بخش دی تھیں۔ وہ کافی دیر سے ان دونوں کے ساتھ بیٹھی تھیں۔ اب وہ کافی کنگ سمیٹ کر اٹھنے کا سوچ رہی تھیں کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بج اٹھی۔

اور یہ وہ وقت تھا جس پر کبھی ساحل عمر کی دھڑکن تیز ہو جایا کرتی تھی۔

دھڑکن تو خیر اس وقت بھی اس کی تیز ہو گئی کیونکہ حافظ موسیٰ کے جانے کے بعد یہ پہلا فون تھا۔ پہلے انہوں نے اسے ٹیلی فون کا ریسیور نہیں اٹھانے دیا تھا۔ وہ پورے استحکام کے ساتھ ٹیلی فون کی طرف بڑھا۔ اس نے ریسیور اٹھایا اور اپنے مخصوص انداز میں بولا۔ "جی۔"

''بے مروت انسان۔'' ادھر سے کوئی بولا' لہجے میں بڑی کاٹ تھی' بڑا جلا کٹا تھا۔
''کون ہیں آپ؟'' ساحل عمر نے آواز تو پہچان لی تھی لیکن اس آواز نے کبھی اس لہجے میں بات نہ کی تھی اسے لئے اس نے تصدیق کر لینا بہتر جانا۔
''کبھی ہم بھی تم بھی تھے آشنا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو۔''
''اچھا تو یہ آپ ہیں۔'' ساحل عمر کو اب یقین ہو گیا کہ فون پر بات کرنے والی ورشا ہی ہے۔
''شکر ہے پہچانا تو ورنہ رانگ نمبر کہہ کر رکھ دیتے تو میں کیا کر لیتی۔'' ورشا نے بڑی چاہت سے کہا۔ ''سنو میں نے شام کو بھی فون کیا تھا۔ کیا تم گھر پر نہ تھے۔''
''شام کو کس وقت؟'' ساحل عمر نے سوال کیا۔
''یہی کوئی پانچ بجے۔'' اس نے بتایا۔
اچھا تو وہ فون اس کا تھا۔ جس کے بارے میں حافظ موسیٰ نے کچھ نہیں بتایا تھا۔ بس اتنا کہا تھا کہ اس کے رابطے سے پہلے میں تمہارا بندھن مضبوط کر دینا چاہتا ہوں اور پھر انہوں نے ایسا ہی کیا تھا۔ ورشا کے دوبارہ فون آنے سے پہلے عذرا اور ساحل عمر کو رشتہ ازدواج میں منسلک کر دیا تھا۔ شاید اس میں کوئی حکمت تھی ہو سکتا ہے نکاح سے پہلے دونوں کے درمیان ٹیلی فونی رابطہ کوئی گل کھلا دیتا۔ خیر جو بھی تھا' اب تو وہ وقت گزر چکا تھا۔ اس کا بندھن مضبوط ہو چکا تھا' اب اسے کوئی خطرہ نہ تھا۔
''ہاں' اس وقت میں باہر گیا تھا۔'' ساحل عمر نے کہا۔
''کیا گھر میں کوئی بھی نہ تھا۔''
''گھر میں سب تھے۔''
''میں نے کافی دیر ریسیور اٹھائے رکھا لیکن کسی نے اٹھایا نہیں۔''
''ہو سکتا ہے ٹیلی فون کی گھنٹی کی آواز کسی نے بند کر دی ہو۔ صفائی کرتے ہوئے اکثر ایسا ہو جاتا ہے۔'' ساحل عمر نے بڑے سلیقے کا عذر تراشا۔
''کیا کر رہے تھے۔''
''میں بیٹھا ہوا تھا...... کافی پی رہا تھا اور اماں سے باتیں کر رہا تھا۔'' اس نے عذرا کا ذکر قصداً گول کر دیا۔
''اماں سے باتیں کر رہے تھے؟'' یہ کہہ کر وہ زور سے ہنسی۔ یہ وہ ہنسی تھی جو اس کا چین لوٹ لیا کرتی تھی۔
''ہنس کیوں رہی ہو۔ میں نے ایسی کیا غلط بات کہہ دی۔''
''نہیں تم نے کوئی غلط بات نہیں کہی مجھے بس ایسے ہی ہنسی آ گئی تھی۔ اچھا سنو...... ایک عرصہ ہو گیا ہمیں ملے...... کیا ملاقات ممکن ہے۔'' ورشا نے پوچھا۔
''میں سوچ کر بتاؤں گا۔'' ساحل عمر نے صاف جواب نہ دیا۔
''ایک ہفتے کے بعد۔'' وہ بولا۔

''ایک ہفتے کے بعد کیوں......؟ آخر ابھی کیوں نہیں...... ایک ہفتے کے بعد کوئی انقلاب آ جائے گا۔''

''ہاں یہی سمجھ لو۔'' ساحل عمر نے سنجیدگی سے کہا۔

اتنے میں عذرا ڈائننگ ٹیبل سے اٹھ کر لاؤنج میں داخل ہو گئی۔ اس نے مسکرا کر اشارے سے پوچھا کس کا فون ہے۔ ساحل عمر نے جواب دینے کے بجائے اسے اپنے پاس بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ عذرا اس کے نزدیک بیٹھ گئی۔

''تم مجھ سے کیا چھپا رہے ہو......؟ صاف کہو جو کہنا ہے۔'' ورشا نے تیکھے لہجے میں کہا۔

''نہیں میں کچھ نہیں چھپا رہا...... شادی بھی بھلا کوئی چھپانے کی چیز ہے۔ وہ بھی پہلی شادی۔'' وہ بولا

''شادی!'' اس کی آواز میں ناگن کی سی پھنکار تھی۔

''چار دن کے بعد میری شادی ہے۔'' ساحل عمر نے بڑے مزے سے جواب دیا۔

''تمہیں شادی مبارک ہو...... ساحل عمر مجھے اپنی شادی کا کارڈ ضرور بھیجنا میں تمہاری شادی میں ہر قیمت پر آؤں گی۔'' ورشا نے بڑے صاف انداز میں یہ بات کہی۔

''مجھے خوشی ہو گی......ضرور آنا...... میں تمہیں کارڈ بھجوا دوں گا۔''

ساحل عمر کا خیال تھا کہ وہ شادی کے ذکر پر گلے شکوے کرے گی۔ اپنی دوستی کے حوالے دے گی پچھلی یادیں دہرائے گی لیکن اس نے ایسا کچھ نہ کیا۔ بس خاموشی سے ریسیور رکھ دیا۔ البتہ اس نے ٹھنڈی آہ ضرور بھری۔

پھر اس نے ٹیلی فون اپنی گود سے اٹھا کر سائیڈ ٹیبل پر پٹخا اور اپنے دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔ برکھا بیڈ پر اس کے برابر ہی بیٹھی تھی اس نے ورشا کو اپنی گود میں لٹا لیا اور فکرمند انداز میں بولی۔ ''کیا ہوا''

''ممی اس نے شادی کر لی۔'' ورشا نے بڑی اداسی سے کہا۔

''تجھے تو میری بات کا یقین ہی نہیں آ رہا تھا۔ اب بتا میں نے ٹھیک کہا تھا ناں...... میری اطلاع کبھی غلط نہیں ہوتی۔'' برکھا نے اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا۔ ''تجھے اس کی شادی کا رنج ہوا؟''

''نہیں ممی...... میرا بھلا وہ کیا لگتا تھا۔ میں کیوں رنجیدہ ہوتی۔'' ورشا نے اپنی آواز میں استحکام پیدا کرنے کی کوشش کی لیکن ہو نہیں سکا۔ اس کی آواز میں لرزش تھی اور اس لرزش کا صاف پتہ لگ رہا تھا۔

''لیکن مجھے بہت دکھ پہنچا ہے۔'' برکھا نے ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے کہا۔ ناقابل تلافی نقصان پہنچا ہے۔''

''ممی کیا تم اس سے محبت کرنے لگی تھیں، اس سے شادی کرنا چاہتی تھی۔''

''نہیں ایسی تو کوئی بات نہیں۔'' برکھا جلدی سے بولی۔ وہ ورشا کا سوال سن کر پریشان ہو گئی

تھی۔ ''میں تو اس کی بلی دینا چاہتی تھی اور بلی کے بدلے مانا کو حاصل کرنا چاہتی تھی۔ اس لئے میں نے تجھے اس کے پیچھے لگایا تھا تاکہ تو گھیر کر اسے میرے پاس لے آئے اور میرے اس مقصد کو تو اچھی طرح جانتی ہے۔''

''پھر ممی...... اس کی شادی سے آپ کو کیا فرق پڑا...... آپکو نقصان کیسے ہوا؟''

''میری بلی اب اشدھ ہو گئی' ناپاک ہو گئی۔ شادی کے بعد وہ اس قابل نہیں رہا کہ اسے قربان کیا جا سکے۔ یہ سب اتنا اچانک ہو گیا کہ میں اس اطلاع پر افسوس کرنے کے سوا کچھ نہ کر سکی۔ خیر چھوڑوں گی تو میں اسے اب بھی نہیں۔ اس نے میری پوری زندگی کی تپسیا بھنگ کی ہے۔ میری آرزوؤں کا خون کیا ہے۔ میں اس خون کا بدلا لے کر رہوں گی۔'' برکھا نے دانت پیس کر کہا۔

''ممی اب کیا کرو گی؟'' ورشا نے سوال کیا۔

''میں اسے سسکا سسکا کر ماروں گی۔ اب تو دیکھتی جا' میں کیا کرتی ہوں۔'' برکھا نے اسے گود میں اٹھاتے ہوئے کہا۔

ورشا فوراً اس سے دور ہو کر بیٹھ گئی کیونکہ برکھا کے وجود سے پھوٹنے والی بدبو اب ناقابل برداشت ہو گئی تھی۔

☆......☆......☆

ساحل عمر کی شادی میں یوں محسوس ہوتا تھا جیسے پورا شہر امڈ آیا ہو۔ بے شمار لوگ تھے اور کیوں نہ ہوتے۔ یہ صرف ساحل عمر کی تقریب نہ تھی۔ ناصر مرزا اور مسعود آفاقی بھی اس میں برابر کے شریک تھے۔ مسعود آفاقی نے پریس کے بہترین لوگوں کو مدعو کر رکھا تھا۔ ناصر مرزا نے بزنس مینوں اور شوبز کے لوگوں کو اکٹھا کر لیا تھا۔ ساحل عمر نے آرٹ کی دنیا کے لوگوں کو بلا لیا تھا۔ اس طرح اس تقریب میں شہر کی کریم نظر آ رہی تھی۔

مسعود آفاقی لڑکے والا بن گیا تھا اور ناصر مرزا نے لڑکی والوں کا کردار ادا کرنے کا فیصلہ کیا تھا اور اس شادی کی سب سے اہم مہمان تھیں اماں...... انہیں ہاتھوں ہاتھ لیا جا رہا تھا۔

شہر کا ایک بہترین ہال بک کیا گیا تھا۔ یہ ہال بڑی خوبصورتی سے سجایا گیا تھا۔ اسٹیج پر صرف تین مرصع کرسیاں تھیں۔ ایک کرسی پر ساحل عمر' دوسری پر عذرا اور عذرا کے برابر اماں تھیں۔ ان کرسیوں کے علاوہ اسٹیج پر صوفے رکھے ہوئے تھے۔ نکاح پہلے ہی ہو چکا تھا۔ اس لئے لوگ قاضی کی آمد اور نکاح کے انتظار کی زحمت سے بچ گئے تھے۔

لڑکی والوں نے بارات کا شاندار استقبال کیا۔ بارات کی آمد کے بعد اسٹیج پر عذرا کو لایا گیا۔ وہ سبز رنگ کے کپڑوں میں تھی اور یہ سبز رنگ کا جوڑا خود ساحل عمر نے اس کے لئے پسند کیا تھا۔ سبز رنگ کے اس انتہائی قیمتی جوڑے میں وہ بالکل سبز پری لگ رہی تھی۔ اس کا حسن ملکوتی تھا' اس رنگ نے اس کے حسن کو مزید نکھار دیا تھا۔ جو ساحل عمر کی دلہن کو دیکھتا تھا اس کی نظر اس پر جم کر رہ جاتی تھی۔ سب پریشان تھے کہ ایسی حسین لڑکی' ساحل عمر نے کہاں سے ڈھونڈ نکالی۔ لڑکوں کی مائیں بار بار اماں سے پوچھ رہی تھیں۔ ''اے کیا اس کی کوئی اور بہن بھی ہے۔''

اماں کچھ جل کر اور کچھ ہنس کر جواب دیتیں۔ ”نہیں اللہ نے بس یہی ایک پیس بنایا تھا۔“
اماں کا یہ جواب کچھ غلط بھی نہ تھا۔ اللہ نے واقعی اسے یکتا اور اکلوتا بنایا تھا۔
اسٹیج پر دھڑا دھڑ تصویریں بن رہی تھیں۔ وڈیو فلم شوٹ کی جا رہی تھی۔ مسعود آفاقی بھی فوٹو گرافی میں لگا ہوا تھا۔ وہ اس جوڑے کی اچھی سے اچھی تصویر اتار لینا چاہتا تھا۔
اماں بہت خوش تھیں۔ بات بے بات ہنس رہی تھیں۔ جو لوگ یہ جانتے تھے کہ ساحل عمر کے والدین کا انتقال ہو چکا ہے۔ ان لوگوں نے جب اماں کے بارے میں استفسار کیا کہ یہ کون ہیں؟ اور جب انہیں یہ جواب ملا کہ یہ ساحل عمر کے گھر کی پرانی ملازمہ ہیں اور ساحل عمر کو انہوں نے گودوں کھلایا ہے تو یہ سن کر وہ حیران رہ جاتے تھے کہ ایک ملازمہ کی اتنی اہمیت...... اتنا احترام۔
کھانے کا وقت قریب تھا۔ ڈشوں کے نیچے چراغ جلائے جا رہے تھے کہ کھانا ٹھنڈا نہ ہونے پائے۔ اتنے میں ہال میں ایک ہلچل سی مچی۔ جس نے بھی اسے دیکھا' وہ چونکے بنا نہ رہ سکا۔
وہ بڑے پروقار انداز میں میزوں کے درمیان بنے راستے پر چلی آ رہی تھی۔ اس کا رخ اسٹیج کی طرف تھا۔ وہ کالی ساڑھی جس پر ستاروں کا کام تھا' باندھے تھی۔ بغیر آستین کا چھوٹا سا بلاؤز پہنے' شاخ گل کی طرح لچکتی۔ شانوں پر زلفیں بکھیرے۔ شہر کے کسی بڑے بیوٹی پارلر سے میک اپ کروائے۔ لوگوں کے درمیان سے لوگوں پر بجلیاں گراتی بڑھتی جا رہی تھی۔ اس پر جس کی بھی نظر پڑ رہی تھی چاہے وہ مرد ہو یا عورت...... اس کو دیکھے بغیر نہیں رہ پا رہا تھا۔ اس کے بارے میں سرگوشیاں ہو رہی تھیں۔ یہ کون ہے؟ کہاں سے آئی ہے' طرح طرح کے سوال ذہنوں میں اٹھ رہے تھے لیکن وہ جو بھی تھی خوب تھی۔ قابل توجہ تھی...... وہ ورشا تھی!
ساحل عمر نے جب اسے اسٹیج کی سیڑھیاں چڑھتے دیکھا تو وہ دم بخود رہ گیا۔ اس لئے نہیں کہ وہ اس کے حسن سے متاثر ہو گیا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں ورشا آگ تھی لیکن جو حسن اس کے پہلو میں تھا وہ بھی کسی سے کم نہ تھا' وہ شبنم تھا۔ ٹھنڈا آنکھوں کی روشنی بڑھانے والا۔ وہ اس لئے دم بخود رہ گیا کہ اسے ورشا کے شادی میں شریک ہونے کی امید نہ تھی۔ اس نے اسے کارڈ ضرور بھجوایا تھا محض رسمی طور پر' وہ نہیں جانتا تھا کہ وہ چلی آئے گی۔
خیر اب تو وہ کسی قیامت کی صورت برپا ہو ہی گئی تھی۔ اب جو ہو سو ہو۔
وہ سیدھی ساحل عمر کی طرف بڑھی۔ ساحل عمر اسے دیکھ کر احتراماً کھڑا ہو گیا۔ ورشا نے بے تکلفی سے اس سے ہاتھ ملانے کے لئے اپنا نرم و نازک ہاتھ آگے بڑھایا۔ ساحل عمر مخمصے میں پھنس گیا۔ پھیلے ہوئے ہاتھ کو نظر انداز کر دے یا ہاتھ ملا کر عذرا کے دل میں سوئی چبھو دے۔
ابھی وہ کچھ فیصلہ نہ کر پایا تھا کہ اماں نے فیصلہ کن انداز اختیار کیا۔ وہ بڑی برق رفتاری سے اپنی کرسی سے اٹھیں اور بڑے پیار سے بولتے ہوئے ورشا کا ہاتھ تھام لیا۔ ”اوہ ورشا آئی ہیں۔“
”جی اماں' آپ کیسی ہیں؟“ اس نے اپنی سیاہ زلفوں کو جھٹک کر پوچھا۔
”میں بہت اچھی ہوں...... آؤ' ورشا ادھر صوفے پر آ جاؤ۔“ اماں اسے بڑے پیار سے پکڑ کر صوفے کی طرف لے گئیں۔

''کون ہے یہ؟'' عذرا نے ساحل کو ترچھی نگاہوں سے دیکھا۔

''ایسی نگاہوں سے مجھے مت دیکھو...... یہ ورشا ہے۔'' ساحل عمر نے بتایا۔ ''اماں اس وقت میرے لئے فرشتہ ثابت ہوئی ہیں۔ میں ابھی دو چار منٹ میں اسے چلتا کر کے آتا ہوں' تم پورے اطمینان سے بیٹھو۔''

پھر وہ اماں کے پیچھے پیچھے صوفے پر جا بیٹھا۔ اماں فوراً ہی وہاں سے اٹھ کر عذرا کے پاس آ گئیں اور اسے بڑے پیار سے مسکرا کر دیکھنے لگیں۔ جیسے کہہ رہی ہوں۔ پریشان مت ہونا' اس کی حیثیت پانی کے بلبلے سے زیادہ نہیں۔

''شادی مبارک ہو۔'' ورشا نے مسکرا کر کہا لیکن اندر ہی اندر اس کے دل پر آنسو گرے۔

''شکریہ۔''

''اچھا انتخاب ہے۔ کہاں سے لائے اسے۔'' ورشا نے اسے اداس نگاہوں سے دیکھا۔

''یہ تمہاری ماں کی مہربانی کا نتیجہ ہے۔''

''میری ماں تم پر مہربان ضرور ہے لیکن وہ تمہیں کچھ دے نہیں سکتی لے ضرور سکتی ہے۔''

''پھر تم اپنی ماں کو اچھی طرح جانتی ہو۔''

''ہاں' کیوں نہیں...... میں اپنی ماں کی رگ رگ سے واقف ہوں۔''

''کیا تم جانتی ہو کہ اس نے مجھے کوئی نشہ آور دوا پلا کر کہیں سے کہیں پہنچا دیا تھا۔''

''میں نہیں جانتی۔''

''تمہاری ماں نے مجھ پر بہت ظلم کئے ہیں۔ وہ مجھے قربان کر کے کوئی پراسرار قوت حاصل کرنا چاہتی تھی۔ خیر یہ لمبی داستان ہے پھر کبھی سناؤں گا' فی الحال اس کا موقع نہیں۔ بس تم اتنا جان لو کہ تمہاری ماں نے میری جان لینے کی پوری تیاری کر لی تھی لیکن اوپر والے نے مجھے بچا لیا۔ نہ صرف بچا لیا بلکہ انعام میں ایسی حسین لڑکی بھی بخش دی۔ اب تم واپس جا کر اپنی ماں کو سارا حال بتا دینا اور اس سے کہنا کہ اب وہ میرا پیچھا چھوڑ دے...... مجھے بھول جائے۔'' ساحل عمر نے بہت دھیمے لہجے میں یہ بات کہی۔

''میں تمہارا پیغام اپنی ماں تک پہنچا دوں گی لیکن اتنا یاد رکھو کہ وہ تمہیں بھولنے والی نہیں۔''

''پھر وہ نقصان اٹھائے گی۔''

''نقصان کون اٹھائے گا یہ مجھے نہیں معلوم لیکن میں اتنا ضرور جانتی ہوں' وہ بڑی خطرناک عورت ہے۔ اس کا مقابلہ کرنا کوئی آسان کام نہیں۔''

''چلو دیکھا جائے گا۔'' ساحل عمر نے بات ختم کرنا چاہی' کیونکہ عذرا اس کی طرف دیکھ کر بار بار پہلو بدل رہی تھی۔

ورشا نے اپنے کندھے سے بیگ اتار کر اسے کھولا اور پھر اس میں سے ایک مخملی ڈبیہ نکال کر بیگ بند کر کے کندھے پر ڈالا اور اسے مسکرا کر دیکھا۔ ''میری طرف سے تمہاری بیوی کے لئے حقیر سا تحفہ......''

"ارے اس تکلف کی کیا ضرورت تھی۔ تم آ گئیں یہی تحفہ میرے لئے بہت ہے۔"

"دیکھو میرا دل نہ توڑنا...... اسے رسم دنیا سمجھ کر قبول کر لو۔"

"نہیں، میں تمہارا دل نہیں توڑوں گا۔ آؤ میرے ساتھ۔ تم خود ہی عذرا کو یہ تحفہ دے دو۔"

یہ کہہ کر ساحل عمر فوراً اٹھ گیا۔ اس نے قریب پہنچ کر ورشا سے خالی کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور عذرا سے مخاطب ہو کر بولا۔ "عذرا، یہ ورشا ہیں...... تمہارے لئے تحفہ لائی ہیں، قبول کرو۔"

اب عذرا نے گردن گھما کر ورشا کو دیکھا۔ ورشا نے بھی اس پر نظر ڈالی۔ دونوں کی نظریں ملیں۔ ایک کی نظر میں فتح رچی ہوئی تھی اور ایک کی نظر میں شکست بسی ہوئی تھی لیکن دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرائیں اپنے اپنے انداز میں۔

ورشا نے پھر وہ ڈبیہ کھولی۔ اس میں ایک قیمتی ہیرے کی انگوٹھی جگمگا رہی تھی۔

"ساحل آپ اجازت دیں تو میں یہ انگوٹھی اپنے ہاتھوں سے انہیں پہنا دوں۔"

ساحل عمر نے ایک نظر عذرا کو دیکھا۔ اس کی نگاہوں میں انکار نہ تھا۔ ساحل عمر فوراً بولا۔ "بھلا مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔"

"تھینک یو۔" ورشا نے ایک ادا سے کہا اور اس نے بائیں ہاتھ کی ایک خالی انگلی میں وہ ہیرے کی انگوٹھی پہنا دی۔

"آپ کا شکریہ۔" عذرا نے انگوٹھی پہننے کے بعد دھیرے سے کہا۔

تب ورشا فوراً کھڑی ہو گئی۔ اس نے اپنی کلائی کی گھڑی میں ٹائم دیکھا اور بولی۔ "اچھا ساحل صاحب میں چلتی ہوں۔"

"ارے کیوں...... کھانا کھا کر جانا۔"

"نہیں، مجھے ایک ضروری کام ہے۔ جاؤں گی۔"

"اچھا جیسے تمہاری مرضی۔" ساحل عمر نے اسے روکنے کے لئے زیادہ اصرار نہ کیا۔

اور وہ چلی گئی...... جاتے ہوئے اس نے اماں سے سلام دعا کی نہ عذرا کی طرف دیکھا۔ اس نے یہ انتظار بھی نہ کیا کہ ساحل عمر اسے رخصت کرنے اسٹیج کی سیڑھیوں تک آئے۔ بس وہ تیزی سے پلٹی اور اسٹیج کی سیڑھیاں کھٹ کھٹ اترتی جس طرح آئی تھی ویسے ہی لوگوں کے دلوں پر بجلیاں گراتی شادی ہال سے نکل گئی۔

☆......☆......☆

بارہ بجے کے بعد رخصتی کا وقت آیا۔

عذرا ساحل کو قرآن شریف کے سائے میں رخصت کیا گیا۔ پھر اسے سجی سجائی گاڑی میں بٹھایا گیا۔ ساحل عمر آگے بیٹھا۔ عذرا کے ساتھ ناصر مرزا کی بیوی اور اماں کو بٹھایا گیا اور پھر تین چار گاڑیوں پر مشتمل یہ قافلہ ساحل عمر کے گھر کی طرف چل پڑا۔

گھر پہنچ کر رسمیں ادا کی گئیں۔ گھر میں ایک ہنگامہ تھا۔ ہر طرف قہقہے اور خوشیاں بکھری ہوئی تھیں۔ مسرت سے کھلے ہوئے چہرے...... ہر شخص اپنی اپنی بساط کے مطابق اس شادی کو انجوائے کر رہا

تھا۔ سب خوش تھے۔ اس شادی میں ہر شخص کو بہت مزہ آیا تھا۔

رات کے ایک بجے کے قریب ناصر مرزا اور مسعود اپنی اپنی فیملیوں کو لے کر نکلنے کی تیاری کر رہے تھے ادھر دلہن کو بھی تیار کیا جا رہا تھا۔ وہ زیور سے لدی ہوئی تھی اور پریشان تھی۔ اس نے اماں سے زیور اتارنے کو کہا۔ اماں اس کی پریشانی دیکھ کر اس کے پاس بیٹھ گئیں تو سب سے پہلے اس نے اپنا بایاں ہاتھ آگے کر کے کہا۔ ''اماں' سب سے پہلے اسے اتاریں' یہ میری انگلی میں چبھ رہی ہے۔''

''ہاں لاؤ...... اسے اتار دوں پتہ نہیں کیسی نیت سے دی ہے یہ انگوٹھی۔'' اماں نے جب ورشا کی دی ہوئی انگوٹھی اس کی انگلی سے نکالنا چاہی تو وہ نہیں اتری۔ وہ انگلی کی ہڈی پر اٹک رہی تھی۔

جب وہ زور لگانے کے باوجود نہ اتری تو اماں کریم لے آئیں۔ انہوں نے اس کی انگلی چکنی کر کے وہ انگوٹھی اتارنا چاہی لیکن وہ پھر بھی نہ اتری۔ وہ تنگ سے تنگ ہوتی جا رہی تھی۔

پھر اماں نے واش روم میں لے جا کر صابن لگا کر اس انگوٹھی کو اتارنے کی کوشش کی لیکن نتیجہ کچھ نہ نکلا۔

ابتداء میں تو یہ خیال تھا کہ انگوٹھی چھوٹی ہے اس لئے نہیں اتر رہی کسی چکنی چیز سے اتر آئے گی لیکن وہ انگوٹھی چھوٹی نہ تھی بلکہ انگلی نے پھولنا شروع کر دیا تھا۔ عذرا کی انگلی آہستہ آہستہ موٹی ہوتی جا رہی تھی۔ نتیجہ یہ تھا کہ سرسوں کے تیل سے لے کر صابن کے جھاگ تک ہر چیز استعمال کر لی تھی لیکن انگوٹھی تنگ سے تنگ ہوتی جا رہی تھی۔

اب انگلی اتنی پھول گئی تھی کہ انگوٹھی گوشت میں گھسنی شروع ہو گئی تھی۔ پھولتی انگلی میں شدت کی تکلیف تھی یوں محسوس ہوتا تھا کہ وہ انگوٹھی پھولتی ہوئی انگلی کا گوشت کاٹ کر اندر اتر جائے گی۔ تکلیف بڑھ گئی تھی کہ عذرا انگوٹھی چھونے کی صورت میں بھی کراہ اٹھتی تھی۔

ذرا سی دیر میں ہنستا بستا ماحول فکر میں ڈوب گیا تھا۔ انگلی کی سوجن بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ اب سارے کے سارے ساحل عمر کو لعن طعن کر رہے تھے کہ اس نے اس شیطان کی بچی کی انگوٹھی قبول ہی کیوں کی۔ وہ بے چارہ شرمندہ شرمندہ سا عذرا کو دیکھ رہا تھا۔

جب تکلیف شدت اختیار کر گئی تو ناصر مرزا نے کہا۔ ''ساحل' عذرا کو لے کر فوراً ہسپتال چلو' اس کے سوا کوئی چارہ نہیں۔''

رات کا ڈیڑھ بج رہا تھا۔ اس وقت کسی دولہا کا بیڈروم میں جانے کے بجائے کسی ہسپتال کے روم میں جانا اس کے ساتھ سنگین مذاق تھا لیکن اب کچھ نہیں ہو سکتا تھا' ہسپتال جائے بغیر اس تکلیف سے نجات ممکن نہ تھی۔ سو ساحل عمر کو ہسپتال کا رخ کرنا پڑا۔

ہسپتال کی ایمرجنسی میں موجود ڈاکٹر نے اس انوکھے کیس کو بڑی حیرت سے دیکھا۔ پھر اس نے بڑی احتیاط اور محنت سے اس انگوٹھی کو کاٹ کر انگلی سے نکال لیا۔

انگلی سے انگوٹھی نکلتے ہی عذرا کو قرار آ گیا اور گھر پہنچتے پہنچتے انگلی کی سوجن برائے نام رہ گئی۔ گھر پہنچ کر ساحل عمر نے اس انگوٹھی کو ڈسٹ بن میں پھینکنا چاہا تو ناصر مرزا نے اسے روک دیا۔

''کیا کرتے ہو؟''

"اس نحوست کو اس کی صحیح جگہ پر پھینک رہا ہوں۔" ساحل عمر نے غصے سے کہا۔

"ہر گز نہیں...... یہ انگوٹھی مجھے دو۔" یہ کہہ کر ناصر مرزا نے اس کے ہاتھ سے انگوٹھی لے کر اپنی جیب میں ڈال لی۔ ناصر مرزا کی بیوی نے ناصر مرزا کو گھور کر دیکھا مگر اس میں یہ ہمت نہ ہوئی کہ وہ شوہر کو اس منحوس انگوٹھی کو جیب میں رکھنے سے منع کر دے۔

☆......☆......☆

ساحل عمر کی صبح خاصی دیر سے ہوئی۔ مہمان سارے رات کو رخصت ہو چکے تھے۔ اس لئے صبح جلد اٹھنے کی فکر نہ تھی۔ اماں البتہ اپنے وقت پر اٹھ گئی تھیں۔ وہ مرجینا کے ساتھ کچن میں لگی ہوئی تھیں۔ مرجینا نے منع بھی کیا کہ وہ خود ناشتہ تیار کرے گی لیکن وہ نہیں مانیں۔ ناشتے کے ساتھ انہوں نے دوپہر کے کھانے کا بھی ڈول ڈال دیا۔ وہ جانتی تھیں کہ ساحل عمر کو کیا چیزیں پسند ہیں۔ وہ کھانے کس طرح کے پسند کرتا ہے' کتنا نمک اور کتنی مرچ اسے درکار ہوتی ہے۔ اس کے کھانے کا بندوبست وہ خود ہی بہتر طریقے پر کر سکتی تھیں۔

دن کے گیارہ بج رہے تھے۔ ساحل عمر کے کمرے کا دروازہ ابھی تک بند تھا۔ خاصا انتظار کر کے بالآخر اماں نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ دروازہ کھلنے میں دیر نہ لگی۔ دروازہ عذرا نے کھولا۔ ساحل عمر تو ابھی اوندھا پڑا ہوا بے خبر سو رہا تھا۔ اماں نے عذرا سے کہا۔ "اے دلہن' ساحل کو اٹھاؤ...... اب دوپہر ہونے کو آ گئی۔"

"اچھا اماں' اٹھاتی ہوں۔" عذرا نے سادگی سے کہا۔

"ہاں' دلہن جلدی اٹھاؤ...... ناشتہ ٹھنڈا ہو رہا ہے۔" یہ کہہ کر اماں نے پھر کچن کا رخ کر لیا۔

ساحل عمر کو اٹھتے اٹھتے پندرہ بیس منٹ لگ گئے۔ پھر وہ نہا دھو کر ڈائننگ ٹیبل پر آیا تو بارہ کا عمل تھا۔ دونوں نے مل کر ناشتہ کیا۔ ناشتہ کرتے ہوئے ساحل عمر کی نظر عذرا کے ہاتھ پر پڑی تو اسے ورشا کی دی ہوئی انگوٹھی یاد آ گئی۔ اس نے عذرا کا ہاتھ پکڑ کر اس انگلی کا معائنہ کیا جس نے یکا یک غبارے کی طرح پھولنا شروع کر دیا تھا۔ اب اس کی انگلی بالکل نارمل تھی۔ یہ احساس تک نہ ہوتا تھا کہ اس انگلی نے رات کو کس قدر پریشان کیا تھا۔

اسے ورشا پر بہت غصہ تھا۔ وہ جانے کس طرح کی انگوٹھی' کس نیت سے دے گئی تھی۔ یقیناً اس انگوٹھی پر کچھ پڑھ کر پھونکا گیا تھا۔ سحر کیا گیا تھا اور سحر کا نشانہ عذرا تھی۔

اس نے سوچا ذرا ورشا سے بات تو کر کے دیکھے۔ آخر وہ کیا سوچ کر عذرا کے لئے تحفہ لائی تھی۔ اس نے لاؤنج میں موجود فون کا ریسیور اٹھایا اور ورشا کے گھر کا نمبر ملانے لگا۔

"ہیلو۔" ادھر سے نسوانی آواز آئی۔

"کون؟ ورشا؟" ساحل عمر نے تصدیق چاہی۔

"نہیں برکھا بول رہی ہوں...... آپ کون؟" ادھر سے برکھا نے پوچھا۔

برکھا کی آواز سن کر ساحل عمر کا غصہ اور تیز ہو گیا۔ اس عورت نے اسے قتل کرنے کی پلاننگ مکمل کر لی تھی۔ وہ تو درمیان میں چڑ ڈبیل آ گیا ورنہ اس کی زندگی کا خاتمہ کب کا ہو چکا ہوتا۔ غصے

میں اس نے سوچا کہ ٹیلی فون بند کر دے۔ اتنے میں برکھا نے دوبارہ پوچھ لیا۔ ''کون ہو بھئی...... بولتے کیوں نہیں۔''

''میں ورشا سے بات کرنا چاہتا ہوں۔'' ساحل عمر نے بہت خشک لہجے میں کہا۔

''میں ورشا کو بلاتی ہوں...... آپ کون ہیں؟''

''میں ساحل عمر بات کر رہا ہوں۔'' اس نے غصیلے انداز میں کہا۔

''اوہ۔'' برکھا نے بڑے تمسخرانہ لہجے میں کہا۔ ''ہاں ساحل جی...... آپ نے ورشا سے کیا بات کرنی ہے۔''

''مجھے اس سے کچھ پوچھنا ہے۔''

''مجھ سے پوچھ لو ساحل جی...... وہ بچی ہے' وہ تمہیں کیا جواب دے گی۔ انگوٹھی سے متعلق تو کوئی سوال نہیں کرنا۔'' یہ کہہ کر وہ زور سے ہنسی۔ ''کیسا لگا میرا تحفہ۔''

''تمہارا تحفہ؟'' ساحل عمر نے حیرت سے کہا۔ ''وہ انگوٹھی تم نے بھیجی تھی۔''

''تم نے اتنی خاموشی سے شادی کر لی...... میں تمہیں تحفہ بھی نہ بھیجتی...... کہو رات کیسی گزری۔'' برکھا نے طنزاً پوچھا۔

''بہت اچھی۔'' ساحل عمر نے بہت خوش ہو کر کہا۔

''اچھا...... پھر ایسی ہی راتوں کے لئے تیار ہو جاؤ۔ اب تمہاری ہر رات ایسی ہی گزرے گی۔ میں تمہاری راتوں کا چین چھین لوں گی۔ تم نے مجھے دھوکا دیا۔ مجھے بہت نقصان پہنچایا ہے۔ اب تمہیں کسی کروٹ چین نہ آئے گا۔ تمہاری ہر سانس پر منہ سے آہ نکلے گی۔ میں تمہیں سسکا سسکا کر ماروں گی۔ تم مجھے نہیں جانتے کہ میں کتنی پراسرار قوتوں کی مالک ہوں۔ وہ تو منحوس چترو بھیل تجھے نکال لے گیا ورنہ تو اب تک پرلوک سدھار چکا ہوتا' چترو بھیل کا تو میں نے حساب کتاب کر دیا۔ اس کی روح کو آگ کی دیواروں میں چن دیا اب تیرا کریا کرم باقی ہے۔ میں تجھے کسی قیمت پر نہیں چھوڑوں گی' یاد رکھ۔'' برکھا نے غصے سے کہا۔

''اچھا ہوا...... میں نے یہ سب کچھ تیرے منہ سے سن لیا۔ تو کھل کر میرے سامنے آ گئی۔ اب تک میں دوسرے لوگوں کی زبانی تیرے عزائم کے بارے میں سنتا رہا ہوں۔ اب تو نے خود ہی سب اقرار کر لیا۔ اب تو میری بات سن اور غور سے سن...... تو اگر پراسرار قوتوں کی مالک ہے تو میں بھی لاوارث نہیں۔ میرے پیچھے بھی کچھ طاقتیں موجود ہیں۔ اب تیری میری کھلی جنگ ہے۔ اب تو نہیں یا میں نہیں۔'' ساحل عمر نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

''نادان لڑکے میں تیری اس بات پر صرف ہنس سکتی ہوں۔'' برکھا نے ہنستے ہوئے کہا۔

''یہ آنے والا کل بتائے کون کس پر ہنستا ہے۔'' ساحل عمر نے سخت لہجے میں کہا۔

''چل ٹھیک ہے۔ کل تو ابھی دور ہے تو آج کی رات میرا انتظار کر۔'' یہ کہہ کر برکھا نے ٹیلی فون بند کر دیا۔ ''اور دیکھ تماشا۔'' ٹیلی فون رکھ کر جب وہ پلٹی تو اسے دروازے پر دیکھ کر چونک گئی۔

☆......☆......☆

ورشا آہستہ آہستہ بڑے ڈرامائی انداز میں اس کی طرف بڑھی اور نزدیک پہنچ کر بولی۔ ''ممی کس کا فون تھا۔''

برکھا نے ایک نظر ورشا کو دیکھا۔ اس کا انداز اس کا لہجہ کچھ عجیب سا تھا جیسے اس نے برکھا کی کوئی چوری پکڑ لی ہو۔ کوئی اور وقت ہوتا تو وہ ورشا کے انداز پر اسے ضرور ڈانٹ دیتی لیکن یہ وقت ڈانٹنے کا نہ تھا۔ ورشا سے اس نے ابھی بہت کام لینا تھا۔ وہ اسے ڈانٹ کر ناراض کرنا نہیں چاہتی تھی۔

''تمہارے دوست کا فون تھا۔'' برکھا مسکرا کر بولی۔

میرا دوست۔'' ورشا نے حیرت سے اسے دیکھا۔ ''ممی میرا تو کوئی دوست نہیں۔''

''پھر یوں سمجھو...... میرے دشمن کا تھا۔ ورشا اس نے مجھے دھمکی دی ہے۔ اس نے کہا ہے کہ تو نہیں یا میں نہیں۔ ورشا اب چیونٹی کے پر نکل آئے ہیں...... تو جانتی ہے ناں...... جب چیونٹی کے پر نکل آتے ہیں تو کیا ہوتا ہے۔'' برکھا نے اسے گہری نظروں سے دیکھا۔

''ہاں جانتی ہوں...... اس کی موت نزدیک آ جاتی ہے۔'' ورشا نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

''بس ورشا سمجھ لو کہ ساحل عمر کی موت بھی زیادہ دور نہیں ہے۔''

''ممی آپ اسے مار دیں گی...... ساحل عمر کی جان لے لیں گی۔ محض اس لئے کہ اس نے شادی کر لی ہے۔ ممی شادی کرنا کیا گناہ ہے؟'' ورشا نے عجیب انداز اختیار کیا۔

''ارے!'' برکھا نے اسے غور سے دیکھا۔ ''یہ تو کیا بکواس کر رہی ہے۔''

''ہاں ممی...... میں واقعی بکواس کر رہی ہوں۔ ممی سچی بات میں ہمیشہ زہر بھرا ہوتا ہے۔'' یہ کہہ کر وہ برکھا کے کمرے میں رکی نہیں۔

برکھا اسے کہتی رہ گئی۔ ''ورشا...... ارے ورشا...... میری بات تو سنو۔''

اس کے جانے کے بعد وہ کھلے دروازے کو خالی نگاہوں سے دیکھتی رہی۔ اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ یہ ایک دم ورشا کو کیا ہوا اس کے موڈ میں یہ تبدیلی کیوں آئی۔ خیر وہ ورشا کو بعد میں دیکھ لے گی، سردست جو مسئلہ سامنے تھا اس سے نمٹنا تھا۔ وہ ساحل عمر کو آج رات تماشا دکھانے کا کہہ چکی تھی۔ فی الحال تو اس سلسلے میں کچھ کرنا تھا۔

کچھ سوچ کر اس نے اپنے کمرے کا دراوازہ بند کیا اور پھر بیڈ پر بیٹھ کر فون کا نمبر ملانے لگی۔ دوسری گھنٹی پر ادھر سے ٹیلی فون اٹھا لیا گیا۔

''واسم۔'' برکھا نے اس کی آواز پہچان کر کہا۔

''جی برکھا جی۔'' واسم ہمیشہ کی طرح فرماں برداری سے بولا۔ ''کیا حکم ہے۔''

''مجھے آج ڈھائی بجے سے پہلے بکرے کا سر چاہئے۔'' برکھا نے حکم سنایا۔ عجیب حکم تھا۔

''اس وقت کیا بجا ہے۔'' واسم نے اپنی گھڑی پر نظر ڈالی۔

''فون بجا ہے۔'' برکھا نے اسے بتایا۔
''ٹھیک ہے۔ برکھا جی' میں فوراً ہی نکلتا ہوں۔ ڈھائی بجے تک بلکہ اس سے پہلے آپ کے پاس ہوں گا۔''
''اور سنو۔'' برکھا نے کہا۔
''جی برکھا جی۔'' وہ بولا۔
''بکرے کا سر بالکل کالا ہو۔'' برکھا نے اسے ہدایت کی۔
''برکھا جی...... اگر مارکیٹ میں کالے بکرے کی سری نہ ملی تب......؟'' اس نے سوال کیا۔
''تب تم ایسا کرنا کہ ایک کالا بکرا خرید لانا...... یہاں اس بکرے کا سر اتار لیں گے۔ ایسی صورت میں تم تین بجے تک پہنچ جانا...... اس سے زیادہ دیر نہ ہو۔ پھر عمل کا وقت نہیں رہے گا۔'' برکھا نے اسے سمجھایا۔
''بس آپ بے فکر ہو جائیں۔ آپ کا کام وقت سے پہلے ہو جائے گا۔''
''واسم تم ایسا کرو کہ مارکیٹ کے چکر میں مت پڑو۔ سیدھے بکرا منڈی جاؤ۔ وہاں سے ایک کالا بکرا خریدو بے شک پورا بکرا کالا نہ ہو لیکن اس کا سر ضرور کالا ہو اور اسے لے کر بنگلے پر آ جاؤ' میں تمہیں آج ایک اور جادو سکھا دوں گی۔'' برکھا نے اس پر مہربان ہوتے ہوئے کہا۔
''برکھا جی...... زندہ باد۔'' یہ سن کر واسم خوش ہو گیا۔ اس نے خوشی سے نعرہ لگایا اور پھر یہ کہہ کر فون بند کر دیا۔ ''اچھا برکھا جی آپ میرا انتظار کریں۔ میں آتا ہوں۔''
برکھا نے اس کے فون رکھنے کے بعد خود بھی ریسیور رکھ دیا اور مسکرانے لگی۔ واسم بہت کام کا بندہ تھا۔ اس نے آج تک حکم عدولی نہیں کی تھی۔ اس نے جو کام بھی اور جب بھی بتایا تھا' حتی المقدور پورا کرنے کی کوشش کی تھی۔ اگر اس نے اسے رات کے دو بجے بھی فون کر دیا ہے تو وہ کسی معمول کی طرح اس کے بنگلے پر حاضر ہو جاتا تھا۔
برکھا جب بھی خوش ہوتی اسے کوئی عمل سکھا دیتی۔ وہ اس سحر کے ذریعے لوگوں سے پیسے بٹورتا اور انسانوں کو دکھ پہنچاتا۔ کالا علم ہوتا ہی کسی کو دکھ پہنچانے کے لئے ہے۔
واسم حکم کے مطابق ایک کالا بکرا خرید کر اس کے بنگلے پر مقررہ وقت سے پہلے پہنچ گیا۔ اس وقت ڈھائی بجے کا عمل تھا۔ اس وقت برکھا اپنے عمل کے کمرے میں تھی۔ وہ وہاں بیٹھی ہوئی منتروں کا جاپ کر رہی تھی۔ اس نے ورشا سے کہہ دیا تھا کہ واسم آئے تو اسے وہ عمل کے کمرے میں پہنچا دے۔
واسم کے بیل دینے پر ورشا نے گیٹ کھولا' وہ گاڑی میں تھا۔ ورشا ایک طرف ہوئی تو وہ گاڑی اندر لے آیا' ورشا جب گیٹ بند کر کے واپس پلٹی تو واسم گاڑی کی ڈگی سے کالا بکرا نکال رہا تھا۔ جب ورشا اس کے نزدیک پہنچی تو واسم نے پوچھا۔ ''برکھا جی کہاں ہیں؟''
''وہ جاپ والے کمرے میں ہیں۔ تم وہیں چلے جاؤ۔'' ورشا نے کہا اور وہ اپنے کمرے کی طرف چل دی۔
واسم نے کالے بکرے کا بڑا سا کان پکڑا اور اسے بیدردی سے گھسیٹتا ہوا منتر والے کمرے

کی طرف بڑھا۔ بکرا بری طرح چیخ رہا تھا۔
جاپ والا دروازہ کھلا ہوا تھا لیکن اندر مکمل اندھیرا تھا کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ واسم دروازے پر کھڑے ہو کر برکھا کے حکم کا انتظار کرنے لگا۔

"واسم اندر آ جاؤ۔" برکھا کی اندر سے آواز آئی۔

"برکھا جی کیا بکرے کو بھی اندر لے آؤں۔"

"اچھاہاں...... یاد آیا تمہیں بھی تو سحر سکھانا ہے۔ یوں کرو اس بکرے کو بنگلے کے پیچھے لے کر چلو میں چھری لے کر آتی ہوں۔"

"جی اچھا۔" یہ کہہ کر واسم نے بکرے کا بڑا سا کان جو ابھی تک اس کے ہاتھ میں تھا' اسے کھینچتا ہوا آگے بڑھا اور پھر وہ گھوم کر بنگلے کے پیچھے چلا گیا۔

اس کے پیچھے پیچھے برکھا بھی پہنچ گئی۔ اس نے پیلی ساڑھی اور بغیر آستین کا بلاؤزر پہن رکھا تھا۔ ساڑھی کا پلو بھی اس نے کمر میں اڑسا ہوا تھا۔ وہ ایک ڈھلتی عمر کی عورت تھی۔ اس کے باوجود اس میں اب تک کشش موجود تھی۔ واسم نے اسے ایک نظر دیکھا اور پھر نظریں گھما لیں۔

برکھا نے ایک جگہ منتخب کر کے واسم کو بکرا پچھاڑنے کو کہا۔ واسم نے اس کی دو ٹانگیں پکڑ کر اسے الٹا دیا اور پھر اس پر اس طرح چڑھ کر بیٹھ گیا کہ وہ ہل بھی نہ سکے۔ برکھا نے اس کے ہاتھ میں ایک تیز چھری دی اور ساتھ ہی ایک چینی کا پیالہ بڑھایا۔ پھر اس نے واسم کو بتایا کہ کیا کرنا اور کس طرح کرنا ہے۔

برکھا کی ہدایت کی مطابق اس نے پیالے کو اس طرح بکرے کی گردن کے نیچے رکھا کہ پہلے خون کے قطرے پیالے میں گریں۔ یہاں تک کہ پیالہ بھر جائے۔

واسم نے بکرے کو قابو میں لے کر تیز چھری' منتر پڑھتے ہوئے بہت تیزی سے اس کی گردن پر پھیری۔ سرخ خون ایک فوارے کی صورت اس کی گردن سے نکلا۔ چند لمحوں میں پیالہ بھر گیا۔ بھرا ہوا پیالہ برکھا نے اس کی گردن کے نیچے سے نکال لیا۔ اتنے میں واسم نے بکرے کی گردن اس کے تن سے جدا کر دی اور اس کا تڑپتا ہوا جسم کسی کھلونے کی طرح دور پھینک دیا۔ بکرے کی جان ابھی پوری طرح نہیں نکلی تھی۔ اس کی گردن سے تیزی سے خون بہہ رہا تھا اور جسم بری طرح تڑپ رہا تھا۔

"آؤ واسم ادھر آ کر بیٹھو۔" برکھا خون بھرا پیالہ لئے کھڑی تھی۔ واسم اسکے سامنے زمین پر بے تکلفی سے بیٹھ گیا اور گردن اٹھا کر برکھا کی جانب دیکھنے لگا۔

"تمہیں جو بتایا ہے' وہ پڑھو اور اپنے دونوں ہاتھ آگے پھیلا کر ملا لو۔" برکھا نے ہدایت کی۔

واسم نے اپنے دونوں ہاتھ کچھ پڑھتے ہوئے پھیلا کر ملا لئے۔ تب برکھا نے خون کا پیالہ اس کے ہاتھوں پر آہستہ آہستہ انڈیلنا شروع کیا جیسے ہی خون کی دھار اس کے ہاتھوں پر گری۔ چھن چھن کی آوازیں آنے لگیں۔ اس کا ہاتھ چاندی کے کھنکناتے روپوں سے بھر گئے۔

"کہو واسم۔" برکھا نے اس کی طرف مسکرا کر دیکھا۔

"برکھا جی' جواب نہیں۔" واسم نے تعریف کی۔

پھر برکھا نے وہ پیالہ زمین پر رکھ دیا اور واسم سے کہا۔ ''اب یہ روپے پیالے میں ڈالنا شروع کرو۔''

واسم نے اپنے ہاتھ تھوڑے سے نیچے کر کے روپے پیالے میں پھینکنا شروع کئے۔ جیسے جیسے روپے پیالے میں گرتے جا رہے تھے پیالہ خون سے بھرتا جا رہا تھا۔ یہاں تک کہ آخری روپیہ بھی خون میں تبدیل ہو گیا۔

اب برکھا نے پھر فخریہ انداز میں واسم کو دیکھا۔ ''کہو واسم۔''

''برکھا جی آپ جادو کی دیوی ہیں۔ آپ کا کوئی توڑ نہیں۔''

''شعبدہ لوگوں کو بے وقوف بنانے کے لئے کافی ہے؟'' اس نے ہنس کر سوال کیا۔

''بہت کافی ہے۔'' واسم خوش ہو کر بولا۔ ''جب میں لوگوں کو یہ جادو دکھاؤں گا تو وہ میرے پاؤں پکڑ لیں گے۔ پھر میں ان حیرت زدہ لوگوں سے جو چاہوں گا کروا لوں گا۔''

''چلو اب تم جاؤ...... میں اب اپنا کام شروع کروں گی۔'' برکھا نے ایک دم اپنے تیور بدل لئے۔

''جو حکم برکھا جی۔'' واسم نے بڑی فرمانبرداری سے سر جھکایا اور واپس جانے کے لئے مڑ گیا۔

برکھا نے بکرے کی سری اٹھا کر اپنے منتر والے کمرے میں رکھی اور پھر گیٹ کی طرف چل دی۔ جب وہ گیٹ کے نزدیک پہنچی تو واسم گاڑی نکال چکا تھا۔ اس نے گاڑی میں بیٹھے بیٹھے برکھا کو سلام کیا اور پھر تیزی سے گاڑی نکال لے گیا۔ برکھا گیٹ بند کر کے واپس منتر والے کمرے کے سامنے پہنچی۔ اس نے اندر جانے سے پہلے ساڑھی اور بلاؤز اتار کر دروازے کی دہلیز پر پھینکا اور دروازہ کھلا چھوڑ کر اندر چلی گئی۔ پھر اس نے فرش پر رکھی ہوئی بکرے کی سری اپنے دونوں ہاتھوں میں اٹھالی اور کمرے میں چکر لگاتے ہوئے زور زور سے منتر پڑھنے لگی۔

☆......☆......☆

ناصر مرزا دوپہر کو ساحل عمر کے گھر پہنچا۔ وہ انگوٹھی ابھی تک اس کی جیب میں پڑی ہوئی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ وہ کچھ دیر گپ شپ لگا کر حافظ موسیٰ کی طرف نکل جائے گا۔ ان سے اس انگوٹھی کے بارے میں دریافت کرے گا۔ اگر اس انگوٹھی پر جادو کیا گیا ہے تو یہ بات کھل کر سامنے آجائے گی۔ دوسرے حافظ موسیٰ کے علم میں یہ بات آجائے گی کہ برکھا نے چھیڑ چھاڑ شروع کر دی ہے۔ اس کے ان شعبدوں سے نمٹنا ہو گا۔

ساحل عمر نے اپنی روداد سنائی۔ اس نے بتایا کہ برکھا سے اس کی کیا بات ہوئی۔ ناصر مرزا نے ساحل عمر کی گفتگو توجہ سے سنی۔

برکھا اب کھل کر سامنے آ گئی تھی۔ اس نے اپنے عزائم کا بھرپور اظہار کر دیا تھا اور ساتھ میں یہ بھی انکشاف کر دیا تھا کہ وہ انگوٹھی اس کی بھجوائی ہوئی تھی اور وہ کوئی سادہ انگوٹھی نہ تھی۔ اس پر باقاعدہ عمل کیا گیا تھا۔

ساری روداد سن کر ناصر مرزا نے کہا۔ ''پھر اب کیا چھپا رہ گیا۔ اس نے تو انگوٹھی کے بارے میں بتا دیا کہ وہ اس نے پڑھ کر بھیجی تھی۔ میرا خیال تھا کہ حافظ صاحب کو جا کر دکھاؤں گا' اب دکھانے کا کیا فائدہ۔''

ناصر مرزا نے اپنی جیب سے وہ انگوٹھی نکالی اور سامنے میز پر رکھی ایش ٹرے میں اچھال دی۔

''حافظ موسیٰ کو اس کی دھمکی کے بارے میں تو بتانا چاہئے۔ کیا خیال ہے تمہارے ساتھ کسی دن میں بھی نہ چلوں۔''

''ہاں چلو...... وہ تو تمہیں ایک عرصے سے بلا رہے ہیں۔ نکاح والے دن بھی بلاوہ دے کر گئے ہیں۔ کب چلو گے؟''

''ایک دو روز میں چلنے کا پروگرام بناتے ہیں۔'' ساحل عمر نہ کچھ سوچ کر کہا۔

''اچھا ٹھیک ہے۔ پھر میں چلتا ہوں۔ آج ذرا دفتر کا چکر لگا لوں۔ کئی دن سے دفتر کی صورت نہیں دیکھی۔'' ناصر مرزا اٹھتا ہوا بولا۔

اس سے پہلے کہ ساحل عمر اسے جانے سے روکتا' اماں ڈرائنگ روم میں داخل ہوئیں۔ انہوں نے ناصر مرزا کی بات سن لی تھی۔ وہ فوراً بولیں۔ ''لو اب کھانا نکلنے والا ہے تو تم جا رہے ہو۔ اب کھانا کھا کر جانا۔ آؤ' میں تم دونوں کو بلانے آئی تھی۔''

''اچھا اماں۔'' ناصر مرزا نے ہنس کر کہا۔ ''آپ کا کہا بھلا کون ٹال سکتا ہے۔''

''جیتے رہو بیٹا...... اللہ تمہاری عمر دراز کرے۔'' اماں نے خوش ہو کر دعا دی۔

''تمہاری چاند سی دلہن آئے۔'' ساحل عمر نے اٹھتے ہوئے ٹکڑا لگایا۔

''اللہ نہ کرے۔'' اماں نے ساحل عمر کو گھور کر دیکھا۔ ''ناصر مرزا کی بہو کسی چاند سے کم ہے کیا؟''

''ہاں اماں چاند تو ہے لیکن گرہن لگا۔'' ناصر مرزا نے ہنس کر کہا۔

''چلو ہٹو...... اتنی پیاری تو ہے۔'' اماں نے ڈانٹتے ہوئے کہا۔

پھر وہ تینوں ڈرائنگ روم سے نکل گئے۔

☆......☆......☆

ورشا کے دل پر ایک بے نام سی اداسی چھائی تھی۔ اس کا کسی کام میں دل نہیں لگ رہا تھا۔ شعری مجموعہ پڑھتے پڑھتے اس نے سائیڈ ٹیبل پر رکھا اور بیڈ سے کھڑی ہو گئی۔ پھر وہ آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر اپنا چہرہ دیکھنے لگی۔ چہرہ دیکھ کر اندازہ ہوا کہ آج اس نے اپنے بال بھی نہیں باندھے تھے۔ منہ بھی ایسا ہی چلتا پھرتا دھویا تھا۔ آج اس نے کپڑے بھی تبدیل نہیں کئے۔ کپڑے شکن آلود تھے۔ وہ آئینے میں اپنا سراپا دیکھ کر مسکرائی تو اس نے محسوس کیا کہ اس کی مسکراہٹ میں جان نہیں۔ مسکراہٹ بڑی پھیکی اور اداس سی ہے۔ وہ ایک مرتبہ پھر مسکرائی اور اپنی مسکراہٹ میں جان ڈالنے کی کوشش کی لیکن وہ ناکام رہی' اس کی مسکراہٹ مزید پھیکی' مزید بے جان ہو گئی۔

تب وہ آئینے والی ورشا سے مخاطب ہوئی۔ ''ورشا میری جان' تجھے کیا ہو گیا؟''

ورشا کو اپنی ہی آواز بڑی اجنبی محسوس ہوئی۔ ”آئینے کے باہر والی ورشا نے آئینے کے اندر والی ورشا کو غور سے دیکھا۔ دونوں کی آنکھیں ملیں۔ دونوں نے ایک دوسرے کو پہچاننے کی کوشش کی۔ پھر آئینے والی ورشا آپ ہی آپ بولنے لگی۔ ”میں کیاں جانوں‘ مجھے کیا ہو گیا ہے۔ اتنا ضرور جانتی ہوں کچھ ہو ضرور گیا ہے۔ میرے اندر جیسے کوئی چیز ٹوٹ گئی ہے۔ میں خالی خالی سی ہو گئی ہوں۔ یوں لگتا ہے جیسے میرا کچھ گم ہو گیا ہے۔ کیا گم ہو گیا ہے‘ یہ خود مجھے بھی معلوم نہیں۔ کبھی تو میں بیٹھے بیٹھے گم ہو جاتی ہوں‘ کھو جاتی ہوں۔ ہوش آتا ہے تو کافی دیر تک یہی نہیں معلوم ہوتا میں کہاں ہوں۔ ورشا یہ مجھے کیا ہو گیا ہے۔ مجھے کیا غم لگ گیا ہے۔ کوئی غم ضرور ہے۔ جو اندر ہی اندر میری روح کو کھا رہا ہے۔ مجھے کیا غم ہے۔ یہ جب میں اپنے آپ سے پوچھتی ہوں تو کوئی جواب نہیں ملتا۔

کون جواب دے گا۔ کس سے پوچھوں۔ یہاں تو کوئی ہم راز بھی نہیں۔ ایک ماں ہے‘ اسے اپنے دھندوں سے فرصت نہیں‘ وہ پراسرار طاقتوں کے چکر میں پڑی ہے۔ پتہ نہیں کیا بننا چاہتی ہے۔ طاقت کی خواہش‘ اقتدار کی ہوس جانے اسے کہاں لے جائے گی۔

آج اس نے ایک نیا چکر چلایا ہوا ہے۔ وہ واسم بکرا جانے کیوں لایا تھا۔ باہر نکل کر دیکھوں تو آخر کیا ہو رہا ہے۔ یہ سوچ کر اس نے سامنے والی ورشا پر نظر ڈالی اور پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔ ”اچھا‘ میری جان ہم چلتے ہیں تم خوش رہنے کی کوشش کرو۔“

پھر وہ آئینے کے سامنے سے ہٹی اور سوچتی ہوئی اپنے کمرے سے باہر نکل آئی۔ یہ اس کی کیا حالت ہو گئی ہے۔

آئینے سے باتیں کرنے لگی ہے۔ کیا جانتی نہیں کہ آئینہ کبھی جھوٹ نہیں بولتا۔ کہیں وہ پاگل تو نہیں ہونے لگی۔

وہ اپنے کمرے سے باہر نکلی تو شام ہو رہی تھی۔ اس بنگلے پر پہلے کیا کم اداسی کے ڈیرے تھے کہ سردیوں کی اداس شاموں نے اس پر مزید ویرانی کی چادر ڈال دی تھی۔

ایک کمرہ چھوڑ کر برکھا کا کمرہ تھا۔ اس کا دروازہ کھلا تھا۔ اس نے چلتے ہوئے برکھا کے بیڈ پر نظر ڈالی۔ بیڈ خالی تھا۔ پھر اس نے رک کر کمرے میں جھانکا۔ کمرہ بھی خالی تھا۔ ورشا گھومتی ہوئی پھر برکھا کے عمل والے کمرے کے سامنے پہنچ گئی۔

اس نے دروازے پر برکھا جی کی ساڑھی دیکھی تو اسے بڑی حیرت ہوئی‘ پھر برکھا جو زور زور سے منتر پڑھتی ہوئی کمرے کے چکر کاٹ رہی تھی‘ دروازے کے نزدیک سے گزری تو ورشا اس کو ایک نظر دیکھتے ہی خوف سے پیچھے ہٹ گئی۔ اس کے ہاتھوں میں بکرے کا سر تھا اور وہ کپڑوں سے بے نیاز کچھ اس طرح اپنے عمل میں مصروف تھی کہ اچھے بھلے دل گردے کا آدمی اسے اس حالت میں دیکھ لیتا تو خوف کے مارے بے ہوش ہو جاتا۔ اس سے پہلے کہ برکھا دوبارہ چکر کاٹ کر دروازے کے سامنے سے گزرتی وہ‘ فوراً وہاں سے ہٹ آئی۔ بنگلے کے اندر گاڑی نہ تھی اس کا مطلب ہے کہ واسم جا چکا ہے پھر وہ گھومتی ہوئی بنگلے کے پیچھے پہنچی وہاں اس نے سر کٹا بکرے کا دھڑ ریت میں اٹا دیکھا۔ ایک جگہ ریت پر خون پڑا ہوا تھا جو اب جم کر کالا ہو گیا تھا۔

اس کے دل پر پہلے ہی وحشت برس رہی تھی۔ اس طرح کے منظر دیکھ کر اسے ابکائیاں آنے لگیں۔

☆......☆......☆

شام ڈھل رہی تھی۔

اندھیرا پھیلنے کو تھا۔ اس گھر پر یہ شام کسی اور انداز میں اتری تھی۔ یہاں اداسی نہ تھی۔ ہر طرف قہقہے بکھرے ہوئے تھے۔ ایک سرخوشی تھی' جوش تھا۔

مسعود آفاقی اپنی فیملی کے ساتھ آیا ہوا تھا۔ مسعود آفاقی کی بیوی ایک ہنسوڑ عورت تھی۔ بات بات پر ہنسنا' قہقہے لگانا' نت نئے چٹکلے چھوڑنا' بات سے بات پیدا کرنا' یہ اس عورت کا کمال تھا۔ وہ جس محفل میں ہوتی' وہاں سے خاموشی اور اداسی اپنے اپنے بستر گول کر جاتیں۔

مسعود آفاقی کی بیوی صائمہ' عذرا کو لطیفے سنا سنا کر بے حال کر رہی تھی۔ اس کی گفتگو سے سبھی محظوظ ہو رہے تھے کہ اچانک محفل کا رنگ بدل گیا۔

سب لاؤنج میں بیٹھے تھے۔ جس کو جو جگہ پسند تھی' وہ وہاں بیٹھا تھا۔ ساحل عمر صوفے سے ٹیک لگائے قالین پر پاؤں پھیلائے بیٹھا تھا۔ عذرا اور صائمہ ایک صوفے پر بیٹھی تھیں۔ مسعود آفاقی' ساحل عمر کے سامنے مگر کچھ فاصلے سے گاؤ تکیہ لگائے نیم دراز تھا۔ اماں واش روم میں تھیں اور مرجینا کچن میں۔

صائمہ کے کسی لطیفے پر سب لوگ لوٹ پوٹ ہو رہے تھے کہ وہ ایک دم کہیں سے آ کر اس کی ٹانگ پر گرا۔ ساحل عمر نے گھبرا کر اپنی ٹانگیں سکیڑ لیں' وہ کوئی ایک کلو وزن کا گوشت کا ٹکڑا تھا۔ بالکل تازہ گوشت تھا۔

صائمہ اور عذرا کی گوشت کے ٹکڑے پر نظر پڑی تو وہ دونوں ایک دم چیخ اٹھیں۔ مسعود آفاقی پریشان ہو کر سیدھا ہو کر بیٹھ گیا اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھنے لگا۔

"ساحل یہ کیا ہے؟"

ساحل کی خود اپنی سٹی گم تھی۔ وہ کیا بتاتا کہ کیا ہے؟ وہ حیران ہو کر اس گوشت کے ٹکڑے کو دیکھ رہا تھا کہ وہ آخر آیا کہاں سے؟

یہ گوشت کا ٹکڑا آیا کہاں سے کس نے پھینکا؟ یہ سوالات تو اپنی جگہ اہم تھے اور توجہ طلب...... لیکن اس گوشت کے ٹکڑے کے گرتے ہی ساحل عمر کی ٹانگوں میں جو درد شروع ہوا اس نے سوالات کو پس پشت ڈال دیا۔

اس کی دونوں ٹانگوں میں اچانک اس قدر شدید تکلیف شروع ہوئی کہ وہ بے حال ہو گیا۔ وہ اپنی دونوں ٹانگوں کو دھاڑ دھاڑ قالین پر مار رہا تھا۔ اس کے چہرے پر شدید کرب کے آثار تھے۔

اماں واش روم سے وضو کر کے لاؤنج میں آئیں تو انہوں نے یہاں کا نقشہ ہی بدلا ہوا دیکھا۔ ہر ایک کے چہرے پر خوف منڈلا رہا تھا۔

"کیا ہوا بھئی...... یہ سب کو سانپ کیوں سونگھ گیا۔" اماں نے پوچھا۔

"اماں' یہ!" مسعود آفاقی نے اس گوشت کے ٹکڑے کی طرف اشارہ کیا۔

"یہ کیا ہے؟" اماں جلدی سے آگے بڑھیں۔ انہوں نے جھک کر اس گوشت کا معائنہ کیا۔

"میرے خدایا' یہ کہاں سے آیا...... اے اللہ تو رحم فرما۔"

"اماں کچھ پتہ نہیں' یہ کہاں سے آیا۔ بس اچانک کہیں سے گرا اور اس کے گرتے ہی ساحل کی ٹانگوں میں درد شروع ہو گیا۔"

"ہیں۔" اماں اب صحیح معنی میں پریشان ہوئیں۔ انہوں نے گھبرا کر ساحل عمر کو دیکھا جو اماں کو دیکھ کر اپنا درد ضبط کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھوں سے ایک ٹانگ پکڑی ہوئی تھی۔ کبھی وہ ایک ٹانگ پکڑتا اور کبھی دوسری...... پھر وہ زور زور سے اپنی دونوں ٹانگیں قالین پر مارنا شروع کر دیتا۔

"اے اللہ...... میرے بچے کو کیا ہوا؟" انہوں نے اس کے نزدیک بیٹھ کر فوراً اس کی ایک ٹانگ پکڑی اور جلدی جلدی کچھ پڑھ کر اس پر پھونکا۔ اس پھونک مارنے سے درد کچھ کم ہوا لیکن صرف چند لمحوں کے لئے۔ اس کے بعد پھر وہ وہیں پہنچ گیا۔

اماں نے آواز دے کر مرجینا سے اس گوشت کے ٹکڑے کو اٹھانے کو کہا۔ اس نے اس گوشت کے ٹکڑے کو دیکھا تو وہ بھی پریشان ہو گئی۔ پھر وہ کچھ اس طرح خوفزدہ ہو گئی کہ اس ٹکڑے کو اٹھانے کی ہمت نہ رہی۔ تب اماں نے اس کے ہاتھ سے شاپر لے کر وہ گوشت کا ٹکڑا اس میں ڈالا اور پھر مرجینا سے بولیں۔ "اسے کوڑے کے ڈبے کے پاس ڈال دو۔" پھر فوراً ہی بولیں۔ "نہیں اسے گھر کے باہر پھینک آؤ۔"

"جی اچھا اماں جی۔" مرجینا نے ڈرتے ڈرتے وہ شاپر ان کے ہاتھ سے لے لیا اور پھر لاؤنج سے باہر چلی گئی۔

ساحل عمر کی تکلیف کم نہیں ہو رہی تھی۔

وہ اب قالین پر ہی لیٹ گیا تھا۔ اس کے ہاتھوں کی مٹھیاں سختی سے بند تھیں۔ کبھی وہ آنکھیں کھولتا کبھی بند کر لیتا تھا کبھی وہ اپنی دونوں ٹانگیں سکیڑ لیتا تھا اور کبھی ایک دم پھیلا کر چیخنے لگتا تھا۔

"ساحل میرے بچے کیا ہو رہا ہے؟" اماں روہانسی ہو رہی تھیں۔

"اماں' مجھے یوں لگ رہا ہے جیسے کوئی میری پنڈلیوں کی رگیں کسی چاقو سے کاٹ رہا ہو۔" ساحل عمر نے رک رک کر بتایا۔

"مسعود' جلدی سے ناصر کو فون کرو...... اس فوراً بلاؤ۔" اماں نے بے تاب ہو کر کہا۔

"جی اچھا اماں۔" مسعود آفاقی فوراً اٹھ کر ٹیلی فون کے نزدیک پہنچا۔ اس نے پہلے گھر ملایا لیکن وہ گھر پر نہیں تھا۔ وہ ابھی آفس سے واپس نہیں آیا۔ تب اس نے اس کے دفتر فون کیا۔ وہ دفتر سے نکلنے ہی والا تھا کہ مسعود آفاقی کا فون آ گیا۔

"کیا ہوا مسعود خیر تو ہے۔؟" اس نے فکر مند ہو کر پوچھا۔

"بھائی تم جلدی ادھر آ جاؤ ساحل کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ کہیں سے اچانک گوشت کا ٹکڑا آ کر گرا اور پھر اس کی ٹانگوں میں شدید درد شروع ہو گیا یار وہ تڑپ رہا ہے۔ تم جانتے ہو کہ چھوٹی موٹی تکلیفوں کو تو وہ گردانتا ہی نہیں۔ یہ تکلیف اتنی زیادہ ہے کہ باوجود ضبط کے اس کے منہ سے چیخیں نکل رہی ہیں۔" مسعود آفاقی نے جلدی جلدی ساری بات بتا دی۔

"میں فوراً آ رہا ہوں۔ یہ سب اس کتے کی بچی کی کارروائی ہے۔" یہ کہہ کر ناصر مرزا نے ریسیور رکھ دیا اور غصے میں کھولتا ہوا اپنے دفتر سے باہر نکل آیا۔

گاڑی میں بیٹھ کر اس نے ساحل عمر کے گھر کا رخ کیا۔ وہ غصے سے پیچ و تاب کھا رہا تھا۔ اس منحوس عورت نے ساحل کی زندگی اجیرن کر دی تھی۔ یہ اس کا تیسرا حملہ تھا۔ پہلے اس نے اسے اغواء کیا' اس کے بعد اس نے انگوٹھی بھیجی اور اب یہ سفلی کا عمل کر دیا۔ اس عورت کی جرات روز بروز بڑھتی جا رہی تھی۔ عابد منجم کا خون اس کی گردن پر تھا۔ اس کی بھتیجی کے قتل کی ذمہ دار وہ تھی۔ اس کے علاوہ نہ جانے کتنے معصوم لوگوں کی زندگی تباہ کی ہو گی اس شیطان کی بچی نے۔

اسے روکنے والا کوئی نہ تھا۔ وہ کھلے بندوں دھمکیاں دے رہی تھی اور بے خوف کارروائیاں کر رہی تھی۔ اب اس کا کوئی بندوبست کرنا ہی پڑے گا۔ اتنے جرائم کے بعد تو وہ سزا کی مستحق ہو گئی تھی۔ اس کا قتل واجب ہو گیا تھا۔

انہی خیالات میں غلطاں وہ ساحل عمر کے گھر پہنچ گیا۔ گاڑی دیوار کے سائے میں کھڑی کر کے اس نے بیل دی۔ جلدی ہی گیٹ کھل گیا۔ گیٹ پر مسعود آفاقی تھا۔

"اب کیا حال ہے؟" ناصر مرزا نے تیز تیز گھر کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔

"اس کی بہت بری حالت ہے۔ درد سے تڑپ رہا ہے۔ اتنا سا چہرہ نکل آیا ہے۔ برسوں کا مریض لگ رہا ہے۔" مسعود آفاقی نے اسے بتایا۔

ناصر مرزا لاؤنج میں داخل ہوا تو اسے ایسا لگا جیسے وہ کسی کے سوم میں آ گیا ہو۔ ہر طرف خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ چہرے فکر مند تھے۔ ساحل عمر اپنی ٹانگیں اٹھا اٹھا کر قالین پر مار رہا تھا۔

"کیا ہوا ساحل؟" ناصر مرزا نے قالین پر بیٹھ کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"پتہ نہیں۔" وہ بڑی مشکل سے بولا۔ اس کی آنکھوں میں نمی تھی۔

"پریشان مت ہو...... ٹھیک ہو جاؤ گے۔" پھر اس نے مرجینا سے کہا۔ "ایک گہری پلیٹ میں پانی لے کر آؤ۔"

مرجینا بھاگ کر پلیٹ میں پانی لے آئی اور ناصر مرزا کے سامنے رکھ دیا۔

ناصر مرزا نے اپنی جیب سے چاقو نکالا' اسے کھول کر چاقو کی نوک اپنے ہونٹوں کے نزدیک کر لی اور کچھ پڑھنے لگا۔

چند لمحے پڑھنے کے بعد اس نے چاقو کی نوک پر ایک پھونک ماری اور پھر چاقو کی نوک

سے پلیٹ میں ضرب کا نشان بنایا۔ اس کے بعد پھر اس نے چاقو کی نوک پر کچھ پڑھا اور پلیٹ میں ضرب کا نشان بنایا۔ اس طرح اس نے تین مرتبہ کیا۔ اس کے بعد اس نے چاقو جیب میں رکھ لیا اور پلیٹ اٹھا کر سیدھے ہاتھ میں پانی لے کر اس نے اس کی پوری ٹانگ پر پانی کے چھینٹے مارے۔ پانی کے چھینٹے مارتے ہی اس کی ٹانگ میں تکلیف ایک دم کم ہو گئی۔ ناصر مرزا نے باری باری دونوں ٹانگوں پر چھینٹے مارے یہاں تک کہ پانی ختم ہو گیا۔ اس عمل سے اتنا ہوا کہ ساحل عمر اٹھ کر بیٹھ گیا۔ ٹانگوں کا درد بالکل تو ختم نہیں ہوا تھا لیکن قابل برداشت تھا۔ ساحل عمر نے اپنے دونوں ہاتھ منہ پر پھیرے۔ اس کا چہرہ ایک دم زرد ہو گیا تھا۔

''ناصر یہ سب کیا ہے؟'' ساحل عمر نے حیران ہو کر پوچھا۔

''برکھا کی دھمکی بھول گئے۔ اس نے تماشا دکھانے کو کہا تھا...... دکھا دیا تماشا۔''

''اچھا' یہ اس کی کارروائی ہے؟''

''سو فی صد۔'' ناصر مرزا نے بڑے یقین سے کہا۔ ''وہ گوشت کا ٹکڑا کہاں ہے؟''

''وہ تو میں نے اسی وقت گھر سے باہر پھنکوا دیا تھا۔'' اماں فوراً بولیں۔

''اچھا کیا اماں۔'' ناصر مرزا نے تعریفی نظروں سے انہیں دیکھا۔ ''اور وہ انگوٹھی کہاں ہے؟''

''وہ تمہارے پاس ہی تو تھی!'' ساحل عمر نے کہا۔

''کل میں نے تمہارے اس انکشاف کے بعد کہ برکھا نے پڑھی ہوئی انگوٹھی بھیجی تھی' اس انگوٹھی کو ایش ٹرے میں پھینک دیا تھا۔ ناصر مرزا نے ایش ٹرے کی طرف اچکتے ہوئے کہا۔

''اوہ' ہاں یاد آ گیا...... پھر وہ ایش ٹرے میں ہی پڑی ہو گی۔''

وہ ایک خوبصورت کرسٹل ایش ٹرے تھی۔ جو لاؤنج میں ایک میز پر رکھی تھی۔ اس وقت وہ میز ایک طرف رکھی ہوئی تھی۔ مسعود آفاقی نے اٹھ کر ایش ٹرے کو دیکھا۔ ایش ٹرے خالی تھی اس میں کوئی انگوٹھی نہ تھی۔

''اس میں تو کچھ نہیں۔'' مسعود آفاقی نے ایش ٹرے اٹھا کر دکھاتے ہوئے کہا۔

''ارے' پھر کہاں گئی...... اماں کیا آپ نے دیکھی تھی انگوٹھی۔''

''میں نے کل رات کو اس میں پڑی دیکھی تھی۔''

''پھر وہ ایش ٹرے میں سے کہاں گئی!''

پھر اس انگوٹھی کو پورے گھر میں تلاش کر لیا گیا لیکن اس انگوٹھی کا سراغ نہ لگا۔

''چھوڑیں اماں...... اب وہ نہیں ملے گی...... وہ اڑ گئی۔'' ناصر مرزا نے کہا۔ پھر وہ ساحل عمر سے مخاطب ہوا۔ ''ہاں بھئی۔ اب کیا حال ہے؟''

''درد کافی کم ہے...... لیکن بالکل ختم نہیں ہوا۔''

''ہو جائے گا...... تم اپنے ذہن سے پریشانی نکال دو۔''

''نہیں...... میں پریشان نہیں ہوں بلکہ غصے میں ہوں۔''

''غصے سے کام نہیں چلے گا۔'' ناصر مرزا نے مسکرا کر کہا۔ ''ہمیں بڑے تدبر سے کام لینا ہو گا۔ بقول حافظ موسیٰ سفلی والی بڑی عیار ہے۔''

''ناصر...... حافظ موسیٰ سے ملنے جانا چاہئے۔''

''ہاں چلو...... بولو کب چلو گے۔''

''کل چلتے ہیں...... تم شام کو میرے پاس آ جاؤ۔''

درد اگرچہ خاصا کم تھا۔ ناصر مرزا کو امید تھی کہ وہ آہستہ آہستہ بالکل ختم ہو جائے گا۔ پھر بھی اس نے عمل دہرا کر ایک پلیٹ پانی اور تیار کر کے دے دیا تھا تاکہ اگر کسی وقت درد میں اضافہ ہو تو اس پانی کو ٹانگوں پر چھڑک دیا جائے۔

پھر ناصر مرزا اور مسعود آفاقی رات کا کھانا کھا کر اپنے گھروں کو چلے گئے۔

عذرا ساحل گھر میں ہونے والے اس تماشے کو بڑے غور سے دیکھ رہی تھی۔ وہ شیطان کی چیلی برکھا اور اس کی بیٹی ورشا سے بہت پہلے سے واقف تھی۔ ایک وقت تھا کہ وہ ساحل عمر کے خوابوں میں آ کر ان لوگوں سے دور رہنے کی تنبیہ کرتی تھی۔ ساحل کا ورشا سے تعلق اسے ایک آنکھ نہ بھاتا تھا۔ جب اس کی دوستی گہری ہونے لگی تو وہ ایک دن خاصی افسردہ ہو گئی تھی اور اس کی آنکھ سے آنسو بہہ نکلے تھے۔ یہ وہی آنسو تھے جو اس کی تصویر پر برف کی مانند جم گئے تھے...... برف کے آنسو۔

اب وہ ساحل کی دنیا میں آئی تھی تو پھر انہی دونوں ماں بیٹیوں کے قصے تھے۔ وہ ساحل کی جان کے درپے ہو گئی تھی۔ وہ اس کے شوہر کو مار دینا چاہتی تھی لیکن عذرا کچھ نہیں کر سکتی تھی۔ وہ اپنا سب کچھ اپنی دنیا میں چھوڑ آئی تھی۔ یہاں وہ تہی دامن تھی۔ اس کے ہاتھ خالی تھے۔

رات کو ٹھیک گیارہ بج کر پانچ منٹ پر ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔

گھنٹی کی آواز سن کر ساحل عمر ایک دم چونک گیا۔ دیوار پر لگی ہوئی گھڑی جو ٹائم بتا رہی تھی وہ ایک خاص وقت تھا اور اب یہ وقت بہت برا ہو گیا تھا۔

چار گھنٹیاں بج چکی تھیں۔ ساحل عمر ٹیلی فون اٹھانے کی ہمت نہیں کر پا رہا تھا۔ تب اماں آگے بڑھیں اور انہوں نے ریسیور اٹھا کر بڑے کرخت لہجے میں پوچھا۔ ''کون ہے؟''

ادھر سے جواب میں ایک قہقہہ سنائی دیا۔

''اماں نے ریسیور پر ہاتھ رکھ کر ساحل عمر کو بتایا۔ ''کوئی ہنس رہی ہے۔''

پھر انہوں نے ریسیور سے ہاتھ ہٹا کر کہا۔ ''او خبیث ہنستی کیوں ہے؟''

''اوہ بڑھیا...... ساحل کہاں ہے۔ ساحل کو فون دے۔'' ادھر سے انتہائی ہتک آمیز لہجے میں کہا گیا۔

''کیا کام ہے...... تجھے ساحل سے...... مجھ سے بات کر۔'' اماں کو غصہ آ گیا۔

''اوہ بڑھیا تجھ سے کیا بات کروں...... تو میری ایک پھونک کی ہے۔ ایک پھونک ماروں گی تو اڑ جائے گی۔ کیوں مجھ سے الجھتی ہے...... کیوں اپنی جان کی دشمن ہوئی ہے۔'' ادھر سے تنبیہ کی گئی۔

"تو ہے کون؟"

"میں برکھا ہوں...... میں تم سب کی موت ہوں۔"

برکھا نے انتہائی پراسرار لہجے میں کہا۔ ایسے انداز میں کہ اماں کے جسم میں ایک خوف کی لہر آ کر گزر گئی۔ انہوں نے جواب دیئے بغیر ریسیور ٹیلی فون پر پٹخ دیا۔

"بدذات کہیں کی۔" وہ غصے سے بڑبڑائیں۔ پھر جب انہوں نے ساحل کی طرف نظر اٹھائی تو ان کے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہونے لگے۔

☆......☆......☆

ساحل عمر کی ناک سے خون بہہ رہا تھا۔ یہ خون بہہ کر اس کے ہونٹوں پر آ گیا تھا لیکن ساحل عمر کو مطلق احساس نہ تھا۔ وہ اماں کو حواس باختہ دیکھ کر پریشان ہو گیا۔

''اماں فون پر کون تھا؟'' اس نے پوچھا۔

اماں نے اس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ وہ تیزی سے اس کے نزدیک آ گئیں اور گھبرا کر بولیں۔ ''یہ تمہیں کیا ہوا؟'

ساحل عمر نے عجیب سی نظروں سے اماں کو دیکھا۔ میں کچھ پوچھ رہا ہوں' یہ کچھ جواب دے رہی ہیں۔ مجھے تو کچھ نہیں ہوا' پر اماں کو ضرور کچھ ہوا ہے۔ اس بات کی تصدیق کیلئے اس نے عذرا کی طرف منہ موڑا۔

ساحل عمر کا چہرہ دیکھتے ہی عذرا کی رنگت سفید پڑ گئی۔ ''ارے...... خون؟'' وہ گھبراہٹ میں اتنا ہی بول پائی۔ اب خون بہتا ہوا اس کے ہونٹوں پر پھیل چکا تھا۔ عذرا کی گھبراہٹ نے اسے اپنے ہونٹوں پر انگلی پھیرنے پر مجبور کر دیا۔ اسے اپنی انگلی پر چپچپاہٹ محسوس ہوئی تو اس نے اپنی انگلی کو دیکھا۔ انگلی کو دیکھ کر اس کے ہوش اڑ گئے۔ ''ارے' یہ کیا ہوا؟''

''یہی تو میں پوچھ رہی تھی۔ تمہاری ناک سے خون نکل رہا ہے اور تمہیں احساس تک نہیں...... حیرت ہے۔'' اماں نے کہا۔ ''شاید تمہاری نکسیر پھوٹ گئی ہے۔ واش روم میں جا کر ناک میں ٹھنڈا پانی ڈال لو۔''

ساحل عمر فوراً اٹھ گیا۔ واش روم میں جا کر آئینے میں اس نے اپنی صورت دیکھی تو صورتحال کو سنگین پایا۔ اس کی ناک کے ایک نتھنے سے ڈھیرے ڈھیرے خون بہہ رہا تھا۔ اس نے جلدی جلدی اپنی ناک دھوئی۔ اس میں پانی چڑھایا۔ اتنے میں اماں جگ میں ٹھنڈا پانی لے آئیں۔ اس نے جگ لے کر ٹھنڈا پانی اپنی ناک میں ڈالا پھر لاؤنج میں آ کر بیٹھ گیا۔ عذرا اور اماں بھی وہیں بیٹھی تھیں۔

''خون رک گیا۔'' اماں نے اس کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا؟

''ہاں' اماں رک تو گیا ہے؟'' ساحل عمر نے سوچتے ہوئے کہا۔ ''اماں' ٹیلی فون پر کون تھی؟''

''ارے وہی بدذات برکھا تھی۔'' اماں نے غصے سے جواب دیا۔

''کیا کہہ رہی تھی؟'' اس نے پوچھا۔

''بکواس کر رہی تھی۔'' اماں نے سرسری سے انداز میں کہا پھر اچانک بولیں۔ ''ارے یہ

خون تو پھر نکلنے لگا۔"

یہ سنتے ہی ساحل عمر نے فوراً واش روم کا رخ کیا۔ اس نے ناک اچھی طرح دھوئی کئی مرتبہ ٹھنڈا پانی ناک میں چڑھایا۔ خون ایک مرتبہ پھر رک گیا...... لیکن کچھ ہی دیر گزری تھی کہ پھر ناک سے خون نکلنے لگا۔

اس طرح خون بند ہوتے نکلتے پوری رات آنکھوں میں نکل گئی۔ وہ اگر سیدھا لیٹ جاتا تو خون ناک سے بہنا شروع ہو جاتا لیکن کچھ ہی دیر بعد ایسا محسوس ہوتا جیسے خون حلق میں جمع ہو رہا ہو۔ وہ واش روم میں جا کر تھوکتا تو واش بیسن خون سے سرخ ہو جاتا۔ اگر وہ کروٹ سے لیٹتا تو خون فوراً باہر نکلنے لگتا۔ یہی حالت بیٹھنے پر تھی۔ کئی تولیے خون میں بھر گئے تھے لیکن خون تھا کہ بند ہونے کا نام نہیں لے رہا تھا۔

اماں نے کئی مرتبہ اسے ہسپتال چلنے کو کہا تھا۔ ناصر مرزا سے بات کرنے کو کہا تھا لیکن نہ وہ ہسپتال گیا تھا اور نہ ہی اماں کو ناصر مرزا کو خبر دینے دی تھی۔ وہ اسے اتنی رات گئے پریشان نہیں کرنا چاہتا تھا۔ ہسپتال اس لئے نہیں گیا تھا کہ وہ اس بات کو نکسیر پھوٹنے کا عمل سمجھ رہا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ کسی وقت یہ خون خود بخود ٹھیک ہو جائے گا۔

صبح ہوتے ہوتے اس کا خاصا خون بہہ گیا۔ وہ نڈھال ہو کر پڑ گیا۔ اس نے کروٹ لے کر تولیہ ناک کے نیچے رکھ لیا۔ خون بہہ بہہ کر جذب ہوتا رہا۔ اب اماں کے ضبط کے سارے بندھن ٹوٹ گئے۔ انہوں نے ناصر مرزا کو فون کر کے رات کی ساری روداد اس کے گوش گزار کر دی۔

ساری بات سن کر اس نے خفگی کا اظہار کیا۔ "یہ ساحل عمر آخر کب مجھے اپنا دوست سمجھے گا۔"

"تمہارے آرام میں خلل کی وجہ سے ساحل عمر نے تمہیں فون نہیں کرنے دیا۔" اماں نے بات نبھانے کی کوشش کی۔

آدھے گھنٹے کے اندر ناصر مرزا ساحل عمر کے گھر پہنچ گیا۔ اس نے گھر میں گھستے ہی چٹکی بجا کر کہا۔ "ساحل فٹافٹ تیار ہو جاؤ۔"

"ہسپتال جانا ہے؟" ساحل عمر نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

"نہیں۔" ناصر مرزا نے انکار میں گردن ہلائی۔ "یہ ہسپتال کا کیس نہیں۔"

"تو پھر؟" اس نے سوال کیا۔

"ہم حافظ موسیٰ کے پاس چلیں گے۔" ناصر مرزا بولا۔ "وہ سفلی والی اپنا رنگ دکھا رہی ہے۔"

"ہاں، ناصر تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ اگر یہ نکسیر پھوٹنے کا معاملہ ہوتا تو خون کب کا بند ہو چکا ہوتا۔" اماں نے بھی ناصر مرزا کے فیصلے کی تائید کی۔

عذرا کی عجیب کیفیت تھی۔ وہ بالکل خاموش تھی۔ پوری رات اس نے بھی جاگ کر گزار دی تھی۔ خون دیکھ کر اس کا دل کانپ رہا تھا۔ چہرے سے افسردگی ظاہر ہو رہی تھی۔

ناصر مرزا نے ایک نظر اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔ اس کی صورت دیکھ کر اس نے اسے

دلاسہ دینے کی کوشش کی۔ ''عذرا' پریشان مت ہو۔ ساحل عمر ٹھیک ہو جائے گا۔''

''جی۔'' اس نے بہت دھیرے سے کہا اور ساحل عمر کی طرف پر امید نظروں سے دیکھا۔

''اللہ کرے ایسا ہی ہو۔''

''عذرا میں حافظ موسیٰ کی طرف جا رہا ہوں۔'' ساحل عمر نے روئی رکھ کر ناک پر پٹی باندھ لی تھی۔ اس طرح اس کی صورت مزید خوفناک ہو گئی تھی لیکن بہتے خون کا اس سے بہتر کوئی علاج نہ تھا۔ عذرا انہیں دروازے تک چھوڑ آئی۔

جب وہ حافظ موسیٰ کے گھر کے دروازے پر پہنچے تو سورج اچھی طرح نکل آیا تھا۔ ناصر مرزا گھنٹی بجانے لگا تو اس نے دیکھا کہ گیٹ تھوڑا سا کھلا ہوا ہے۔ اس نے سوچا گھنٹی بجائے بغیر گھر میں داخل ہو جائے۔ حافظ موسیٰ تک پہنچنے کیلئے گھر کے اندر تو جانا نہیں پڑتا تھا لیکن پھر وہ یہ سوچ کر رک گیا کہ اس طرح گھر میں داخل ہو جانا کسی طور مناسب نہیں۔ اسے گھنٹی بجانا چاہئے۔

ابھی وہ بیل بجانے کیلئے بٹن پر ہاتھ رکھنا ہی چاہتا تھا کہ اچانک گیٹ کھلنے کی کھڑکھڑاہٹ سنائی دی۔ گیٹ سے دس بارہ سال کا بچہ نکلا۔ اس نے طائرانہ نظر ناصر مرزا پر ڈالی اور سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔ ''جی فرمایئے۔''

''حافظ موسیٰ سے ملنا ہے۔''

''اندر آ جایئے۔'' اس لڑکے نے بلا تامل کہا اور پھر فوراً ہی گیٹ کے اندر چلا گیا۔ وہ دونوں گیٹ کے اندر داخل ہوئے تو انہیں وہ لڑکا کہیں نظر نہ آیا۔ ناصر مرزا حافظ موسیٰ کے ٹھکانے سے واقف تھا۔ اس لئے اس نے ساحل عمر کا ہاتھ پکڑا اور مکان کے پچھواڑے کی طرف بڑھنے لگا۔

دروازہ کھلا ہوا تھا۔ حافظ موسیٰ درخت کے نیچے کھرے پلنگ پر اپنی لاٹھی دونوں ہاتھوں میں تھامے مخصوص انداز میں بیٹھے ہوئے تھے۔ موسم تھوڑا سا ٹھنڈا تھا۔ اس لئے ان کے کندھے پر ایک چادر پڑی تھی۔

ناصر مرزا نے کھلے دروازے پر کھڑے ہو کر کواڑ تھپتھپایا۔ دروازے کی آواز سن کر حافظ موسیٰ نے اپنا چہرہ اٹھایا اور پوچھا۔ ''کون ہے بھائی؟''

''ناصر مرزا اور ساحل عمر۔'' ناصر مرزا نے جواب دیا۔

''اچھا اچھا۔'' حافظ موسیٰ نے خوشگوار لہجے میں کہا۔ ''آ جاؤ بھئی' دروازے پر کیوں کھڑے ہو؟''

''چلو۔'' ناصر مرزا ساحل عمر سے مخاطب ہو کر بولا۔

ساحل عمر دروازے میں داخل ہو گیا۔ اس کے پیچھے ناصر مرزا...... دونوں نزدیک پہنچ کر خاموش کھڑے ہو گئے۔

''آؤ بھئی بیٹھ جاؤ...... کھڑے کیوں ہو؟'' حافظ موسیٰ نے چارپائی کی طرف اشارہ کیا۔

ناصر مرزا نے ساحل عمر کو اس کے نزدیک بٹھایا اور خود ذرا پیچھے پائتی کی طرف بیٹھ گیا۔

''بہت خاموشی ہے...... خیر تو ہے؟'' حافظ موسیٰ نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

''حافظ صاحب خیر نہیں ہے۔'' ناصر مرزا بولا۔ ''برکھا نے عذاب میں مبتلا کر دیا ہے۔''

'اچھا' وہ سفلی والی۔'' حافظ موسیٰ نے سوچتے ہوئے کہا۔ ''وہ کیا کہتی ہے؟''

''وہ تماشے دکھا رہی ہے...... اس نے ساحل کا راتوں کا چین چھین لیا ہے۔'' ناصر مرزا نے فکر مند ہو کر کہا۔

''وہ تماشے والی عورت ہے ...... اس نے تماشا ہی دکھانا ہے۔ اور کیا کرنا ہے۔ آخر ہوا کیا؟''

حافظ موسیٰ کے سوال کے جواب میں شادی کی رات سے اب تک اس نے جو کارروائی کی تھی وہ حافظ موسیٰ کے گوش گزار کر دی۔ ساری بات سن کر حافظ موسیٰ گویا ہوئے۔ ''خون ابھی تک جاری ہے۔''

''جی۔'' اس مرتبہ جواب ساحل عمر نے دیا۔

حافظ موسیٰ نے لاٹھی دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر اس میں بنی آنکھ پر اپنی بے نور آنکھ رکھ دی۔ چند لمحے وہ اسی طرح بیٹھے رہے۔ پھر لاٹھی ہٹا کر اپنی گردن اونچی کر لی اور ایک ٹھنڈا سانس بھرا۔ ''اچھا۔''

ساحل عمر نے ناصر مرزا کی طرف دیکھا۔ دونوں اس اچھا کا مطلب نہ سمجھ سکے۔

''خیر کوئی بات نہیں۔'' وہ جیسے اپنے آپ سے ہم کلام تھے۔ انداز کچھ تنبیہی تھا۔

''کیا ہوا حافظ صاحب۔'' ناصر مرزا نے آہستگی سے پوچھا۔

''ناصر مرزا وہ چاقو کہاں ہے؟''

''میرے پاس ہے حافظ صاحب۔'' ناصر مرزا بولا۔

''اس چاقو کی نوک سے اس درخت کی جڑ سے تھوڑی سی مٹی کھود کر میرے پاس لاؤ۔'' حافظ موسیٰ نے ہدایت کی۔

''جی اچھا۔'' یہ کہہ کر ناصر مرزا نے اپنی پینٹ کی جیب سے چاقو نکالا اور پھر نیم کے درخت کی جڑ میں بیٹھ کر تھوڑی سی مٹی کھود کر اپنی ہتھیلی پر رکھی اور ان کے نزدیک آ کر ہاتھ پھیلا دیا۔ ''یہ لیجیے۔''

حافظ موسیٰ نے ہاتھ بڑھایا۔ ناصر مرزا نے اپنا ہاتھ ان کے ہاتھ سے مس کیا۔ انہوں نے مٹی پر اپنی دو انگلیاں رکھ کر کچھ پڑھا اور بولے۔ ''ناصر مرزا اس مٹی کو ساحل کی ناک کے نزدیک کر دو۔ پھر وہ ساحل عمر سے مخاطب ہوئے۔ ''ساحل تم نے اس مٹی کو سونگھنا ہے' تین مرتبہ گہرے مگر آہستہ سانس لے کر۔''

''جی اچھا۔'' ساحل عمر نے اپنی ناک سے پٹی کھول دی۔ روئی ہٹا لی۔ روئی خون سے تر ہو چکی تھی۔

ناصر مرزا نے اپنی ہتھیلی آگے کی۔ ساحل عمر نے اس کے ہاتھ کو اپنے دونوں ہاتھوں میں پکڑ کر آگے کھینچا۔ ناک کے نزدیک لا کر اس نے اس مٹی کو سونگھا۔ اس مٹی میں گلاب کی سی خوشبو تھی۔ اس

نے تین گہرے سانس لئے۔ اسے فوری طور پر سکون محسوس ہوا' ساتھ ہی بہتا ہوا خون بند ہو گیا۔

"کچھ سکون ملا؟" انہوں نے پوچھا۔

"نہ صرف سکون ملا بلکہ ناک سے خون آنا بھی بند ہو گیا۔"

"ناصر مرزا یہ مٹی تم نے جہاں سے کھودی تھی اسے وہیں ڈال دو۔"

ناصر مرزا نے فوراً حکم کی تعمیل کی۔

"ساحل عمر اب تم میری ایک بات غور سے سن لو لیکن میری بات سن کر پریشان بالکل مت ہونا۔"

"جی فرمایئے۔" ساحل عمر نے اس کی طرف دیکھا۔

"وہ سفلی والی اب تمہاری جان کے درپے ہو گئی ہے۔ اس پر جنون سوار ہو گیا ہے۔ انتقام کی آگ میں اندھی ہو گئی ہے۔ خیر ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔ وہ تمہاری موت نہیں بن سکتی۔ وہ خود اپنی موت ہے۔ اب تمہیں ایک کام کرنا ہے۔ وہ تلوار کہاں ہے؟"

"گھر پر ہے۔" ساحل عمر نے جواب دیا۔

"یہ کام تمہیں بارہ بجے سے پہلے کرنا ہے۔" حافظ موسیٰ نے ہدایت کی۔ "یہاں سے واپس جا کر یہ کام جتنی جلد ممکن ہو سکے کر لینا۔ اس تلوار کو تم اپنے گھر کے پچھواڑے ایک خاص مقام پر جس کی نشاندہی خودبخود ہو جائے گی۔ اس تلوار کو زمین میں دستے تک اتار دینا۔"

"کچھ پڑھنا بھی ہو گا۔" اس نے دریافت کیا۔

"ہاں بالکل...... میں تمہیں بتاتا ہوں۔ کیا پڑھنا ہے اور کیا کرنا ہے...... میری بات بہت غور سے سنو۔" حافظ موسیٰ نے پھر پوری تفصیل سے ساحل عمر کو سب کچھ سمجھا دیا۔

☆......☆......☆

سارلوک کی وہ خاندانی تلوار جسے وہ مقدس کہتا تھا اور جس تلوار سے ساحل عمر نے راعین کا خاتمہ کیا تھا۔ وہ تلوار ساحل عمر نے اپنے کپڑوں کی الماری میں ایک کونے میں کھڑی کر دی تھی۔

اس نے وہاں سے وہ تلوار نکالی اور اپنے مکان کے عقب میں پہنچ گیا۔ حافظ موسیٰ نے یہ نہیں بتایا تھا کہ اس تلوار کو کس جگہ زمین میں گاڑنا ہے۔ انہوں نے کہا تھا کہ اس بات کی نشاندہی خودبخود ہو جائے گی۔ ساحل عمر کے مکان کا عقبی حصہ پھولوں اور کیاریوں سے بھرا ہوا تھا۔ جب وہ کہ تلوار لے کر عقبی حصے میں پہنچا تو اسے وہ جگہ فوراً ہی نظر آ گئی۔ حافظ موسیٰ نے سچ کہا تھا۔ اس جگہ کی نشاندہی بہت واضح انداز میں کر دی گئی تھی۔

مغربی دیوار کے سائے میں ایک گلاب کے پودے کے نزدیک پھول کی پتیوں سے ایک دائرہ بنا ہوا تھا۔ یہ گلاب کی پتیاں تھیں اور ان کا رنگ زرد تھا۔

وہ اس دائرے کے نزدیک گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا اور اس نے تلوار کا دستہ دونوں ہاتھوں میں تھام کر کچھ پڑھتے ہوئے تلوار زمین پر زور سے ماری۔ تھوڑی سی تلوار زمین میں دھنس گئی۔ اب اسے تلوار کو اسی طرح پکڑے پکڑے حافظ موسیٰ کی ہدایت کے مطابق پڑھنا تھا۔ ساحل عمر نے پورے اعتماد

اور یقین کے ساتھ پڑھنا شروع کیا۔ پڑھتے پڑھتے اس نے محسوس کیا کہ تلوار خود بخود زمین میں دھنستی جا رہی ہے۔

آدھے گھنٹے کے بعد جب اس کا عمل مکمل ہوا تو وہ پوری تلوار دستے تک زمین میں دھنس چکی تھی۔ مٹی اس قدر نرم ہو گئی تھی کہ وہ تلوار زمین میں بغیر کسی دباؤ کے اندر گھستی چلی جا رہی تھی۔ ساحل عمر نے اس تلوار کا دستہ دونوں ہاتھوں میں تھام رکھا تھا لیکن اس نے تلوار پر کسی قسم کا زور نہیں ڈالا تھا۔ اس کے باوجود تلوار زمین میں اس طرح اترتی چلی جا رہی تھی جیسے کیک میں چھری۔

عمل مکمل ہونے کے بعد اس نے کھڑے ہو کر تلوار کو دونوں ہاتھوں سے زمین سے کھینچا چاہا۔ اس کا خیال تھا کہ تلوار زمین سے اسی طرح آرام سے باہر آ جائے گی جس طرح گئی تھی لیکن تلوار ٹس سے مس نہ ہوئی۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے اسے پتھریلی زمین میں سیمنٹ کے ذریعے گاڑ دیا گیا ہو۔

ساحل عمر نے وہ تلوار وہیں زمین میں گڑی چھوڑ دی۔ کیونکہ حافظ موسیٰ نے یہی ہدایت کی تھی۔

ساحل عمر یہ بات سمجھنے سے قاصر تھا کہ انہوں نے ایسی ہدایت کیوں کی تھی۔ اس کے پیچھے کیا حکمت عملی تھی جبکہ اسے یہ بات اچھی طرح یاد تھی کہ جب حافظ موسیٰ اس کے گھر آئے تھے تو جاتے ہوئے اس تلوار کو بطور خاص حفاظت کی ہدایت کر کے گئے تھے کیونکہ ان کے خیال کے مطابق اس تلوار کے پیچھے چور لگیں گے۔ اسی ہدایت کے پیش نظر اس نے تلوار ایک ایسی جگہ رکھ دی تھی کہ چوری کرنے والا اس تلوار تک فوری طور پر نہ پہنچ سکے۔

اب حافظ موسیٰ نے اس تلوار کو کھلے آسمان تلے گڑوا کر چوروں کو کھلی دعوت دے دی تھی کہ دیوار کود کر اندر آؤ اور تلوار اکھاڑ کر لے جاؤ...... حافظ موسیٰ کا یہ طرز عمل اس کی سمجھ سے باہر تھا۔

☆......☆......☆

ورشا یہ بات کئی دن سے محسوس کر رہی تھی...... لیکن وہ اسے اپنا وہم، کبھی آنکھوں کا فریب، نظروں کا دھوکا سمجھ کر نظر انداز کرتی آ رہی تھی۔ وہ سوچتی تھی کیونکہ یہ چیز اسے کئی مرتبہ خواب میں دکھائی دے چکی تھی اس لئے اس کے ذہن نے خواب کو حقیقت بنا کر پیش کر دیا ہے۔

اس نے اس خواب کو سات دن تک مسلسل دیکھا تھا۔ وہ دیکھتی تھی کہ وہ اپنے کمرے میں آئی ہے، جب وہ کھلے دروازے سے اپنے کمرے میں داخل ہوتی تو اسے ایک شخص اپنے بیڈ پر لیٹا دکھائی دیتا ہے جو اس کے کمرے میں داخل ہونے کے بعد فوراً اٹھ کر بیٹھ جاتا۔ اسے بڑی محبت سے دیکھتا اور پھر وہ بغلی دروازہ کھول کر کمرے میں چلا جاتا۔ یہ کمرہ کبھی برکھا کا بیڈ روم ہوتا تھا۔ مناف کو قتل کرنے کے بعد برکھا نے اپنا بیڈ روم تبدیل کر لیا تھا۔ اب اس کا بیڈ روم اس کمرے کو چھوڑ کر دوسرے کمرے میں تھا۔

تین دن تک جب ورشا کو یہ خواب بغیر کسی فرق کے نظر آتا رہا تو اس نے اس کا ذکر اپنی ماں سے کیا۔ یہ خواب سن کر برکھا کے چہرے پر پریشانی کے آثار ہویدا ہو گئے۔ اس نے کرید کرید کر اس شخص کا حلیہ پوچھا۔ ورشا نے جب اس شخص کا حلیہ بتایا تو برکھا کے جسم پر سنسنی سی دوڑ گئی۔

''اوہ۔'' برکھا نے ٹھنڈا اور گہرا سانس لیا۔

''ممی کیا ہوا؟'' ورشا نے پوچھا۔

''ورشا کیا تو اس شخص کو نہیں جانتی؟'' برکھا نے سوال کیا۔

''ممی میں اگر جانتی ہوتی تو آپ کو فوراً اس کا نام بتاتی۔ آپ کو اس کا حلیہ پوچھنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔''

''وہ تیرا نانا ہے۔'' برکھا نے بڑے پراسرار انداز میں بتایا۔

''ہیں۔ وہ میرے نانا ہیں۔ میں نے انہیں کبھی نہیں دیکھا۔ ہمارے گھر میں تو ان کی کوئی تصویر بھی نہیں۔''

''میں حیران ہوں کہ اتنی طویل مدت کے بعد اس نے تیرے خوابوں میں کیوں آنا شروع کیا ہے۔'' وہ فکر مند تھی۔

''ممی حیران ہو یا پریشان؟'' ورشا نے سوال کیا۔

''میں حیران بھی ہوں اور پریشان بھی کیونکہ اس کا مسلسل تیرے خواب میں آنا کسی خطرے سے خالی نہیں۔''

''ممی آپ کو اپنے باپ سے کس طرح کا خطرہ ہو سکتا ہے۔'' ورشا نے پوچھا۔ ''وہ بھی مرے ہوئے باپ سے۔''

''کیا تو نہیں جانتی؟'' برکھا نے اسے عجیب سی نظروں سے دیکھا۔

''نہیں مجھے کیا معلوم؟'' ورشا نے معصومیت سے کہا۔

''میں نے تجھے بتایا تو تھا کہ میں نے اپنے باپ کو مار دیا تھا۔ اسے بھینٹ چڑھا دیا تھا۔''

''ہاں یہ بات تم نے بتائی تھی...... ممی تم نے تو میرے باپ کو بھی قتل کر دیا تھا۔ میں اس قتل کی چشم دید گواہ ہوں۔'' ورشا کی نظروں میں فوراً وہ منظر آ گیا جب اس نے اپنے باپ کو خون میں نہایا ہوا دیکھا تھا۔

''ہاں میں نے اسے بھی مار دیا تھا۔'' برکھا نے بڑی لاپروائی سے کہا۔

''ممی ابھی تم نے کتنے اور قتل کرنے ہیں۔ کتنے لوگوں کو بھینٹ چڑھانا ہے۔''

''میری راہ میں جو آئے گا...... میرے راستے کی جو رکاوٹ بنے گا وہ زندہ نہیں بچے گا۔'' برکھا نے بڑے اطمینان سے کہا۔ جیسے اس نے کسی کو قتل کرنے کی بات نہ کی ہو کسی کو کھانا کھلانے کی بات کی ہو۔

''ممی چاہے میں ہی کیوں نہ تمہارے راستے میں آ جاؤں۔'' ورشا نے اندازہ کرنے کیلئے سوال کیا۔

''میں نے کہا ناں جو بھی میرے راستے میں آئے گا' مارا جائے گا۔ چاہے وہ تم ہو یا ساحل عمر۔ ساحل عمر کو بہر حال میں نہیں چھوڑوں گی۔ میں اس کی موت بن جاؤں گی۔'' برکھا کے لہجے میں تپش آ گئی تھی۔

ورشا نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اسے اپنی اوقات کا اچھی طرح پتہ چل گیا تھا اور یہ بات اسے ہمیشہ سے معلوم تھی کہ جو عورت اپنے باپ کو مار سکتی ہے' شوہر کو مار سکتی ہے وقت آنے پر وہ اپنی بیٹی کا خاتمہ بھی کر سکتی ہے۔ یہ محض اس کا گمان تھا لیکن اپنی ماں کے منہ سے صاف صاف سن لینے کے بعد یہ گمان یقین میں بدل گیا تھا۔ پھر اس نے اپنی ماں کے پاس رکنا مناسب نہ سمجھا۔ وہ خاموشی سے اٹھ کر اس کے کمرے سے نکل کر جانے لگی۔ ابھی وہ دروازے پر ہی پہنچی تھی کہ برکھا نے آواز دی۔

''ورشا۔''

ورشا اس کی آواز سن کر دروازے پر ہی رک گئی اور سوالیہ نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔

''میری جان ناراض ہو گئی۔'' برکھا نے اپنے لہجے میں شہد بھر کر کہا۔

''ممی آپ بھی خوب ہیں ایک طرف مجھے اپنی جان کہتی ہیں' دوسری طرف میری جان لینے کے درپے ہیں۔'' وہ پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔

''ادھر آؤ' میرے پاس۔'' برکھا نے اسے اپنے پاس بلایا۔ لہجے میں خفگی بھرا پیار تھا۔

''جی ممی۔'' وہ دروازے پر کھڑی رہی' برکھا کی طرف نہیں بڑھی۔

تب برکھا خود اٹھ کر اس کے نزدیک آئی اور اسے اپنے گلے لگاتے ہوئے بولی۔ ''پگلی میں مذاق کر رہی تھی۔ بھلا کوئی اپنی جان بھی لیتا ہے تو تو میری جان ہے۔''

ورشا نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ خاموش کھڑی رہی پھر جب اس کے جسم کی بدبو ناقابل برداشت ہو گئی تو ورشا آہستگی سے الگ ہو گئی۔ ''اچھا ممی۔''

''ہاں' میں یہ کہہ رہی تھی کہ اب اگر تجھے تیرا نانا نظر آئے تو مجھے بتانا۔''

''اچھا ممی۔'' وہ بڑی فرمانبرداری سے بولی اور اس کے کمرے سے نکل آئی۔

ورشا کے نانا کالی داس نے اس کے خواب میں آنے کی شاید قسم کھا لی تھی۔ وہ چوتھے دن بھی اس کے خواب میں آ گیا اور پھر مسلسل آتا رہا۔ یہاں تک کہ سات دن پورے ہو گئے۔ برکھا نے ہدایت کی تھی کہ اب کالی داس اس کے خواب میں آئے تو وہ اسے ضرور بتائے۔

ورشا نے برکھا سے ذکر کر دیا۔ برکھا کچھ دیر سوچتی رہی پھر اس نے ورشا کو ہدایت کی کہ آج رات وہ سونے سے پہلے ایک منتر پڑھ کر سوئے اس کے بعد وہ کبھی اس کے خواب میں نہیں آئے گا۔

ورشا نے وہ منتر یاد تو کر لیا مگر اس نے رات کو پڑھا نہیں۔ بھلا اسے اپنے نانا سے کیا دشمنی تھی۔ اگر وہ خواب میں آ رہے تھے تو شوق سے آئیں۔ وہ اسے کوئی نقصان تو نہیں پہنچا رہے تھے۔

آٹھویں رات اس کا نانا بغیر منتر پڑھے ہی اس کے خوابوں سے غائب ہو گیا۔ صبح ہوتے ہی برکھا نے اس سے اس کے خواب کے متعلق دریافت کیا۔ ''کیا ہوا...... رات کو تو نہیں آیا وہ۔''

''نہیں ممی...... رات کو وہ خواب میں نہیں دکھائی دیئے۔'' ورشا نے بتایا اور یہ بات سچ تھی۔

یہ سن کر برکھا نے اطمینان کا سانس لیا جیسے کوئی متوقع خطرہ ٹل گیا ہو۔

لیکن یہ خطرہ ٹلنے والا نہ تھا۔ وہ اگر اس کے خوابوں میں آ رہا تھا اور اسے محبت بھری نظروں سے دیکھ رہا تھا تو یہ سب کچھ بلا مقصد نہ تھا' بلا سبب نہ تھا۔

دوپہر کا کھانا کھا کر جب ورشا اپنے کمرے میں آئی تو ایک دم ٹھٹھک گئی۔ خواب والا منظر اس کے سامنے تھا۔ کالی داس اس کے بیڈ پر لیٹا ہوا تھا۔ اسے کمرے میں داخل ہوتا دیکھ کر وہ فوراً اٹھ کر بیٹھ گیا اور اسے بڑی محبت بھری نظروں سے دیکھنے لگا۔ پھر وہ اٹھا اور بغلی دروازے کو کھول کر اندر چلا گیا۔

ورشا بڑی حیران ہوئی اس نے دروازے کو دھکا دے کر دیکھا لیکن وہ دروازہ دوسری طرف سے بند تھا۔ اب اسے یہ منظر اپنی جاگتی آنکھوں کا خواب محسوس ہوا۔

پھر یہ منظر اسے کئی دن تک نظر آیا۔ وہ اسے اپنا وہم' آنکھوں کا فریب' نظروں کا دھوکا سمجھ کر نظر انداز کرتی رہی لیکن یہ وہم' فریب یا نظروں کا دھوکا نہ تھا۔

کالی داس اپنی زندگی میں ایک منصوبہ ساز شخص تھا۔ مرنے کے بعد بھی یہ منصوبہ بندی اس کی روح سے الگ نہ ہوئی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ ورشا کے سامنے بہت دھیمے انداز میں زینہ بہ زینہ آیا تھا۔ اس کے خوابوں میں آنے کے بعد اس نے دوسرا قدم اٹھایا۔ وہ اسے جاگتی آنکھوں سے نظر آیا اور خوابوں کی طرح کئی دن نظر آتا رہا۔ اس طرح ورشا اس سے مانوس ہو گئی۔ اس کے دل سے سارا ڈر خوف نکل گیا۔

پھر جب ورشا چوتھے دن شام کو اپنے کمرے میں داخل ہوئی تو وہ اٹھ کر کمرے سے غائب نہ ہوا بیٹھا رہا اور بڑے پیار بھرے انداز میں اسے پکارا۔ ''ورشا۔''

☆......☆......☆

وہ چیخ کی آواز تھی۔ رات کے سناٹے میں کوئی چیختا تھا۔ یہ ایک مردانہ چیخ تھی اور گھر کے پچھواڑے سے آئی تھی۔ اماں تہجد پڑھ کر ابھی لیٹی تھیں۔ آنکھوں میں ابھی نیند اترنے لگی تھی کہ اس چیخ نے ان کی آنکھوں سے نیند اڑا دی۔ وہ فوراً اٹھ کر بیٹھ گئیں۔

چیخیں رہ رہ کر ابھر رہی تھیں۔ کوئی بڑی بھیانک آواز میں چیخ رہا تھا۔ ''ہائے میں مر گیا...... مجھے بچاؤ۔''

اماں نے فوراً ساحل عمر کے کمرے کا دروازہ بجایا۔ یہ چیخیں عذرا نے بھی سن لی تھیں۔ جب اماں نے دروازہ بجایا تو وہ ساحل عمر کو اٹھا چکی تھی۔

''کیا ہوا؟'' ساحل عمر نے آنکھیں کھولتے ہوئے پوچھا۔

''باہر کوئی چیخ رہا ہے۔'' عذرا نے بتایا۔

اتنے میں دروازے پر اماں نے دوبارہ دستک دی۔

''دروازے پر کون ہے؟'' ساحل عمر نے پوچھا۔

''شاید اماں ہیں۔'' عذرا نے کہا اور دروازے کی طرف بڑھی۔

''تم ٹھہرو میں کھولتا ہوں دروازہ۔''

دروازے پر اماں پریشان کھڑی تھیں۔ وہ گھبرا کر بولیں۔ ''ساحل گھر کے پیچھے کوئی ہے۔''

''اچھا میں دیکھتا ہوں۔''

''ہائے تم اکیلے مت جاؤ۔''

''اماں میں لائٹ جلا کر پہلے کھڑکی سے دیکھتا ہوں پھر باہر جاؤں گا۔'' ساحل عمر نے اماں کو تسلی دی۔

ساحل عمر نے باہر دیوار پر لگی ٹیوب لائٹ روشن کی اور پھر پچھلی کھڑکی کا پردہ ہٹا کر باہر جھانک کر دیکھا۔ باہر کا منظر ہی عجیب تھا۔ کوئی شخص گھٹنوں کے بل بیٹھا ہوا تھا اور اس کے دونوں ہاتھ تلوار کے دستے پر تھے اور وہ بار بار اپنے جسم کو حرکت دے رہا تھا۔ اس نے چیخنا بند کر دیا تھا۔ جیسے ہی لائٹ جلی اس نے مڑ کر گھر کی طرف دیکھا۔ تب ساحل عمر نے اسے فوراً پہچان لیا۔ وہ خبیث واسم تھا اور تلوار چرانے آیا تھا۔

ساحل عمر نے پہلی بار اس شخص کو اس وقت دیکھا تھا جب ورشا اسے ہاکس بے لے گئی تھی پھر یہ شخص ساحل عمر کو اغوا کر کے چتر وبھیل کے استھان پر لے گیا تھا۔ ساحل عمر اس بات کو اچھی طرح جانتا تھا کہ یہ برکھا کا خادم خاص ہے۔ اس کے اشارے پر جان دینے والا۔

''ساحل صاحب بھگوان کے واسطے مجھے معاف کر دیں۔ آئندہ میں یہاں کبھی نہ آؤں گا۔'' وہ روشنی ہوتے ہی زور سے بولا۔

ساحل عمر نے اس کے ہاتھوں کو غور سے دیکھا۔ تب اس پر انکشاف ہوا کہ اس کے دونوں ہاتھ دستے پر جمے ہوئے ہیں۔ اس کے ہاتھ جیسے چپک گئے ہیں۔ وہ باوجود کوشش کے اپنے ہاتھ الگ نہیں کر پا رہا۔

اب ساحل پر حافظ موسیٰ کا طرز عمل واضح ہوا۔ انہوں نے اس تلوار کو باہر گڑوا کر جو چوروں کو دعوت دی تھی تو کچھ غلط نہیں کیا تھا۔ یہ تلوار چور کیلئے پھندا ثابت ہوئی تھی۔

واسم کو دیکھ کر ساحل عمر کے تن بدن میں غصے کی آگ بھڑک اٹھی۔ وہ گھر کا پچھلا دروازہ کھول کر باہر نکلا اور واسم کے نزدیک پہنچتے ہی اس کے جسم پر ایک زور دار لات جمائی اور غصے سے بولا۔ ''کتے کے بچے تجھے یہاں تیری موت کھینچ لائی۔''

''ساحل صاحب مجھے اس مصیبت سے نجات دلائیں۔ مجھے معاف کر دیں۔ میرے ہاتھ تلوار سے چپک گئے ہیں اور ہاتھوں میں سوئیاں سی چبھ رہی ہیں۔''

''خبیث کی اولاد تو یہاں کیا کرنے آیا تھا؟'' ساحل عمر نے غصے سے پوچھا۔

''ساحل صاحب میں آپ کو ہر بات صاف صاف بتا دوں گا۔ میرے ہاتھ آزاد کروا دیں میں بہت تکلیف میں ہوں۔''

''اب آزادی کو بھول جا پہلے یہ بتا کہ تجھے یہاں بھیجا کس نے اور کیوں؟''

''مجھے یہاں برکھا دیوی نے بھیجا تھا' میں یہ تلوار چرانے آیا تھا۔''

''تو پھر لے جا چرا اس تلوار کو..... تلوار تیرے ہاتھوں میں ہے جا جلدی کر۔'' ساحل عمر طنزاً ہنسا۔

''مجھ سے غلطی ہو گئی' مجھے معاف کر دیں۔''

"معاف کیسے کر دوں...... تجھے یاد ہو گا تو مجھے نیم بے ہوشی کے عالم میں اغوا کر کے چڑ دبیل کے استھان پر لے گیا تھا۔ تو نے میری موت کا سامان کر دیا تھا۔"

"میں مجبور ہوں۔ برکھا دیوی کے ہر حکم کا پابند...... ان کی شکتی نے مجھے جکڑ رکھا ہے۔"

"اگر وہ اتنی شکتی والی ہے تو اسے آواز دے کر چھوٹ کیوں نہیں جاتا۔"

واسم نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ کیا جواب دیتا۔ اگر آزاد ہوتا اس کے اختیار میں ہوتا تو وہ کب کا یہاں سے جا چکا تھا۔

"اچھا ایک بات بتا...... دیکھ بالکل سچ سچ بتانا۔"

"میں ہر بات سچ بتاؤں گا...... آپ پوچھیں...... بس مجھے اس عذاب سے نجات دلوا دیں۔"

"کچھ عرصے پہلے کلفٹن کے پلے لینڈ سے ایک لڑکی اغوا ہوئی تھی جس کی لاش بعد میں جھاڑیوں سے ملی تھی۔ اس لڑکی کا اغوا بھی تو نے کیا تھا۔"

"ناصر مرزا کی بھتیجی کی بات کر رہے ہیں؟" واسم نے سوال کیا۔

"ہاں۔" ساحل عمر بولا۔

"اس لڑکی کے اغوا میں میں نے مدد کی تھی۔ اغوا میں نے نہیں کیا تھا۔ اغوا سوناں نے کیا تھا۔"

"یہ سوناں کون ہے؟"

"میری طرح وہ بھی برکھا دیوی کی چیلی ہے۔ ہم دونوں نے مل کر برکھا دیوی کیلئے بہت کام کئے ہیں۔"

"ناصر مرزا کی بھتیجی کو قتل کس نے کیا تھا؟"

"قتل میں نے نہیں کیا...... میں صرف اس کی لاش پھینکنے کا ذمہ دار ہوں۔"

"قتل کس نے کیا تھا؟" ساحل عمر نے غصے سے پوچھا۔

"وہ برکھا دیوی کے ہاتھوں مری۔"

"ٹھیک ہے، اب تم یہاں صبح تک آرام سے بیٹھو۔ چند گھنٹوں کی بات ہے۔ صبح تمہارا حساب کتاب ہو گا۔ حساب کتاب تو تمہارا اب بھی ہو سکتا ہے لیکن اتنی رات گئے میں ناصر مرزا کو پریشان نہیں کرنا چاہتا۔ تم ناصر مرزا کے مجرم ہو۔ تم میرے بھی مجرم ہو۔ تمہیں اب سزا بھگتنا ہو گی۔" یہ کہہ کر ساحل عمر واپس مڑا۔ اس نے پورے اطمینان سے گھر کا پچھلا دروازہ بند کیا اور اپنے بیڈ پر آ کر لیٹ گیا۔

دروازہ بند کرتے ہوئے اس نے اس کی فریاد سنی تھی۔ "ساحل عمر صاحب ایسا نہ کریں۔ مجھے معاف کر دیں۔ میں پھر کبھی......"

لیکن اس نے ایک مجرم کی فریاد پر کان نہیں دھرے تھے اور دروازہ دھاڑ سے بند کر دیا تھا۔ یہ تو حافظ موسیٰ کی مہربانی تھی ایک موذی اتنی آسانی سے ان کے چنگل میں پھنس گیا تھا۔

ساحل عمر پھر صبح تک چین سے سو نہ سکا۔ وہ وقفے وقفے سے اسے اٹھ کر دیکھتا رہا۔ اسے یہ

بھی خوف تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ کسی طرح اس کے ہاتھ آزاد ہو جائیں۔ توقع یہی تھی کہ اب وہ آزاد نہ ہو سکے گا۔ اگر آزاد ہونا ممکن ہوتا تو وہ تلوار کی گرفت میں ہی کیوں آتا۔ وہ جب بھی اسے اٹھ کر دیکھتا اسے کرب میں مبتلا پاتا۔ اب وہ تلوار کے دونوں طرف ٹانگیں پھیلا کر بیٹھ گیا تھا۔

صبح تڑکے ہی اس نے ناصر مرزا کو فون کیا۔ کافی دیر گھنٹی بجنے کے بعد اسے نیند میں ڈوبی ہوئی ناصر مرزا کی آواز سنائی دی۔ ''ہیلو کون؟''

''ناصر، میں ساحل بول رہا ہوں۔ بھائی حافظ موسیٰ نے تو کمال کر دیا۔''

''کیا ہوا؟'' ناصر مرزا ایک دم چونک کر بیٹھ گیا۔ ''کیا تم نے تلوار والا عمل کر دیا تھا۔''

''ہاں بھئی...... عمل بھی کر دیا تھا اور اس کا رزلٹ بھی فوری طور پر سامنے آ گیا۔ ایک چوہا پکڑا گیا۔'' ساحل عمر نے خوش ہو کر کہا۔

''چوہا پکڑا گیا...... کیا مطلب؟'' ناصر مرزا نے وضاحت چاہی۔

''بس تم فوراً آ جاؤ۔''

''میں ابھی آ جاتا ہوں...... لیکن کچھ بتاؤ تو۔''

''واسم تلوار چرانے آیا تھا۔ اس تلوار نے اس کے ہاتھ جکڑ لئے۔ جانتے ہو، یہ واسم کون ہے؟''

''برکھا کا کوئی بندہ ہو گا۔''

''ہاں، اس کا خاص آدمی ہے۔ میں نے اس سے بہت کچھ اگلوا لیا ہے۔ اسی خبیث نے تمہاری بھتیجی کو اغوا کیا تھا اور......''

''بس اتنا میرے لئے کافی ہے۔ میں فوراً آ رہا ہوں۔'' ناصر مرزا اس کی بات کاٹ کر بولا۔ ''تم ذرا اس کا خیال رکھنا دیکھو وہ بھاگنے نہ پائے۔''

پھر ناصر مرزا نے اس کا جواب سنے بغیر ٹیلی فون بند کر دیا۔

☆......☆......☆

برکھا اپنے کمرے میں بڑی بے چینی سے ٹہل رہی تھی۔ اس وقت دن کے بارہ بجے تھے لیکن واسم ابھی تک نہیں آیا تھا۔ ایسی کوتاہی تو اس سے کبھی نہیں ہوئی تھی۔ اگر کسی وجہ سے کام نہیں ہو سکا تھا تو وہ اسے ٹیلی فون ضرور کر دیتا...... وہ خود آیا نہ اس کا ٹیلی فون آیا تھا۔

''کہیں وہ پکڑا تو نہیں گیا؟''

یہ خیال کئی بار اس کے ذہن میں آیا تھا لیکن وہ اس خیال کو سختی سے ذہن سے جھٹک دیتی تھی۔ اس نے واسم کو جو منتر پڑھا کر بھیجا تھا وہ ایسا تھا کہ بغیر کسی کی نظروں میں آئے وہ پورے گھر میں گھوم سکتا تھا۔ دیکھے جانے کی صورت میں وہ منتر پڑھ کر دیکھنے والے کو وقتی طور پر اندھا کر سکتا تھا۔ اسے کوئی گرفت میں نہیں لے سکتا تھا لیکن برکھا کو یہ نہیں معلوم تھا کہ اس نے واسم کو جو چیز چرانے بھیجا ہے وہ دیوار پھلانگ کر اندر پہنچتے ہی ٹارچ کی روشنی میں خودبخود چمک اٹھے گی اور اتنی آسانی سے اس چیز کے مل جانے کی خوشی میں وہ لپک کر اس کا دستہ پکڑے گا اور کسی کی گرفت میں نہ آنے والا اس چیز

کی گرفت میں آ جائے گا۔ جسے وہ چرانے آیا تھا۔

وقت تیزی سے گزر رہا تھا اور برکھا کی بے قراری بڑھتی جا رہی تھی۔ اضطراری کیفیت میں وہ گھر کے گیٹ تک چلی گئی۔ گیٹ کھول کر وہ باہر نکلی اور اس نے یونہی دائیں بائیں سڑک کی طرف دیکھا۔

تب اس کی خوشی کا ٹھکانہ نہ رہا۔ واسم سامنے سے چلا آ رہا تھا۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھ پینٹ کی جیب میں ڈالے ہوئے تھے اور سر جھکائے برکھا کے گھر کی طرف بڑھ رہا تھا۔

پھر اس نے گیٹ کے نزدیک پہنچ کر برکھا پر ایک نظر ڈالی اور خاموشی سے گیٹ میں داخل ہو گیا۔ برکھا نے اس کو اندر جاتے ہوئے حیرت سے دیکھا۔ وہ جلدی سے اندر آئی اس نے پلٹ کر گیٹ بند کیا اور کسی قدر غصے سے پکاری۔ ''واسم۔''

واسم آگے جاتے جاتے ایک دم رک گیا۔

''کیا ہوا؟'' اس نے غصے سے پوچھا۔ ''تلوار کہاں ہے؟''

واسم نے جواب میں خاموشی سے اپنے دونوں ہاتھ جیب سے نکالے اور اس کے سامنے کر دیئے۔ جب برکھا کی نظر اس کے دونوں ہاتھوں پر پڑی تو وہ بے اختیار چیخ اٹھی۔

''نہیں۔''

☆......☆......☆

واسم کے دونوں ہاتھ کٹے ہوئے تھے۔ اس کے دونوں کٹے ہاتھوں پر پٹیاں بندھی تھیں۔

''تیرے ہاتھ کہاں غائب ہو گئے۔ یہ کیسے ہوا؟'' وہ پریشان ہو کر بولی۔ ''آ میرے ساتھ اندر آ۔''

وہ اسے اپنے بیڈ روم میں لے گئی اور ایک کرسی کی طرف اشارہ کر کے بولی۔ ''ہاں' اب بتا...... تیرے ہاتھ کیسے کٹے...... میں نے تو تجھے تلوار لینے بھیجا تھا۔''

''برکھا جی...... میں آپ کے حکم کے مطابق تلوار ہی لینے گیا تھا۔ میں ساحل عمر کے گھر میں جیسے ہی کودا اور ٹارچ کی روشنی راستہ دیکھنے کیلئے ادھر ادھر ڈالی تو وہ تلوار مجھے چمکتی ہوئی نظر آ گئی۔ وہ تلوار باہر ہی گھر کے پچھواڑے زمین میں دستے تک گڑھی ہوئی تھی۔ میں اسے دیکھ کر خوش ہو گیا کہ چلو کام آسان ہو گیا' ورنہ پورے گھر میں جانے کہاں کہاں تلاش کرنا پڑتا...... خیر میں نے جیسے ہی دونوں ہاتھوں نے اس کا دستہ پکڑ کر کھینچا وہ تلوار ٹس سے مس نہ ہوئی البتہ میرے ہاتھ دستے سے ضرور چپک گئے اور ہاتھوں میں سوئیاں سی چبھنے لگیں۔ تکلیف اتنی بڑھی کہ میرے منہ سے باوجود ضبط کے چیخیں نکلنے لگیں۔ میری چیخیں سن کر ساحل عمر باہر نکل کر آ گیا۔ وہ مجھے اس طرح شکنجے میں جکڑے دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ میں نے اس کی بہت خوشامد کی کہ وہ کسی طرح میرے ہاتھ آزاد کر دے مگر وہ منہ موڑ کر گھر میں چلا گیا اور پھر اس نے صبح تڑکے ہی ناصر مرزا کو بلا لیا۔ ناصر مرزا بہت غصے میں تھا۔ پہلے تو اس نے مجھے کئی ٹھوکریں ماریں...... پھر اپنے چاقو سے میرے دونوں ہاتھ کاٹ دیئے۔'' یہ کہہ کر واسم کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ وہ بھوں بھوں کر کے رونے لگا۔

''چپ ہو جا۔'' برکھا غصے سے چیخی۔ ''مرد ہو کر روتا ہے...... یہ بتا تو نے اسے کچھ بتایا تو نہیں۔''

''نہیں برکھا جی۔'' اس نے اپنی آستین سے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ ''مجھ سے قسم لے لیں۔ میں نے آپ کے بارے میں' اپنے بارے میں اور سوناں کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔'' اس نے سفید جھوٹ بولا۔

''یہ تو نے بہت اچھا کیا...... تجھ سے یہی امید تھی...... تو فکرمت کر میں ناصر مرزا سے ایسا انتقام لوں گی کہ وہ زندگی بھر یاد رکھے گا۔ اس نے تیرے ہاتھ کاٹے ہیں۔ میں اس کی آنکھیں نکال لوں گی۔'' برکھا نے تسلی دی۔

''ایک بات اور برکھا جی۔'' واسم نے جھجکتے ہوئے کہا۔ ''انہوں نے مجھ سے سوناں کو بھی فون کروایا تھا۔''

''فون؟'' برکھا اس طرح بولی جیسے کسی کا خون ہو گیا ہو۔ ''وہ لوگ سوناں کو کیا جانیں؟''

''ساحل عمر نے تو سوناں کو دیکھا ہے۔'' اس نے یاد دلایا۔

''واسم کیا وہ تیری موجودگی میں وہاں پہنچ گئی تھی۔'' برکھا نے پوچھا۔

''مجھے انہوں نے آزاد ہی اس وقت کیا جب وہ ان کے چنگل میں پھنس گئی۔

''اوہ اس نے ان کے سامنے سب اگل دیا ہو گا۔'' برکھا ایک دم فکرمند ہو گئی۔

''نہیں برکھا جی' سوناں اتنی کچی نہیں ہے۔ وہ ہرگز انہیں کچھ نہیں بتائے گی۔'' واسم نے جھوٹی تسلی دی۔

''یہ تو مجھے بساط ہی الٹتی نظر آ رہی ہے۔'' وہ جیسے اپنے آپ سے بولی۔

''واسم خاموش رہا۔''

''سوناں اس وقت کہاں ہو گی؟'' اس نے واسم سے سوال کیا۔

''کہیں انہوں نے اس کو پولیس کے حوالے نہ کر دیا ہو۔'' واسم نے اپنی رائے کا اظہار کیا۔

''اگر ایسا کر دیا ہو گا...... تو اچھا ہے ابھی پولیس سٹیشن سے فون آ جائے گا۔ وہ آدھا گھنٹے بھی پولیس کی تحویل میں نہیں رہے گی لیکن میں جانتی ہوں وہ ایسا ہرگز نہیں کریں گے۔ وہ پولیس میں میرے تعلقات سے اچھی طرح واقف ہیں۔ وہ اب دونوں ڈائریکٹ ایکشن کے قائل ہو گئے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے وہ اچھی طرح جان گئے ہیں کہ پولیس کبھی کسی مجرم کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔ اب سوناں کے بارے میں کیسے پتہ کروں...... تو اسے ان کے حوالے کر کے وہاں سے نکل آیا۔'' برکھا نے تاسف بھرے انداز میں کہا۔

برکھا کی اس بات پر واسم کو اندر ہی اندر بڑا غصہ آیا کہ ایک تو اس نے اپنے دونوں ہاتھ اس کیلئے کٹوا دیئے اب وہ سوناں کو بھی وہاں چھوڑ کر نہ آتا...... پھر تو وہاں سے اس کی لاش ہی آتی۔

اتنے میں کال بیل کی آواز سنائی دی۔ برکھا فوراً اٹھ گئی۔ وہ واسم کو بیٹھے رہنے کا اشارہ کر کے باہر نکل آئی۔ وہ تیزی سے چلتی ہوئی گیٹ تک پہنچی۔

"گیٹ کھولا تو سامنے سوناں نظر آئی۔ اس کے چہرے پر کرب کے آثار تھے اور اس کے دونوں ہاتھ پشت پر تھے۔

"سوناں اپنے ہاتھ میرے سامنے کر۔" برکھا نے عجیب سے لہجے میں کہا۔

سوناں نے خاموشی سے اپنے دونوں ہاتھ اس کے سامنے کر دیئے اور بے اختیار رو پڑی۔

اس کے دونوں ہاتھ کٹے ہوئے تھے اور دونوں کٹے ہاتھوں پر پٹیاں بندھی تھیں۔

"تیرے ہاتھ کس نے کاٹے؟" وہ ناگن کی طرح پھنکاری۔

"ناصر مرزا نے۔" سوناں روتے ہوئے بولی۔

"ناصر مرزا میں تجھے کچا چبا جاؤں گی۔" وہ انتہائی طیش میں چیخی۔

☆......☆......☆

اندھیری رات......رات کا پچھلا پہر...... ٹھنڈی سنسناتی ہوا' جھینگروں کا شور...... پیپل کی کھڑکھڑاہٹ' گلی میں بھونکتے کتے...... ان سب چیزوں نے مل کر برکھا کے بنگلے کو انتہائی بھیانک بنا دیا تھا۔

برکھا اپنے بنگلے کے پچھلے حصے میں پیپل کے درخت کے نیچے پانی بھرے حوض میں کھڑی تھی۔ اس کا آدھا جسم ٹھنڈے پانی کے اندر تھا اور آدھا باہر...... اس کے جسم پر کوئی کپڑا نہ تھا۔ وہ دونوں ہاتھ جوڑے' سر جھکائے کسی مجسمے کی طرح ساکت کھڑی تھی۔ اس کے ہونٹ ہل رہے تھے۔

حوض کے چاروں طرف اکیس دیئے روشن تھے۔ عمل کا وقت پورا ہو رہا تھا۔ آہستہ آہستہ سارے دیئے خود بخود بجھتے جا رہے تھے۔ بس تین دیئے جل رہے تھے۔ اب ان تینوں دیوں کو ایک ساتھ بجھنا تھا اور ان تینوں دیوں کے بجھتے ہی اغور کی سواری کو آنا تھا۔

اندھیری رات خوفناک ہوتی جا رہی تھی۔ جھینگروں کا شور مزید بڑھ گیا تھا۔ اڑتی ہوئی چمگادڑوں کی پھڑپھڑاہٹ مزید بڑھ گئی تھی۔ علاقے کے کتوں نے اور زور زور سے بھونکنا شروع کر دیا تھا۔ یہ سب علامتیں بتا رہی تھیں کہ وہ شیطان کا بیٹا اغور بس اب آیا ہی چاہتا ہے۔

پھر وہ منحوس گھڑی آ پہنچی جو برکھا کیلئے شبھ گھڑی تھی۔ تینوں دیئے بیک وقت بجھ گئے۔ چند لمحوں کیلئے مہیب سناٹا چھا گیا۔ ہوا جیسے ساکت ہو گئی۔ پیپل کے پتوں کی کھڑکھڑاہٹ بند ہو گئی۔

اس کی سواری آ پہنچی تھی۔ برکھا نے حوض کے کنارے رکھی ماچس سے جلدی جلدی سارے دیئے روشن کر دیئے اور جب اس نے سامنے نگاہ کی تو وہ شیطان کی اولاد اپنی سواری پر موجود تھا۔

اس کے سامنے ایک تین فٹ لمبی چھپکلی موجود تھی جس کی زبان باہر نکل رہی تھی اور چھپکلی کی گردن میں ایک سانپ رسی کی طرح بندھا تھا۔ اس سانپ کی دم اغور کے دونوں ہاتھوں میں تھی۔ یہ کوئی ڈیڑھ فٹ لمبا بچھو تھا۔ اس بچھو کی دم اٹھی ہوئی تھی اور اس کی دم کا آخری حصہ چمک رہا تھا۔ بالکل کسی جگنو کی طرح

"سواگتم مہاراج۔ سواگتم مہاراج۔" برکھا ہاتھ جوڑ کر آدھی جھکی۔

"کیا ہوا؟" اغور نے پوچھا۔

''مہاراج انکاریوں کی ستائی ہوئی ہوں۔ انہوں نے پریشان کر رکھا ہے۔'' برکھا روہانسی ہو کر بولی۔

''اتنی پاٹھ پوجا والی ہے...... اتنے جنتر منتر جانتی ہے اس کے باوجود تجھ سے دو انکاری قابو میں نہیں آ رہے۔''

''مہاراج وہ اکیلے نہیں ہیں۔ وہ اجالے والے ہیں۔ ان کے پیچھے روشنی ہے۔''

''ان کے پیچھے روشنی ہے تو تیرے پیچھے تاریکی ہے۔ رات ہے' اندھیرا ہے۔''

''ہاں' مہاراج اسی لئے تو میں نے اپنی تاریک طاقتوں کو آواز دی ہے۔ مہاراج آپ کو بلایا ہے۔''

''تو نے بلایا تو ہم آ گئے ہیں...... ہم سے جو ہو گا کریں گے۔ میں اپنے باپ سے مدد لوں گا۔ آخر کو تو اس کی چیلی ہے۔ تو نے جانے کتنے انکاریوں کو اقراری بنایا ہے۔ شیطان پرست بنایا ہے۔ تیری بڑی خدمات ہیں۔'' اعور نے اسے تعریفی نظروں سے کہا۔

''بس مہاراج یہ سب آپ کی نظر عنایت ہے۔'' وہ ممنون دکھائی دی۔

''ہماری جو منظور نظر تھی اسے تو وہ اس بستی سے نکال لایا۔ کیا تو جانتی ہے؟''

''ہاں جانتی ہوں مہاراج...... اس نے اس سے شادی کر لی ہے۔ وہ اب میرے کام کا نہیں رہا۔''

''تو وہ کون سی میرے کام کی رہی ہے؟'' اعور نے غصے سے کہا۔ ''تو جانتی ہو گی؟''

''ہاں مہاراج میں جانتی ہوں اب مسئلہ یہ ہے کہ میں اس کی ہتھیا کرنا چاہتی ہوں۔ میں نے اس پر کئی حملے کئے ہیں لیکن اس پر کوئی حملہ کارگر نہیں ہو پا رہا ہے۔ سونے پر سہاگہ یہ کہ اس نے میرے پیروکاروں کے ہاتھ کاٹ دیئے ہیں اس بات پر مجھے شدید غصہ ہے۔'' برکھا غصے سے کانپتی ہوئی بولی۔

''تو نہیں جانتی کہ اس نے میرے باپ کے ایک عظیم پیروکار کو جو صدیوں بعد جاگنے والا تھا صفحہ ہستی سے مٹا دیا ہے۔ میرے باپ کو اس بات پر کتنا غصہ ہو گا۔''

''میں نہیں جانتی۔'' برکھا ایک دم چونک کر بولی۔

''وہ کون تھا؟''

''وہ اپنے وقت کا بہت بڑا جادوگر تھا۔ میرے باپ کا دست و بازو تھا مگر وہ نہ رہا...... اب اس کی کھوپڑی جائے عبرت بنی اس بستی کے چوک میں لٹکی ہے۔ اس کا نام رائین تھا۔'' اعور نے بتایا۔

''اوہ...... مہاراج آپ نے بڑی زبردست بات بتائی...... میرا کام بن گیا۔''

''مہاراج مجھے اس عظیم جادوگر کی کھوپڑی بھجوا دیں...... پھر میں ان سارے انکاریوں کو دیکھ لوں گی۔ ایک ایک کر کے سب کے حساب چکا دوں گی۔''

''رائین کی کھوپڑی تجھے مل جائے گی۔ یہ کوئی مسئلہ نہیں اور بول۔''

''بس مہاراج آپ نے میرا جی خوش کر دیا۔ آپ میرے لئے حکم کریں۔''

"تو اپنی بیٹی کا حال بتا...... اسے بھی کچھ سکھا رہی ہے یا اسے ناواقف ہی رکھے گی۔"

"مہاراج وہ بڑے اڑیل مزاج کی ہے۔ اچھی خاصی چلتے چلتے رک جاتی ہے۔ میں نے اسے کافی کچھ سکھا دیا ہے لیکن وہ اس پر عمل نہیں کرتی۔ اسے مار مار کر چلانا پڑتا ہے۔" برکھا نے خفگی سے کہا۔

"اس کی خبر رکھ...... کہیں وہ انکاریوں میں سے نہ ہو جائے۔ تو جانتی ہے کہ بالآخر اس نے تیری جگہ آنا ہے۔"

"ہاں مہاراج جانتی ہوں۔ میری کوشش یہی ہے کہ اسے وہ سب کچھ سکھا دوں جو میں جانتی ہوں۔ اب آگے دیواہ کالی جو کرے۔"

"ٹھیک ہے...... اچھا اب میں چلتا ہوں۔ راعین کی کھوپڑی تجھے کل مل جائے گی۔ اب تو دیئے بجھا جلدی کر۔" اعور بولا۔

"اچھا مہاراج...... آپ کی بڑی مہربانی' آپ آ گئے۔" یہ کہہ کر اس نے دیئے کی لو پر ہاتھ رکھ کر تمام دیوں کو بجھا دیا۔ جب اس نے سامنے نظر کی جہاں اعور کی سواری تھی وہاں اب کچھ نہ تھا۔ اندھیرا تھا اور مہیب سناٹا۔

☆......☆......☆

دن کا اجالا پھیل چکا تھا۔ برکھا کے منحوس بنگلے پر اس کے باوجود وحشت برس رہی تھی۔ برکھا شیطان کے بیٹے اعور سے رات کو ملاقات کے بعد مدہوش سو رہی تھی۔

بیل کی آواز پر ورشا کی آنکھ کھلی۔ کوئی کافی دیر سے گھنٹی بجا رہا تھا۔ وقفے وقفے سے گھنٹی بجائی جا رہی تھی۔ ورشا فوراً اٹھ کر بیٹھ گئی۔ پھر وہ اپنے جسم پر کالی چادر ڈال کر دروازے سے باہر آ گئی۔ برآمدے میں کھڑے ہو کر اس نے باہر کا جائزہ لیا۔ برکھا کا دروازہ بند تھا۔ اس کا مطلب ہے کہ وہ رات کو جاگی تھی۔ اب پڑی سو رہی تھی۔

پھر وہ خود ہی گیٹ کی طرف بڑھی۔

گیٹ کھولنے سے پہلے اس نے حسب معمول گیٹ کے خلاء سے باہر جھانکا۔ اسے باہر کوئی نظر نہ آیا۔ تب اس نے زور سے پکار کر پوچھا۔ "کون ہے؟"

"برکھا دیوی ہیں جی؟" باہر سے ایک بھاری مردانہ آواز آئی۔

"آپ کون؟"

"میں جی برکھا دیوی کیلئے سوغات لایا ہوں۔" وہ گیٹ کے سامنے آتے ہوئے بولا۔

"وہ تو سو رہی ہیں۔" ورشا نے کسی کو سامنے پا کر خلا میں سے باہر جھانکا۔ وہ ایک اونچے قد کا گہرے سانولے رنگ کا اور مضبوط کاٹھی کا شخص تھا۔ اس کے چہرے سے خباثت ٹپک رہی تھی۔ اس کے ہاتھ میں ایک کالے چمڑے کا تھیلا لٹک رہا تھا۔

"کوئی بات نہیں۔ انہیں سونے دیں آپ ان کی چیز لے لیں۔"

"اچھا ایک منٹ ٹھہریں...... میں گیٹ کھولتی ہوں۔" ورشا نے کہا اور پھر گیٹ کھول کر

جھانکی۔

"یہ برکھا دیوی کو دے دیں۔" اس نے چمڑے کا تھیلا آگے بڑھایا۔

ورشا نے وہ چمڑے کا تھیلا تھام لیا اور اس سے پوچھا۔

"اس میں کیا ہے؟"

"اس میں اس کیلئے ایک قیمتی چیز ہے۔"

"آپ کون ہیں؟" ورشا نے سوال کیا۔ "آپ کا کیا نام ہے؟"

"میں بے نام ہوں جب وہ تھیلا کھول کر دیکھیں گی تو وہ سمجھ جائیں گی کہ یہ چیز کہاں سے آئی ہے اور کس نے بھیجی ہے۔" یہ کہہ کر وہ واپس پلٹا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا اس کی نظروں سے دور ہو گیا۔

ورشا نے فوراً گیٹ بند کر کے اس چمڑے کے تھیلے میں جھانکا۔ تھیلا کافی گہرا تھا۔ اس کی تہہ میں کپڑے میں لپٹی کوئی گول سی چیز نظر آئی۔

پتہ نہیں اس میں کیا ہے؟ یہ ممی روز نت نئی چیزیں منگواتی رہتی ہے۔ جانے یہ کہاں جا کر ٹھہرے گی اور کیا کر کے دم لے گی۔ ورشا کے لاشعور میں بچپن سے ہی اپنی ماں کیلئے نفرت تھی لیکن برکھا کا رویہ اس کے ساتھ بہت اچھا تھا اس لئے وہ نفرت دبی رہتی تھی۔ جب برکھا کے رویئے میں تبدیلی آتی یا وہ اس کی ساحرانہ حرکتوں سے اکتاتی تو وہ نفرت کی چنگاری آہستہ آہستہ سلگ اٹھتی۔

آج کل یہ نفرت بار بار اپنا سر اٹھا رہی تھی۔

"برکھا کے دروازے پر پہنچ کر اس نے آہستہ سے دستک دینا چاہی تو دروازہ تھوڑا سا اندر ہو گیا۔ دروازہ کھلا ہوا تھا۔ وہ کمرے میں داخل ہوئی۔ برکھا کچھ اس انداز سے سو رہی تھی کہ ورشا نے ایک لمحے کیلئے سوچا کہ واپس چلی جائے پھر اس نے پائنتی پڑا ہوا ہلکا سا کمبل برکھا کے جسم پر ڈال دیا۔

تب فوراً ہی برکھا کی آنکھ کھل گئی۔ ورشا کو اپنے کمرے میں دیکھ کر وہ جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گئی اور پھر بڑی بے نیازی سے اپنے گرد کمبل لپیٹ لیا۔ اسے دیکھ کر مسکرائی۔

"یہ کیا ہے؟" اچانک برکھا کی نظر ورشا کے ہاتھ میں لٹکے چمڑے کے تھیلے پر پڑی۔

"پتہ نہیں ممی۔" ورشا نے کہا۔ "ایک شخص آپ کیلئے دے گیا ہے۔"

برکھا نے جلدی سے اس سے وہ تھیلا لے لیا اور پھر اس نے تھیلے کے اندر جھانکا بڑی احتیاط سے کپڑے میں لپٹی چیز تھیلے سے باہر نکال لی۔ اس میں کوئی گول سی چیز سفید کپڑے کی پٹیوں میں لپٹی ہوئی تھی۔ اس نے ڈھونڈ کر پٹی کا سرا نکالا اور اس چیز کو بیڈ پر ڈال کر پٹی کھولنے لگی۔ وہ ایک ہی پٹی تھی اور اتنی لمبی تھی کہ برکھا کے بیڈ پر ایک اونچا ڈھیر بن گیا۔

پھر اس میں سے جو چیز برآمد ہوئی اسے دیکھ کر خوشی کے مارے برکھا کی چیخ نکل گئی۔ "زندہ باد مہاراج...... کالی دیواہ کے بیٹے زندہ باد۔"

"ممی یہ کیا ہے؟"

"یہ ایک بہت بڑے جادوگر کا سر ہے...... ورشا میں اب دیکھتی ہوں کہ میرا وار کیسے کارگر

نہیں ہوتا۔" یہ کہتے کہتے اس کی آنکھوں میں شیطانی چمک آ گئی اور چہرے سے خباثت ٹپکنے لگی۔ ایک بدبو کا بھپکا اس کے جسم سے پھوٹا جو ورشا کے لئے ناقابل برداشت ہو گیا۔ ورشا پھر وہاں نہ ٹھہر سکی۔

☆......☆......☆

ناصر مرزا شام کو اپنے دفتر سے آ کر تھوڑی دیر آرام کی خاطر لیٹ گیا تھا۔ ابھی اسے لیٹے زیادہ دیر نہ ہوئی تھی کہ اچانک اس کی نظر روشندان پر پڑی اور ایک بھیانک چیخ اس کے منہ سے نکلی۔ ناصر مرزا کی بیوی ساجدہ جو کچن میں چائے بنانے کی تیاریوں میں تھی اپنے شوہر کی چیخ سنی تو "اللہ رحم" کہتی ہوئی کمرے کی طرف بھاگی۔

جب وہ کمرے میں پہنچی تو ناصر مرزا کا حال دیکھ کر سہم گئی۔ ناصر مرزا جو اچھے تن و توش اور پروقار شخصیت کا مالک تھا اس وقت بیڈ کے کونے پر کسی چوہے کی طرح دبکا بیٹھا تھا اور وہ خوفزدہ آنکھوں سے روشندان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ساجدہ نے فوراً روشندان کی طرف دیکھا لیکن اسے وہاں کچھ نظر نہ آیا۔

"کیا ہوا؟" ساجدہ ایک دم اپنے شوہر سے لپٹ کر بولی۔

"وہ وہ۔" ناصر مرزا نے انتہائی خوفزدہ لہجے میں روشندان کی طرف اشارہ کیا۔

ساجدہ نے پھر روشندان کی طرف دیکھا لیکن اسے وہاں کچھ نظر نہ آیا۔

"وہاں کیا ہے ناصر؟" وہ پریشان ہو کر بولی۔

"وہ وہ مجھے مار دے گا۔" ناصر مرزا کی آواز کانپ رہی تھی خوف کے مارے۔

"اللہ...... ناصر آپ کو کیا ہو گیا ہے۔ آپ اتنے بہادر انسان اتنے ڈرپوک کیسے ہو گئے۔ ناصر وہاں کچھ نہیں ہے۔"

"میں ہوں آپ کے پاس...... آپ ڈریں نہیں۔" ساجدہ نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"ساجدہ مجھے کمبل اڑھا دو...... وہ مجھے گھور رہا ہے۔ وہ مجھے مار دے گا۔"

ساجدہ نے بغیر کچھ کہے ناصر مرزا کے اوپر کمبل ڈال دیا۔ اسے چاروں طرف سے اچھی طرح سے ڈھک دیا۔ تب ناصر مرزا جو بیڈ کے ایک کونے پر ڈرا سہا بیٹھا تھا آہستہ آہستہ بیڈ پر نیم دراز ہوتا گیا۔ پھر اس پر غشی طاری ہو گئی اور وہ لمبے لمبے سانس لینے لگا۔

ساجدہ گھبرائی ہوئی کمرے سے نکلی۔ وہ سیدھی ناصر مرزا کی امی کے ہاں پہنچی۔ وہ ابھی عصر کی نماز سے فارغ ہوئی تھیں۔ وہ ایک بزرگ خاتون تھیں۔ نمازی پرہیزگار۔ انہوں نے جب ناصر مرزا کا حال سنا تو فوراً ماتھا ٹھنکا۔ وہ فوراً چوکی سے اٹھیں اور چپل پاؤں میں ڈال کر ساجدہ کے ساتھ ہو لیں۔

کمرے میں آ کر ناصر کی امی نے کمبل اتار کر ناصر مرزا کا چہرہ دیکھا۔ وہ بے ہوشی کے عالم میں پڑا لمبے لمبے سانس لے رہا تھا۔ امی نے پیشانی پر ہاتھ رکھ کر آہستہ سے پکارا۔ "ناصر بیٹے ناصر۔"

ناصر نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس کی پیشانی تپ رہی تھی۔

"ساجدہ اسے تو تیز بخار ہے۔" امی نے اس کی پیشانی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

''امی' کیا کروں؟ ڈاکٹر کو بلواؤں۔''

''ذاکر ہے گھر میں؟''

''جی امی۔''

''پھر اس کو کہہ دو۔''

اتنے میں گھر میں موجود ہر فرد کو ناصر مرزا کے بارے میں پتہ چل گیا۔ سب آناً فاناً اس کے کمرے میں اکٹھا ہو گئے۔ ان میں ناصر مرزا کا چھوٹا بھائی ذاکر مرزا بھی تھا۔

امی نے اسے فوراً ڈاکٹر کو لانے کیلئے دوڑایا۔ پڑوس میں ڈاکٹر کا کلینک تھا۔ گھر میں کلینک تھا۔ کلینک ابھی بند تھا۔ ناصر مرزا کی طبیعت کی خرابی کا سن کر وہ فوراً اپنا بیگ اٹھا کر ذاکر کے ساتھ چلا آیا۔

اس نے ناصر مرزا کا اچھی طرح معائنہ کیا۔ ناصر مرزا کو ایک سو پانچ درجے بخار تھا۔ اس پر غشی بدستور طاری تھی۔ ڈاکٹر نے ایک انجکشن لگایا اور ٹھنڈے پانی کی پٹیاں رکھنے کی ہدایت کی اور نسخہ لکھ کر اور تسلی دے کر چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد ساجدہ نے اس کی پیشانی پر ٹھنڈے پانی کی پٹیاں رکھنی شروع کیں۔

انجکشن اور ٹھنڈے پانی کی پٹیوں نے اپنا اثر دکھایا۔ اس کا بخار کم ہوا۔ غشی کی کیفیت میں افاقہ ہوا۔ اس نے کچھ دیر کے بعد آنکھیں کھول دیں۔ اس نے پورے گھر کو اپنے بیڈ کے گرد موجود پایا۔ اس نے مسکرا کر سب کو دیکھا اور یہ ظاہر کرنا چاہا کہ وہ بالکل ٹھیک ہے۔

''ناصر بیٹے کیسے ہو؟'' اس کی امی نے اسے محبت بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''ٹھیک ہوں امی...... فکر کرنے کی کوئی بات نہیں۔'' ناصر مرزا نے اٹھتے ہوئے کہا۔ وہ بیڈ سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔

ساجدہ نے اسے فوراً دوا کھلائی۔ ناصر مرزا نے دوا کھانے کے بعد کہا۔ ''ساجدہ ذرا میرا چاقو مجھے دے دو۔ میرے بیگ میں ہوگا۔''

''اچھا ابھی لائی۔'' ساجدہ یہ کہہ کر کمرے سے نکل گئی۔

''یہ سب کیا ہے؟'' امی نے ناصر مرزا سے پوچھا۔ ''تم کس چیز سے ڈر گئے تھے؟''

''کسی چیز سے نہیں۔'' ناصر مرزا نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''امی ساجدہ نے پتہ نہیں آپ کو کیا کہہ دیا ہے۔''

''میں نے جو دیکھا اور سنا وہ امی سے کہا...... اور کچھ نہیں...... یہ لیجئے اپنا چاقو۔'' ساجدہ نے کمرے میں آ کر چاقو اس کی طرف بڑھایا۔

ناصر مرزا نے خاموشی سے چاقو اپنے ہاتھ میں لے کر اسے اپنے تکیے کے نیچے رکھ لیا اور ساجدہ سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''ساجدہ ایک کام کرو...... ذرا ساحل عمر کو فون کر دو...... اس سے کہنا کہ رات کو عذرا کو لے کر ادھر آ جائے۔ کھانا یہیں کھا لے۔ اس کے علاوہ اس کو کچھ اور نہ بتانا۔''

''جی اچھا۔'' ساجدہ نے کہا اور فون کرنے کمرے سے باہر نکل گئی۔

ساجدہ کے جاتے ہی اس کی حالت پھر بگڑنے لگی۔ اس نے اپنے جسم میں ایک خوف کی سی لہر محسوس کی۔ خود بخود اس کی نظریں روشندان کی طرف اٹھ گئیں۔ وہ وہاں موجود تھا۔ اس کو دیکھتے ہی ناصر مرزا کی گھگھی بندھ گئی۔ ناصر مرزا نے تکیے کے نیچے رکھا اپنا چاقو نکالا اسے جلدی سے کھولا۔ اس نے چاقو والا ہاتھ اٹھا کر کچھ کرنا چاہا...... لیکن اس کا ہاتھ ایک دم بے جان ہو گیا۔ چاقو انگلیوں سے نکل گیا۔ اس کے ہاتھ پاؤں مڑنے لگے اور پھر اس نے کسی خوفزدہ بچے کی طرح اپنی امی کی گود میں منہ چھپالیا۔ ”امی۔“

”کیا ہوا...... کیا ہوا میرے بچے؟“ وہ ایک دم گھبرا کر بولیں۔

”امی۔ امی...... وہ پھر آ گیا۔ مجھے بچالیں...... وہ مجھے مار دے گا۔“

”ارے کون ہے وہ کمینہ...... مجھے بتا تو وہ کدھر ہے۔“

ناصر مرزا نے اپنا چھپا ہوا منہ اپنی ماں کی گود سے اٹھایا اور خوفزدہ نظروں سے روشندان کی طرف دیکھا۔ ”وہ امی وہ ہے...... وہاں۔“

”بچو تم لوگ چلو یہاں سے۔“ امی نے ناصر مرزا کے بچوں اور اپنی چھوٹی بیٹی کی طرف دیکھا۔

امی کی ہدایت پر وہ فوراً چلے گئے۔ اب کمرے میں صرف ذاکر رہ گیا۔ چند لمحوں کے بعد ساجدہ بھی آ گئی۔ ”کیا ہوا؟“

”پھر سے وہی کیفیت ہو گئی ہے۔“ امی نے ساجدہ کو بتایا۔

”یا اللہ رحم۔“ ساجدہ کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

ناصر مرزا کی امی نے روشندان کی جانب دیکھا۔ وہاں انہیں کچھ نظر نہیں آیا۔ انہوں نے دو ٹوک لہجے میں کہا۔ ”ناصر وہاں تو کچھ نہیں ہے۔“

”امی ہے...... آپ نہیں جانتیں...... وہ وہیں چھپا بیٹھا ہے۔“

”ناصر یہ آپ کو کیا ہو گیا ہے۔ ذرا اپنے آپ کو سنبھالیں۔“ ساجدہ نے اس کی ہمت بندھانے کی کوشش کی۔

”امی میرے اوپر کمبل ڈال دیں۔“ ناصر مرزا بولا۔

ساجدہ نے کمبل اٹھا کر ناصر مرزا کے اوپر ڈال دیا۔ ناصر مرزا کا سر ابھی امی کی گود میں تھا اور اس کے دونوں گھٹنے پیٹ سے لگے ہوئے تھے۔ وہ گٹھری بنا پڑا تھا۔ پھر آہستہ آہستہ اس کے ہاتھ پاؤں کھلنے لگے۔ اس کے ساتھ ہی اس پر غشی کی سی کیفیت طاری ہونے لگی اور وہ لمبے لمبے بے ترتیب سانس لینے لگا۔

سات بجے کے قریب ساحل عمر عذرا کو ساتھ لے کر آ پہنچا۔ ساجدہ نے ناصر مرزا کی ہدایت کے مطابق اسے کچھ نہیں بتایا تھا لہٰذا وہ بڑا خوش خوش گھر میں داخل ہوا تھا۔ یہاں آ کر اسے گھر کا نقشہ ہی مختلف نظر آیا۔ جسے دیکھا اس کے چہرے پر پریشانی نظر آئی۔

جب وہ ناصر مرزا کے بیڈ روم میں داخل ہوا تو ناصر مرزا کی حالت دیکھ کر ایک لمحے کو کانپ

گیا۔ دو اڑھائی گھنٹوں میں اس کے چہرے کی رنگت بدل چکی تھی۔ وہ عجب انداز سے آنکھیں بند کیے لمبے لمبے سانس لے رہا تھا۔

ساجدہ اور امی نے ناصر مرزا کے بارے میں پوری کیفیت بتائی۔ سارا حال سن کر ساحل عمر نے گہرا اور ٹھنڈا سانس لیا پھر بولا۔ ''اوہ...... یہ تو بہت برا ہوا...... اس کا جادو چل گیا۔''

''اب کیا ہوگا؟'' امی گھبرا کر بولیں۔ ''کسی عامل کو بلاؤ...... اس جادو کا توڑ کرو۔''

ساحل عمر نے ہاتھ پر بندھی گھڑی پر نظر کی۔ سوا سات بج رہے تھے۔ اسے فوراً حافظ موسیٰ کا خیال آیا۔ اس نے سوچا کہ وہ ان کے پاس جائے۔ پتہ نہیں وہ رات کو ملنا پسند کریں گے یا نہیں کیونکہ مرزا جب بھی ان کے پاس گیا دن کی روشنی میں گیا تھا۔ اس نے سوچا کہ صبح تک انتظار کرنا پڑے گا۔

وہ چاہتا تھا کہ ناصر مرزا کو کچھ ہوش آ جائے تو اس سے بھی اس مسئلے پر بات کرے۔ اس کی پیشانی گرم ہو چکی تھی۔ ساجدہ نے اس کی پیشانی پر ٹھنڈے پانی کی پٹیاں رکھنا شروع کر دی تھیں۔ پٹیاں رکھتے رکھتے اچانک ساجدہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ وہ اپنے شوہر کی اس حالت پر بے اختیار رو پڑی۔

عذرا نے فوراً ساجدہ کا ہاتھ پکڑا اور اسے کمرے سے باہر لے گئی۔

پٹیاں رکھنے کا کام خود ساحل عمر نے سنبھال لیا۔ امی اسے پٹیاں بھگو بھگو کر دیتی جا رہی تھیں۔

تھوڑی دیر کے بعد ناصر مرزا نے اچانک آنکھیں کھول دیں۔

''کیسے ہو ناصر؟'' ساحل عمر نے بہت محبت سے پوچھا۔

''معاملہ بہت گڑبڑ ہے۔ تم صبح ہی حافظ موسیٰ کے پاس جاؤ۔'' اس نے بلا تمہید ہدایت کی۔

''وہ تو میں چلا جاؤں گا لیکن تم یہ بتاؤ کہ تمہیں روشندان پر کیا دکھائی دیتا ہے۔'' ساحل عمر نے پوچھا۔

''کچھ نہیں۔'' ناصر مرزا نے اسے وحشت بھری نظروں سے دیکھا جیسے وہ کچھ بتاتے ہوئے ڈرتا ہو۔

''ناصر گھبراؤ مت...... پوری بات بتاؤ تاکہ میں حافظ موسیٰ کو تفصیل سے بتا سکوں۔'' ساحل عمر نے کہا۔

''اوہ یار یہ کیا ہو رہا ہے۔'' ساحل کے چہرے پر اچانک کرب کے آثار دکھائی دینے لگے۔ وہ بے چین ہو کر ادھر ادھر کروٹیں لینے لگا۔

''کیا ہوا؟'' ساحل عمر نے اس کی بدلتی کیفیت دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''ایسا محسوس ہو رہا ہے جیسے کوئی نوکیلے اور تیز ناخنوں سے میرا جسم چھیل رہا ہو۔ اوہ۔'' اس نے کراہ کر اپنے بازو پر ہاتھ رکھا۔

ساحل عمر نے فوراً اس کی آستین کا بٹن کھول کر قمیض کی آستین بازو تک چڑھائی۔ تب اس

پر عجیب انکشاف ہوا۔ اس کے بازو پر کھرونچے سے ہلکا ہلکا خون رس رہا تھا۔
پھر اس طرح کے نشانات بہت تیزی سے اس کے جسم کے ہر حصے پر نمودار ہوتے گئے۔ اس کا پورا جسم پنجہ مارنے کے نشانات سے بھر گیا۔ وہ بری طرح تڑپنے لگا۔ ان کھرونچے کے نشانات میں سخت جلن ہو رہی تھی۔

''ساحل...... میرا چاقو پانی میں بھگو کر ان نشانات پر رکھو۔'' ناصر مرزا نے بمشکل اسے ہدایت کی۔ اس سے بولا نہیں جا رہا تھا۔

ناصر مرزا کی امی جس پانی میں پٹیاں بھگو بھگو کر ساحل عمر کو دے رہی تھیں وہ پیالہ سائیڈ ٹیبل پر رکھا تھا۔ ساحل عمر نے چاقو اٹھا کر پانی میں ڈالا اور بھیگا ہوا چاقو نشانات پر پھیرتے ہی وہ فوراً معدوم ہونے لگے۔ تب ساحل عمر نے جلدی جلدی اس عمل کو دوسرے نشانات پر دہرانا شروع کیا۔ اس طرح اس نے منٹوں سیکنڈوں میں پورے بازو پر بنے پنجے کے نشانات کو مٹا دیا۔ ایک بازو چھوڑ کر ابھی ساحل عمر دوسرے بازو پر بھیگا چاقو پھیر رہا تھا کہ پہلے بازو پر پھر سے وہ نشانات ابھرنے لگے۔

بس پھر یہی ہوتا رہا کہ وہ جلدی جلدی چاقو کے ذریعے ان کھرونچوں کو مٹاتا اور پھر وہ کچھ دیر کے بعد اسی جگہ نمودار ہو جاتے۔

ساحل عمر رات کے ساڑھے بارے بجے تک ناصر مرزا کے گھر رہا۔ جب تک وہ رہا یہی تماشا چلتا رہا۔ ناصر کی امی نے ساحل عمر کو زبردستی اپنے گھر بھیج دیا کہ خاصی رات ہو چکی تھی پھر انہوں نے خود اس چاقو کو سنبھال لیا۔

☆......☆......☆

حافظ موسیٰ اپنی لاٹھی دونوں ہاتھوں سے تھامے اس میں بنی آنکھ پر اپنی بے نور آنکھ رکھے بیٹھے تھے۔ ساحل عمر پالتی کی طرف بیٹھا انہیں بغور دیکھ رہا تھا۔ وہ ناصر مرزا کے بارے میں سب کچھ تفصیل سے بتا چکا تھا۔

چند منٹوں کے بعد حافظ موسیٰ نے اپنی آنکھ لاٹھی سے ہٹائی اور پھر گردن اٹھائے اپنی بے نور آنکھوں سے آسمان کی طرف دیکھتے رہے پھر گویا ہوئے۔

''اس مرتبہ سفلی والی نے بڑا پکا کام کیا ہے۔ ناصر مرزا کی زندگی شدید خطرے میں ہے۔ اس کے بچنے کے امکانات برائے نام ہیں۔''

حافظ موسیٰ کی زبان سے ایسی مایوس کن بات سن کر ساحل عمر کے چھکے چھوٹ گئے۔ ناصر مرزا اس کا بہت پیارا دوست تھا۔ اس کی جدائی کے تصور سے ہی اس کی روح کانپ اٹھی تھی۔

''حافظ صاحب...... ایسا نہ کہیں۔ آخر اس جادو کا کوئی توڑ تو ہوگا۔ مجھے بتائیں۔ اگر میرے کرنے کا کوئی عمل ہے تو میں کر گزروں گا۔ اگر آپ کے کرنے کا کوئی کام ہے تو میں آپ سے درخواست کروں گا کہ آپ ان شیطانوں کے بیچ ہمیں تنہا نہ چھوڑیں۔'' ساحل عمر نے بڑی عاجزانہ درخواست کی۔

حافظ موسیٰ کچھ نہ بولے۔ سر جھکا کر لاٹھی پیشانی سے لگالی جیسے مراقبے میں چلے گئے ہوں۔

کچھ دیر کے بعد انہوں نے سر اٹھایا اور بولے۔ ''اب جاؤ...... شام کو چار بجے میرے پاس آنا...... اللہ اپنا فضل کرے گا۔''

حافظ موسیٰ کی بات سن کر ایک آس بندھی' ایک امید کی کرن دکھائی دی۔

''بہت بہتر۔'' ساحل عمر نے بڑے مودبانہ انداز میں کہا اور ان کے گھر سے چلا آیا۔

☆......☆......☆

ورشا ابھی کچن میں جانے کا سوچ ہی رہی تھی کہ اچانک اس کے کمرے کا دروازہ کھلا اور برکھا اندر داخل ہوئی۔ اس کے چہرے پر مسکراہٹ سجی تھی۔ اگر برکھا کے ہونٹوں پر مسکراہٹ نہ بھی ہوتی تب بھی ورشا اس کے ہاتھوں میں ناشتے کی ٹرے دیکھ کر اندازہ لگا لیتی کہ اس کی ماں آج بہت خوش ہے۔

''آج میری ممی بہت خوش نظر آرہی ہے...... خیر تو ہے۔'' ورشا نے اپنی ماں کو ترچھی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ اس نے اس کے ہاتھ سے ٹرے لےکر بیڈ پر رکھ دی۔

''ہاں' میری جان' آج میں بہت خوش ہوں...... ناصر مرزا کو تو میں نے ٹھکانے لگا دیا۔'' وہ بیڈ پر بیٹھتے ہوئے بولی۔

''کیا وہ مر گیا؟'' ورشا نے پوچھا۔

''مرا تو نہیں لیکن میں نے اس کی موت میں کوئی کسر نہیں چھوڑی ہے۔ اس کی موت یقینی ہے۔ بس چند گھنٹوں کا معاملہ ہے۔'' برکھا نے بہت خوش ہو کر بتایا۔ ''اس کے بعد ساحل عمر کا نمبر ہے۔ ورشا آج کی رات بہت اہم ہے۔ یہ فیصلے کی رات ہے۔ ناشتے کے بعد میں منتر والے کمرے میں چلی جاؤں گی۔ آج رات ٹھیک بارہ بجے میرا عمل پورا ہو جائے گا۔ عمل پورا ہوتے ہی اس مہان جادوگر راعین کی کھوپڑی حرکت میں آ جائے گی۔ بارہ بج کر پانچ منٹ پر ساحل عمر جہاں بھی ہوگا میرے اس وار سے بچ نہیں سکے گا۔ میں اس کے اندر آگ لگا دوں گی۔ وہ اپنے کپڑے پھاڑ کر گھر سے باہر نکل آئے گا۔ اس کا دماغ الٹ جائے گا۔ اس کی آنکھوں سے ہر پہچان مٹ جائے گی۔ اس کے دماغ سے ہر یاد مٹ جائے گی۔ بس ایک آگ ہوگی جو اس کے بدن میں لگی ہوگی۔ وہ سڑکوں پر بے لباس چیختا پھرے گا۔ وہ یہاں بھی آئے گا۔ میں اور تم اس کا تماشا دیکھیں گے۔

تیرہ دن تک اس کی یہی حالت رہے گی پھر تیرہویں دن وہ سمندر کی طرف رخ کرے گا۔ اس کے اندر کی آگ کو صرف سمندر بجھا سکے گا اور جب وہ سمندر میں دور تک چلا جائے گا تو سمندر کی ایک بڑی لہر اسے اپنے ساتھ بہا لے جائے گی۔ اس کے اندر کی آگ تو بجھ جائے گی لیکن ساتھ ہی اس کی زندگی کا چراغ بھی بجھ جائے گا۔'' یہ کہہ کر وہ زور سے ہنسی اور ہنستی چلی گئی۔ ''وہ مر جائے گا...... وہ مر جائے گا...... ہاہاہا......''

''ممی چائے پیو۔'' ورشا نے اس کی طرف چائے سے بھرا کپ بڑھاتے ہوئے کہا۔

''لا۔'' برکھا نے اپنا ہاتھ بڑھایا۔ ''چائے پلا...... شراب پلا یا خون پلا...... جو تیری مرضی میں آئے پلا۔ آج میں بہت خوش ہوں...... اور ہاں۔'' اچانک برکھا کو کچھ یاد آیا۔

ورشا نے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ ''جی ممی۔''

''ذرا میرا خیال رکھنا...... دروازہ کھلا ہوگا۔ ادھر کا چکر لگاتی رہنا۔ شاید مجھے تمہاری ضرورت پڑ جائے۔'' برکھا نے ہدایت کی۔

''اچھا' ممی ٹھیک ہے۔'' ورشا نے فرمانبرداری سے کہا۔

پھر جب برکھا ناشتے کے خالی برتن لے کر چلی گئی تو ورشا کے دل کو جیسے کسی نے جکڑ لیا۔ اس کے دل پر اداسی کے بادل چھا گئے۔ اس نے اپنے کمرے کا دروازہ بند کیا اور بیڈ پر لیٹنے کیلئے واپس پلٹی تو اس نے بیڈ پر اپنے نانا کالی داس کو بیٹھے دیکھا۔ وہ بڑی محبت سے اسے دیکھ رہا تھا۔ کالی داس متعدد بار اس کے سامنے ظاہر ہو چکا تھا۔ اس سے باتیں کر چکا تھا۔ اسے بہت کچھ سمجھا چکا تھا۔

''نانا یہ کیا ہو رہا ہے؟'' وہ پریشان ہو کر بولی۔

''اس نے جیسا کہا ہے' ویسا ہی ہوگا...... یہ عمل بہت خطرناک ہے اس کا کوئی توڑ نہیں۔'' کالی داس نے اسے مزید مایوس کر دیا۔

''نانا وہ ساحل عمر کو مار دے گی۔''

''تو مار دے تجھے کیا پریشانی ہے؟''

''نانا' آپ نہیں جانتے میں ساحل عمر سے محبت کرتی ہوں۔ میں اسے نہیں مرنے دوں گی۔ چاہے کچھ ہو جائے۔'' ورشا کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔

''اوہ بالآخر تو بھی برکھا ہی نکلی۔'' کالی داس نے اسے غصیلی نگاہوں سے دیکھا۔

☆......☆......☆

''ہاں نانا...... آپ مجھے برکھا ہی سمجھ لیں۔'' ورشا نے بڑے اعتماد سے کہا اس نے کالی داس کے غصے کی پروانہ کی۔

''برکھا' بہت کچھ جانتی تھی...... اسے میں نے اپنا سارافن سکھا دیا تھا۔'' ورشا نے گردن اکڑا کر کہا۔

''تو نہیں جانتی' وہ شیر کی خالہ ہے۔ اس نے ایک داؤ بچا کر رکھا ہے۔'' کالی داس نے اسے ورغلایا۔

''نانا پھر تم کس مرض کی دوا ہو...... مجھے وہ آخری داؤ بتا دو۔'' ورشا نے خوشامدی لہجے میں کہا۔

''بتا دوں گا...... پریشان مت ہو...... تجھے بہت کچھ سکھا دوں گا۔ آخر میں تیرے پاس آیا کس لئے ہوں۔ میری روح انتقام کی آگ میں جل رہی ہے۔ یہی وہ موقع ہے جب میں اس خودغرض کمینی اولاد سے بدلا لے سکتا ہوں۔ چل میری بچی۔ شروع ہو جا...... تک دھم دھم...... دھم دھم تک...... واہ کالی...... دیواہ کالی واہ۔''

ورشا اس وقت شلوار قمیض میں تھی' دوپٹہ گلے میں پڑا ہوا تھا۔ اس نے دوپٹہ گلے سے کھینچا اور کمر کے گرد باندھ کر شروع ہو گئی۔

''تک دھم دھم...... دھم دھم تک...... واہ کالی...... دیواہ کالی واہ......''

☆......☆......☆

شام چار بجے جب وہ حافظ موسیٰ کے گھر پہنچا تو وہ اس کے منتظر تھے۔ اس کی آہٹ سنتے ہی بولے۔ ''اب کیا حال ہے ناصر مرزا کا؟''

''اسے کسی کروٹ چین نہیں...... جسم پر جگہ جگہ ناخنوں کے نشان بن رہے ہیں البتہ اب وہ روشندان کی طرف دیکھ کر ڈرتا نہیں۔'' ساحل عمر نے اس کی کیفیت بیان کی۔

''میں اس طرح کے مسائل میں آج تک نہیں الجھا...... میں ایک گوشہ نشین انسان ہوں مجھے اس طرح کی فضولیات سے کیا سروکار بہرحال میں نے تمہیں چار بجے آنے کو کہہ دیا تھا اور تم ٹھیک وقت پر پہنچ بھی گئے ہو تو میری بات اچھی طرح سمجھ لو۔ غور سے سن لو۔ تم ناصر مرزا کے گھر جا کر اس کا بستر اچھی طرح جھڑوانا...... جب بستر جھاڑا جائے تو تمہیں بستر میں سے ایک باز کا کٹا ہوا پنجہ ملے گا۔

اسے اٹھا کر چھت پر لے جانا۔" یہ کہہ کر انہوں نے توقف کیا اور اپنا رخ بائیں جانب موڑا۔
ساحل عمر نے دیکھا کہ پلنگ پر سوکھے پتوں کا ایک ڈھیر ہے۔
پھر انہوں نے اس ڈھیر کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ "یہ سوکھے پتے اپنی جیبوں میں بھر لو جب تم چھت پر پہنچ جاؤ تو ان پتوں کو چھت کے ایک کونے میں اکٹھا کر دینا۔ اوپر اپنے ساتھ ماچس لے کر جانا اور اکیلے جانا اور نیچے سب لوگوں کو منع کر کے آنا کہ جب تک تم اوپر ہو کوئی اوپر آنے کی کوشش نہ کرے۔"
"جی ٹھیک ہے۔" ساحل عمر نے جواب دیا۔
"اس سفلی والی نے بڑا خطرناک عمل کیا ہے۔ مجھے بہت محنت کرنا پڑی۔ بہر حال اس پر اللہ کا فضل ہو گیا ہے۔ جب تم اوپر پہنچو تو تمہیں پانی کی ٹنکی دکھائی دے گی۔ اس پر چڑھ جانا۔ پھر وہاں تمہیں فساد کی جڑ دکھائی دے گی۔ اسے وہاں سے اٹھا کر نیچے لے آنا۔ اب میری بات بہت توجہ سے سنو۔ ذرا سی غلطی تمہیں مشکل میں پھنسا سکتی ہے۔" یہ کہہ کر وہ کچھ دیر کیلئے خاموش ہو گئے۔
پھر انہوں نے لاٹھی میں بنی آنکھ سے اپنی بے نور آنکھ لگا لی اور اسے سمجھانا شروع کیا۔

☆......☆......☆

ساحل عمر گاڑی بہت تیزی سے بھگا رہا تھا۔ اسے ناصر مرزا کے گھر پہنچنے کی جلدی تھی۔
حافظ موسیٰ نے اسے جو کچھ بتایا جو کچھ سمجھایا اور جو کچھ پڑھنے کو کہا تھا وہ بار بار اسے دہرا رہا تھا۔ وہ حافظ موسیٰ کا بہت مشکور تھا کہ انہوں نے بڑے آڑے وقت میں اس کی مدد کی تھی۔ برکھا نے ناصر مرزا کے مارنے میں کوئی کسر باقی نہ چھوڑی تھی۔ کوئی بڑے سے بڑا عامل بھی اس سحر کا توڑ نہیں کر سکتا تھا۔ وہ تو حافظ موسیٰ کی نظر کرم ہو گئی ورنہ ناصر مرزا گیا تھا کام سے...... حافظ موسیٰ جیسے درویش انسان کو جادو ٹونے اور عملیات سے کیا واسطہ...... اگر وہ ان چکروں میں پڑ جاتے تو پھر انہیں کون گوشہ نشین رہنے دیتا...... البتہ ساحل عمر پر وہ خاص مہربان تھے۔ اس کی حفاظت کیلئے انہوں نے بہت کچھ کیا تھا۔ ورنہ برکھا، چترو بھیل اور راعین جیسے شیطان صفت لوگ اسے کب کا چٹ کر جاتے۔
حافظ موسیٰ کیونکہ اللہ لوگ تھے اس لئے وہ نہیں چاہتے تھے کہ ساحل عمر طاغوتی طاقتوں کے فریب میں آ جائے۔ وہ اس پر قابض ہو جائیں اور اس کے ذریعے اپنی قوت بڑھا کر انسانوں کی ایذا رسانی کا مزید سامان بن جائیں۔
ساحل عمر ناصر مرزا کے گھر پہنچا تو سب لوگ اس کا بے چینی سے انتظار کر رہے تھے۔ ناصر مرزا کی وہی کیفیت تھی۔ وہ جیسے بستر کے بجائے کانٹوں پر لوٹ رہا تھا۔ اسے کسی کروٹ چین نہ تھا۔ اس کے جسم پر رہ رہ کر گھر ونچے بن رہے تھے۔ ساحل عمر نے ناصر مرزا کے کمرے سے سب کو نکل جانے کو کہا۔
جب ناصر مرزا کا چھوٹا بھائی ذاکر جانے لگا تو اس نے اسے روک لیا۔ "ذاکر تم ٹھہرو۔"
کمرہ خالی ہو گیا تو ساحل عمر نے دروازہ بند کرنے کو کہا۔ ذاکر نے دروازہ بند کر دیا۔ ناصر مرزا ساحل عمر کو سوالیہ نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ وہ اس سے پوچھنا چاہ رہا تھا کہ حافظ موسیٰ نے اس کے

بارے میں کیا کہا لیکن ساحل عمر اپنے کام میں لگا ہوا تھا۔ وہ اس سے سوال نہ کر پایا۔

ساحل نے جیب سے ایک نیم کا سوکھا پتا نکال کر پانی سے بھرے گلاس میں ڈال دیا پھر اس نے حافظ موسیٰ کی ہدایت کے مطابق اس پر کچھ پڑھا اور گلاس ناصر مرزا کے منہ سے لگا دیا۔ ناصر مرزا نے غٹ غٹ کر کے سارا پانی پی لیا۔ پتا گلاس میں رہ گیا۔ پانی پیتے ہی جسم میں ایک ٹھنڈک کا احساس پیدا ہوا۔ اس کے چہرے پر ایک سکون کا احساس نمایاں ہوا۔

''ناصر مرزا تم بیڈ چھوڑ کر ادھر کرسی پر آ جاؤ۔''

ساحل عمر نے بیڈ کے نزدیک ایک کرسی رکھتے ہوئے کہا۔ ناصر مرزا نے فوراً ہی اس کی طرف ہاتھ بڑھا دیا اور پھر وہ سہارا لے کر اس پر بیٹھ گیا۔ چوبیس گھنٹے میں اس کی حالت کیا سے کیا ہو گئی تھی۔ اس کے چہرے پر زردی کھنڈی تھی اور ہاتھوں میں لرزش آ گئی تھی۔ کمزور اتنا ہو گیا تھا کہ بغیر سہارے کے اٹھنا مشکل تھا۔

''ذاکر یہ بستر اچھی طرح جھاڑنا ہے۔'' ساحل عمر نے ذاکر کی طرف دیکھا۔ ''ایسا کرو اس بستر کی ہر چیز اٹھا کر دوبارہ بچھاؤ۔''

''جی اچھا۔'' ذاکر نے ساحل عمر کی ہدایت کے مطابق فوراً ہی عمل شروع کر دیا۔

پھر زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا پڑا۔ تکیے سے غلاف اتارتے ہی مطلوبہ چیز سامنے آ گئی۔ وہ کسی خونخوار پرندے کا کٹا ہوا پنجہ تھا۔

اس پنجے کو دیکھتے ہی ساحل عمر کی آنکھوں میں چمک آ گئی۔ اس نے اسے فوراً بستر سے اٹھا لیا اور اسے اپنی آنکھوں کے سامنے کر کے غور سے دیکھنے لگا۔

''ساحل یہ کیا ہے؟'' ناصر مرزا نے پرتجسس نظروں سے دیکھا۔

''یہ وہ چیز ہے جس نے تمہارے پورے جسم پر کھرونچے بنا دیئے تھے۔'' ساحل عمر نے کہا۔ ''میں اب چھت پر جا رہا ہوں۔ مجھے ایک ماچس دے دو اور دیکھو ذاکر میں جب تک چھت پر رہوں اوپر کوئی نہ آئے۔ ناصر مرزا تم بھی نہیں۔''

''اوپر کیا ہے؟'' ناصر مرزا نے پوچھا۔

''اوپر فساد کی جڑ ہے...... اسے نیست و نابود کر آؤں۔ پھر آ کر پوری تفصیل بتاؤں گا۔'' ساحل عمر نے کہا۔

پھر اس نے اس پنجے کو کوٹ کی جیب میں ڈالا اور ماچس ہاتھ میں لے کر زینہ چڑھنے لگا۔ زینہ چڑھتے ہوئے یکلخت اس کے دل کی دھڑکن تیز ہوئی۔ ایک خوف کی سی لہر اس کے پورے جسم سے گزر گئی۔

وہ ایک کھلی ہوئی چھت تھی۔ پانی کی ٹینکی کے علاوہ چھت پر کچھ اور نہیں بنا تھا۔ یہ چھت پانچ فٹ بلند چار دیواری سے گھری ہوئی تھی۔ پانی کی ٹینکی تھوڑی سی اونچائی پر بنی تھی لیکن اتنی اونچی نہ تھی کہ اس پر چڑھا نہ جا سکے۔

ٹینکی پر چڑھنے سے پہلے اس نے اپنے کوٹ اور پینٹ کی جیبوں میں ٹہلتے ہوئے سوکھے

پتے نکال کر ایک کونے میں جمع کئے۔ ان پتوں کے ڈھیر پر باز کا پنجہ رکھا اور پھر وہ ٹینکی پر چڑھ گیا۔
سامنے ہی فساد کی جڑ موجود تھی۔ وہ ایک مردانہ موی مجسمہ تھا۔ سات آٹھ انچ لمبا رہا ہو گا۔ اس نے حافظ موسیٰ کی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے اس پر تین بار پڑھ کر کچھ پھونکا اور پھر اس مجسمے کو نیچے اتار لایا۔ اس مجسمے کو ہاتھ میں لیتے ہی اس کے دل کی دھڑکن ایک مرتبہ پھر تیز ہو گئی۔
اس نے اس موی مجسمے کو غور سے دیکھا۔ اس مجسمے کے سر اور بائیں جانب سینے میں دو سوئیاں گھسی ہوئی تھیں۔ ساحل عمر نے کچھ پڑھتے ہوئے ان سوئیوں کو اس موی مجسمے سے نکالا۔ سوئیاں نکالتے ہی ایک دلخراش نسوانی چیخ گونجی۔ اسے ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی بہت نزدیک ہی چیخا ہو۔ ساحل عمر نے گھبرا کر چاروں طرف دیکھا لیکن آس پاس کچھ نہ تھا۔
پھر ساحل عمر اس موی مجسمے کو لے کر اس کونے کی طرف بڑھا جہاں سوکھے پتے ڈھیر تھے۔ اس نے ان سوکھے پتوں میں سے کچھ پتے الگ کر لئے اور اس موی مجسمے کے ساتھ رکھ دیئے۔ پھر اس نے ماچس سے تین تیلیاں نکالیں۔ ان پر کچھ پڑھ کر پھونکا اور ایک تیلی سلگا کر پتوں میں آگ لگا دی۔ اس کے بعد اس نے باقی تیلیاں بھی جلا کر مختلف زاویوں سے پتوں میں رکھ دیں۔ آگ بہت تیزی سے بھڑک اٹھی۔ آگ بھڑکتے ہی پھر نسوانی چیخ کی آواز آئی اور وہ موی مجسمہ پتوں پر اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ یہ منظر دیکھ کر ساحل عمر ایک دم پیچھے ہٹا۔ اسے شبہ ہوا کہ کہیں وہ موی مجسمہ اس پر اچھل کر نہ آ گرے...... لیکن ایسا نہیں ہوا۔ وہ مجسمہ اٹھتے ہی ایک دم پگھل گیا۔
اب ساحل عمر نے جو سوکھے پتے ایک طرف بچا کر رکھے تھے ان میں سے دو دو پتے اٹھا کر جلتی آگ پر ڈالنے شروع کئے۔ پتا پھینکنے سے پہلے کچھ پڑھتا پھر اسے آگ میں جھونک کر مزید کچھ پڑھتا۔
اس موی مجسمے سے شدید بدبو آ رہی تھی۔ بدبو اتنی شدید تھی کہ ساحل عمر کو اپنی جیب سے رومال نکال کر ناک پر باندھنا پڑا۔ بہرحال اس نے اس موی مجسمے اور اس باز کے پنجے کو اچھی طرح جلا دیا۔
پھر وہ نیچے جا کر ایک پلاسٹک کا لوٹا لایا۔ لوٹا لاتے ہوئے ذاکر سے کہہ آیا کہ گھر کے پیچھے کسی کیاری میں اتنا بڑا گڑھا کھودے کہ اس میں پلاسٹک کا لوٹا سما جائے۔ چھت پر آ کر اس نے بڑی احتیاط سے اس میں جلی راکھ بھری۔ اس لوٹے کے منہ پر کالا کپڑا باندھا اور ذاکر کے کھودے ہوئے گڑھے میں اسے رکھ کر پڑھ پڑھ کر مٹھیوں سے مٹی ڈالنا شروع کی۔ یہاں تک کہ وہ گڑھا پر ہو گیا۔ ساحل عمر نے کھرپی کے ذریعے زمین ہموار کر کے اس پر پڑھا ہوا پانی چھڑک دیا اور اللہ کا شکر ادا کیا ہر کام حافظ موسیٰ کی عین ہدایت کے مطابق ہو گیا تھا۔
جب وہ اس موی مجسمے کا ''کریا کرم'' کر کے ناصر مرزا کے کمرے میں پہنچا تو وہاں پورا گھر اکٹھا تھا۔ ناصر مرزا کے بڑے بھائی بھی آ چکے تھے جن کی بیٹی کو برکھا نے بے دردی سے قتل کر دیا تھا۔ سب اس کی آمد کے منتظر تھے۔ ساحل عمر بڑے اطمینان سے چلتا ہوا اندر آیا۔ اس نے ناصر مرزا کے چہرے کو بغور دیکھا اور مسکرا کر پوچھا۔ ''کیسے ہو؟''

''بالکل ٹھیک۔'' اس نے بیڈ سے اٹھتے ہوئے کہا۔
''لیٹے رہو......'' ساحل عمر نے کہا۔ پھر پوچھا۔ ''اب جسم پر ناخنوں کے نشان تو نہیں بن رہے۔''
''نہیں۔'' ناصر مرزا نے خوش ہو کر کہا۔ ''نہ صرف نشان نہیں بن رہے بلکہ وہ نشان بھی غائب ہو گئے۔''
''ساحل عمر کچھ بتاؤ تو اوپر کیا تھا۔'' اس بار ناصر مرزا کی امی مخاطب ہوئیں۔
''بس امی جو بھی تھا اسے بھول جائیں...... میں اسے دفن کر آیا ہوں۔ بس یوں سمجھ لیں امی کہ آپ کے بیٹے کو دوسری زندگی ملی ہے۔ ورنہ اس سور کی بچی نے تو مارنے کی کوئی کسر نہ چھوڑی تھی۔'' ساحل عمر نے غصے میں کہا۔
''وہ کم بخت مرتی بھی تو نہیں...... آخر اسے کون مارے گا؟'' امی نے غصے اور دکھ کے عالم میں کہا۔
''امی! اسے اس کے اعمال ماریں گے۔ اب ظلم حد سے گزرنے لگا ہے۔ آپ جانتی ہیں کہ جب ظلم بڑھتا ہے تو مٹ جاتا ہے۔'' ساحل عمر نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔
پھر اس نے کمرے سے بچوں کو نکال کر چھت پر ہونے والی کارروائی کی تفصیل بیان کی۔ موی مجسمے کے بارے میں سن کر سب حیران رہ گئے۔

☆......☆......☆

رقص سحر جاری تھا۔ ورشا کو جنونی کیفیت میں رقص کرتے ہوئے ایک گھنٹہ ہو گیا تھا۔ وہ رقص کے ساتھ ایک خاص انداز میں پیر مارتی اور منہ سے کوئی عجیب سا لفظ نکالتی تھی۔ یہی وہ لفظ تھا جو کالی داس نے اسے بتایا تھا۔ یہ لفظ سحر کی کنجی تھا جس کے ذریعے وحشت کا تالا کھلتا تھا۔
رقص کرتے کرتے اس کے ہاتھ کی انگلی کالی ہونے لگی اور دیکھتے ہی دیکھتے یہ سیاہی پورے جسم پر پھیل گئی۔ گوری چٹی ورشا ایک دم کالی بھجنگ ہو گئی تھی۔ آنکھوں میں آگ بھر گئی تھی۔ صورت انتہائی مکروہ ہو گئی تھی۔ ایک فٹ لمبی زبان باہر نکل آئی تھی۔
پھر کمرے کے ہر کونے سے بچھوؤں نے برآمد ہونا شروع کیا اور چند لمحوں میں اتنے بچھو کمرے میں بھر گئے کہ کمرے کے فرش پر تل دھرنے کی جگہ نہ رہی۔ ورشا اب بھی محو رقص تھی۔ رقص وحشت جاری تھا جو جنون کی حدوں کو چھو رہا تھا۔ بچھو اس کے پیروں میں آ رہے تھے لیکن دب کوئی نہیں رہا تھا۔ مر کوئی نہیں رہا تھا۔
چند لمحوں بعد ایک مکروہ آواز گونجی۔ ''اب بس کر۔''
اس حکم کو سنتے ہی ورشا ایک دم پتھر کی ہو گئی۔ کچھ دیر وہ اسی طرح ساکت کھڑی رہی۔ اتنی دیر میں سارے بچھو کہیں غائب ہو گئے۔
کالی داس نے اسے جو سکھایا تھا وہ اس پر حرف بہ حرف عمل کر رہی تھی۔ رقص بند کرنے کا حکم ہو چکا تھا۔ بچھو غائب ہو چکے تھے۔ اب وقت تھا خون سے پیالہ بھرنے کا۔ وہ فوراً آئینے کے

سامنے جا کھڑی ہوئی۔ اس نے اپنی قمیض کی پیچھے سے زپ کھولی۔ پیٹھ پر بنا بچھو نمایاں ہو گیا۔ اس کی کالی جلد پر اب وہ سفید نظر آ رہا تھا۔ ڈریسنگ ٹیبل پر رکھی ہوئی سرنج اٹھا کر اس کی سوئی بچھو کے منہ پر رکھی گئی تو اس نے جلدی جلدی سرنج بھر بھر کر خون پیالے میں جمع کرنا شروع کیا یہاں تک کہ پیالہ خون سے لبالب بھر گیا۔

اس نے اپنی قمیض کی زپ بند کی اور اس خون سے بھرے پیالے کو اپنے سامنے رکھ کر بیٹھ گئی۔ پھر اس نے جان لیوا آخری منتر پڑھنا شروع کیا۔ وہ جیسے جیسے منتر پڑھتی جاتی تھی ویسے ویسے اس کی رنگت تبدیل ہوتی جاتی تھی پھر ایک وقت ایسا آیا کہ وہ اپنی اصل حالت میں آ گئی۔

اپنی اصل حالت میں لوٹتے ہی اس پر سرشاری سی چھا گئی۔ وہ کھل اٹھی۔ اس کی خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی۔ اس کے نانا نے جو بتایا تھا جو سکھایا تھا اس پر عمل کر کے اس نے اپنی منزل پا لی تھی۔

اس نے زمین سے خون سے بھرا پیالہ اٹھایا اور آئینے کے سامنے خود کو دیکھا اور بڑے فاتحانہ انداز میں مسکرائی۔ پھر وہ اپنے کمرے کا دروازہ کھول کر باہر نکل آئی۔

وہ احتیاط سے چلتی ہوئی اس کمرے کے دروازے پر پہنچی جہاں برکھا عمل میں مصروف تھی۔

ورشا نے خون سے بھرا پیالہ برآمدے میں ایک طرف رکھ دیا اور پھر بہت آہستگی سے دروازے کی طرف بڑھی۔ دروازہ کھلا ہوا تھا۔ برکھا کی دروازے کی طرف پیٹھ تھی۔ وہ کمرے کے درمیان میں آسن جمائے بیٹھی تھی۔ اس کے سامنے دائرے میں سات دیئے جل رہے تھے اور ان دیوں کے درمیان راعین کی کھوپڑی رکھی تھی۔ برکھا بہت زور زور سے کوئی منتر پڑھ رہی تھی۔ اسے اپنا ہوش نہ تھا۔

ورشا چاہتی تو خاموشی سے اس کے سر پر پہنچ سکتی تھی لیکن کالی داس نے اسے سمجھایا تھا کہ وہ منتر والے کمرے میں جانے کی کوشش نہ کرے ورنہ پچھتاوے کے سوا کچھ ہاتھ نہ آئے گا۔

رات گہری ہوتی جا رہی تھی۔ یہ فیصلے کی رات تھی۔ ورشا کو فکر تھی کہ کہیں برکھا کا عمل پورا نہ ہو جائے جو کرنا ہے عمل پورا ہونے سے پہلے کرنا ہے۔

سوال یہ تھا کہ وہ برکھا کو کمرے سے کیسے نکالے۔ وہ اندر جا نہیں سکتی تھی اور برکھا عمل پورا ہونے سے پہلے کمرے سے نکلے گی نہیں۔ وہ برآمدے میں کھڑی سوچتی رہی۔ اندھیری رات تھی۔ پورے بنگلے پر خوفناک وحشت چھائی ہوئی تھی۔ کتوں کے رونے کی آواز نے ماحول کو اور بھیانک بنا دیا تھا۔

سوچتے سوچتے اچانک ایک خیال اس کے دل میں جگمگایا۔ یہ خیال ایسا تھا کہ وہ ایک دم سرشار ہو گئی۔ اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ یہ خیال اس کے دماغ میں کیسے آیا لیکن یہ خیال بڑا زبردست تھا۔

اس نے ایک عزم، ایک حوصلے کے ساتھ خون سے بھرا پیالہ اٹھایا اور دروازے کے ساتھ دیوار کی اوٹ میں چھپ کر اس نے بڑی خوفزدہ آواز میں کہا۔ ''ممی، ممی...... وہ اندھا آ گیا۔''

برکھا نے منتر پڑھتے پڑھتے گردن گھمائی اور ہاتھ نچایا۔ جس کا مطلب تھا کہ کون اندھا؟

''ممی' وہ حافظ موسیٰ ہمارے بنگلے میں آ گیا ہے۔ اس کے ساتھ ساحل عمر اور ناصر مرزا بھی ہیں۔'' وہ گھبرا کر بولی۔

''ہیں۔'' وہ گھبرا کر اٹھی۔ حافظ موسیٰ' ساحل عمر اور ناصر مرزا کے نام سن کر اس کے چھکے چھوٹ گئے تھے۔ یہ کیسے ہو گیا۔ سب سے زیادہ گھبراہٹ تو حافظ موسیٰ کا نام سن کر ہوئی تھی۔ وہ کیسے آ گیا؟''

وہ وحشت زدہ ہو کر کمرے سے باہر نکلی بس اتنی مہلت ورشا کیلئے کافی تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ پلٹ کر ورشا کی طرف دیکھتی ورشا نے بجلی کی سی سرعت سے خون سے بھرا پیالہ اس کے سر پر الٹ دیا اور خود بہت تیزی سے پیچھے ہٹ گئی۔

''اوہ' کمینی تو نے یہ کیا کیا؟'' وہ غصے سے چیخی لیکن اس سے زیادہ وہ کچھ اور کہنے کے قابل نہ رہی۔

وہ خون میں نہا گئی تھی۔ سر پڑ دائیں بائیں آگے پیچھے ہر طرف خون ہی خون تھا۔ اس خون نے کسی خطرناک تیزاب کی طرح کام دکھایا۔ خون پڑتے ہی اس کی دونوں آنکھیں ضائع ہو گئیں۔ جہاں جہاں خون پڑا وہاں کی کھال اترنا شروع ہو گئی۔ وہ اپنے پاؤں پر کھڑی نہ رہ سکی۔ نڈھال ہو کر زمین پر گر پڑی۔ وہ آدھی دروازے میں تھی اور آدھی دروازے کے باہر تھی۔

ورشا نے اس کے گرتے ہی خوشی سے قہقہہ لگایا۔

''جاؤ ممی جاؤ...... تم نے اپنے باپ کو مارا' پھر اپنے شوہر کو مارا اور اب میرے ساحل کو مارنے چلی تھیں۔ ممی وہ میری محبت ہے' میرا عشق ہے۔ میں اسے کیسے مرنے دیتی۔''

پھر اچانک جانے کیسے جاپ والے کمرے میں آگ بھڑک اٹھی۔ شعلے لپکتے ہوئے برکھا کی طرف بڑھے۔ وہ تو ویسے ہی چل بسی تھی۔ جو رہا سہا تھا وہ شعلوں کی لپیٹ میں آ گیا۔ اس منتر والے کمرے کے ساتھ اور کئی کمرے آگ کی لپیٹ میں آ گئے۔ اس آگ کو دیکھ کر ورشا کے قہقہے گونجتے رہے۔ وہ جیسے پاگل ہو گئی تھی۔

جانے یہ کیسی آگ تھی کہ فائر بریگیڈ والے بھی اسے نہ بجھا سکے۔ وہ جتنا پانی ڈالتے اتنے شعلے مزید اونچے ہو جاتے۔ تب انہوں نے تھک کر پانی ڈالنا بند کر دیا۔ بالآخر یہ آگ خود ہی بجھ گئی۔ لیکن آدھا بنگلہ جل کر خاک ہو چکا تھا۔ پہلے اس بنگلے پر کیا کم وحشت برستی تھی کہ اس ادھ جلے بنگلے نے اس وحشت کو دوبالا کر دیا۔ اب یہ بنگلہ بھوتوں کا بدروحوں کا مسکن لگتا تھا۔ لوگ اس بنگلے کی طرف نظر اٹھا کر دیکھتے ہوئے بھی ڈرتے تھے۔

لیکن ورشا اب بھی اسی بنگلے میں رہتی تھی۔ وہ اس بنگلے میں گھومتی ہوئی کسی بھٹکی ہوئی روح کی طرح دکھائی دیتی تھی۔ وہ واقعی بھٹک گئی تھی۔

☆......☆......☆

اب اس کی زندگی میں کچھ سکون آیا تھا۔ جینے کا مزہ آنے لگا تھا' ورنہ ساحل عمر کی زندگی میں پے در پے پریشانیوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ بچپن سے لیکر آج تک اس کی زندگی میں حادثات ہی

حادثات تھے۔ برکھا کی موت کے بعد اس کی زندگی میں استحکام آیا۔ سکون میسر آیا تو اماں نے رخت سفر باندھ لیا۔

اماں کی موت ساحل عمر کیلئے کسی سانحہ سے کم نہ تھی۔

انہیں شاید اپنی موت کا احساس ہو گیا تھا۔ جانے سے پہلے انہوں نے اپنی الماری خالی کر دی تھی۔ اپنے بیشتر کپڑے مرجینا کے حوالے کر دیئے تھے۔ جو نقد رقم ان کے پاس جمع تھی۔ وہ انہوں نے عذرا کے حوالے کر دی تھی۔

کئی دن سے ان کے خواب میں والدین نظر آ رہے تھے۔ کبھی اماں دکھائی دیتیں تو کبھی والد نظر آتے۔ وہ دونوں کو خوش دیکھتیں۔ انہیں اپنی والدہ گھر کی صفائی کرتی نظر آتیں تو والد گھر میں سودا سلف لاتے ہوئے دکھائی دیتے۔ ان دونوں کو دیکھ کر یہ احساس ہوتا وہ کسی مہمان کے منتظر ہوں۔ جیسے ان کے گھر کوئی مہمان آ رہا ہو۔

اماں کو جب سے ان کے والدین خواب میں دکھائی دیئے تھے تب سے ان کی یاد شدت اختیار کر گئی تھی۔ وہ عذرا سے اپنے بچپن اور جوانی کی باتیں کرنے بیٹھ جاتیں۔

پھر انتقال سے چند گھنٹے قبل اماں نے آواز دے کر ساحل عمر کو اپنے کمرے میں بلایا۔ وہ اپنے بیڈ پر بیٹھی تھیں۔ ایک لمحے کو وہ انہیں دیکھ کر پریشان ہوا۔ اس نے گھبرا کر پوچھا۔ ''اماں آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے۔''

''ہاں، میں بالکل ٹھیک ہوں۔'' اماں نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے اسے اپنے پاس بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

''اماں، مجھے تو گڑبڑ دکھائی دے رہی ہے۔'' وہ ان کے قریب بیٹھا ہوا بولا۔

''اماں نے پہلے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا پھر اس کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں لے کر اسے تکتی رہیں پھر اس کی پیشانی چوم لی۔ ساحل عمر نے ان کی آنکھوں میں آنسو بھرے دیکھے۔ وہ ان کی بدلتی کیفیت کو خصوصی طور پر نوٹ کر رہا تھا۔

''اماں کیا ہوا؟'' ساحل عمر عجب کشمکش میں تھا۔ اس نے اماں کی ایسی حالت کبھی نہ دیکھی تھی۔ ''آپ کو کسی نے کچھ کہا ہے۔ عذرا نے گستاخی کی ہے یا مرجینا آپ کے منہ کو آئی ہے یا پھر مجھ سے نادانستگی میں کوئی قصور ہوا ہے۔''

''ارے بھیا...... کیسی باتیں کرتے ہو...... میں تو فرشتوں کے درمیان رہ رہی ہوں۔ میں نے اس وقت تمہیں کچھ باتیں کرنے کیلئے بلایا ہے۔ بیٹا بات یہ ہے کہ میرے پاس اب وقت کم ہے۔ نہیں ساحل اب تم بیچ میں بولنا مت۔ میری بات سن لو۔ میں چند گھڑی کی مہمان ہوں۔ میں جو کچھ محسوس کر رہی ہوں وہ بتا نہیں سکتی۔ جو بتا سکتی ہوں وہ کہے دیتی ہوں۔ بیٹا تمہاری امی ایک فرشتہ عورت تھی۔ اس نے ایک ایسی انجان عورت کو سہارا دیا تھا جو سڑک پر بیٹھی رو رہی تھی۔ بیٹا جب میں اپنے شوہر کے گھر سے نکلی تھی تو عہد کیا تھا کہ اب اس گھر میں واپس نہیں آؤں گی۔ ساحل پھر میں نے زندگی بھر پلٹ کر نہیں دیکھا کہ میرا شوہر کس حال میں ہے۔ جب تمہاری امی نے مجھے سہارا دیا تو اس

وقت میں نے اپنے دل میں ایک اور عہد کیا کہ اس گھر سے اب مر کر نکلوں گی۔ اللہ کا شکر ہے کہ میرا یہ عہد بھی پورا ہوا۔ تمہاری امی نے مجھے بہت عزت دی۔ میں تمہاری شکر گزار ہوں کہ تم نے مجھے اپنی امی سے بھی بڑھ کر احترام دیا۔ تم نے مجھے کبھی اس گھر کی ملازمہ نہیں سمجھا۔ تم نے مجھے اپنی ماں جیسا سمجھا۔ میں نے اس گھر میں ایک مطمئن زندگی گزاری ہے لیکن بیٹا میں انسان ہوں۔ مجھ سے کبھی کوئی کوتاہی ہو گئی ہو' کوئی غلطی ہو گئی ہو تو میرے بیٹے مجھے معاف کر دینا...... بس بیٹا مجھے اس سے زیادہ کچھ نہیں کہنا۔ اللہ تمہیں سدا خوش رکھے۔

''ارے اماں' یہ آپ کیا فضول باتیں لے بیٹھیں...... مرنے جینے کی باتیں کر کے مجھے ڈرائیں نہیں۔ اماں آپ چلی جائیں گی تو میرے بچوں کو کون کھلائے گا۔ وہ کس کو دادی کہیں گے۔'' ساحل عمران کا ہاتھ تھام کر بولا۔

اس کی بات سن کر اماں کے چہرے پر ایک ہلکی سی مسکراہٹ آئی۔ پھر اچانک ان کے چہرے کا رنگ بدلا اور وہ بے اختیار سسک سسک کر رو پڑیں۔ ساحل عمر نے بڑی مشکل سے انہیں چپ کرایا۔

ساحل عمر سے بات کرنے کے بعد انہوں نے پورے گھر کا ایک چکر لگایا۔ کچھ دیر عذرا سے ادھر ادھر کی باتیں کیں۔ اسے ہمیشہ ساحل عمر کا خیال رکھنے کی تلقین کی پھر مرجینا سے گپ شپ لگائی اور پھر سو گئیں۔

عصر کے وقت اٹھیں۔ نماز پڑھنے کھڑی ہوئیں۔ سجدے میں گئیں تو پھر سر اوپر نہ اٹھ سکا۔ یہ سجدہ ان کی زندگی کا آخری سجدہ ثابت ہوا۔

اماں کی موت ساحل عمر کیلئے کسی سانحہ سے کم نہ تھی۔ اس نے انہیں بچپن سے دیکھا تھا۔ وہ ان کا عادی ہو گیا تھا۔ ان کی یاد اس کے دل سے نکلنا آسان نہ تھی۔

☆......☆......☆

ابھی اماں کا غم اس کے دل سے پوری طرح نکلا نہ تھا کہ اس کی زندگی میں ایک اور سانحہ رونما ہوا اور یہ سانحہ بڑا جان لیوا تھا۔

عذرا جب سے ساحل عمر کے ساتھ آئی تھی بے انتہا خوش تھی۔ بس بیچ میں برکھا نے کچھ حالات خراب کر دیئے تھے تو وہ اداس رہنے لگی تھی لیکن جب سے برکھا جہنم رسید ہوئی تھی عذرا کے دل کی کلی پھر سے کھل اٹھی تھی۔

وہ روز ہی شام کو کہیں گھومنے نکل جاتے تھے۔ کبھی سمندر پر' کبھی کسی ریستوران میں' کبھی فلم دیکھنے تو کبھی کسی کے گھر...... اس دن وہ سمندر کے کنارے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے ٹہل رہے تھے۔

عذرا کے چہرے سے خوشی پھوٹی پڑتی تھی۔ وہ بار بار ہنس رہی تھی۔ قہقہے لگا رہی تھی اور ساحل عمر اسے چونک کر دیکھ رہا تھا۔ اس کے اندر کہیں بہت دور ایک خوف کی سی لہر اٹھ رہی تھی۔

''عذرا خیر تو ہے...... آج تم کچھ ضرورت سے زیادہ خوش نہیں؟'' بالآخر اس نے اپنا اندیشہ ظاہر کر دیا۔

"ہاں ساحل...... آج میں واقعی بہت خوش ہوں' ضرورت سے زیادہ خوش ہوں۔ میں بار بار سوچتی ہوں اور سوچ سوچ کر خوش ہو جاتی ہوں۔"

"آخر اس خوشی کی کوئی وجہ تو ہو گی۔" ساحل عمر نے پوچھا۔

"تم ہو وجہ؟" ساحل تم...... میرے خواب تم...... میں کتنی خوش قسمت ہوں کہ میں نے جس کے خواب دیکھے اسے پا لیا۔ ساحل ایسا کہاں ہوتا ہے بھلا...... اپنا آئیڈیل آج تک کون پا سکا ہے بھلا۔ میں کس قدر خوش نصیب ہوں کہ تمہیں دیکھا اور تمہیں پا لیا۔"

"بس اس وجہ سے خوش ہو...... یہ خوشی تو اب پرانی ہو گئی۔"

"ہاں ساحل میں بس اس وجہ سے خوش ہوں۔ میرے لئے یہ خوشی کبھی پرانی نہیں ہو گی۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کی اہمیت بڑھتی جائے گی۔ تم کیا جانو ساحل...... میں نے تمہیں کتنی مشکلوں سے پایا ہے۔" وہ اپنا سر اس کے کندھے پر رکھتے ہوئے بولی۔

"عذرا جانے کیا بات ہے کہ میں تمہیں جب بھی بہت زیادہ خوش دیکھتا ہوں تو میرے اندر کہیں دور ایک خوف کی سی لہر اٹھنے لگتی ہے۔ میں ڈر جاتا ہوں' شاید اس لئے کہ مجھے خوشی کبھی راس نہیں آتی۔ تمہیں یاد ہو گا مرنے سے دو تین دن پہلے اماں کتنی خوش تھیں۔ انہیں خوش دیکھ کر میرا دل بھی بہت خوش تھا۔ دیکھ لو وہ چل بسیں۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میرے والدین ہنستے مسکراتے گھر سے نکلے تھے' اس دن وہ کتنے خوش تھے۔ وہ پھر گھر نہ لوٹے۔ ان کی لاشیں آئیں...... عذرا اسی لئے میں اب خوشی سے ڈرنے لگا ہوں۔"

"بدھو۔" عذرا نے اس کی طرف دیکھ کر اتنے پیار سے کہا کہ ساحل عمر مسکرائے بغیر بنا نہ رہ سکا۔

وہ بدھو تھا یا عقل مند...... اس بات کا اسے اندازہ نہ ہو سکا لیکن وقت نے آنے والے وقت نے عذرا کے ساتھ عجب کھیل کھیلا۔ اس دن سمندر پر شاید وہ اس کے آخری قہقہے تھے۔ کچھ دنوں کے بعد اس کے گرد مایوسیوں نے ڈیرے ڈال لئے۔ اسے امید نہ تھی کہ یہ وقت اس پر جلد آ جائے گا۔ وہ اس بات سے تو آگاہ تھی کہ ایسا ہو گا۔ یہ وقت اس پر آ کر رہے گا۔ جب وہ اپنی بستی سے رخصت ہوئی تھی تو اس کے باپ سار ملوک نے اسے صاف صاف سمجھا دیا تھا۔ اسے بتا دیا تھا کہ ایک لمحہ وہ آئے گا جب وقت پتھر ہونے لگے گا اور جب وقت پتھر ہونے لگے تو اسے کیا کرنا ہو گا' یہ بھی سمجھا دیا تھا...... لیکن اس نے اپنے دل میں کچھ اور ہی ٹھان لی تھی۔

جب وقت نے آنکھیں دکھانا شروع کیں تو ایک دن اچانک اس کی نظر اپنے ہاتھوں کے ناخنوں پر پڑی۔ اس کی انگلیوں کے تمام ناخن سفید پڑ چکے تھے۔ اپنے سفید ناخن دیکھ کر ایک دم اس کا دل کانپ اٹھا۔ وقت معلوم شروع ہو چکا تھا۔ وہ ان ناخنوں کو ساحل عمر سے چھپانے اور اپنے آپ کو فریب دینے کیلئے ہر وقت نیل پالش لگانے لگی۔

چند ہفتے اور گزرے تو اس کی انگلی کی ایک پور پر سفیدی نمودار ہوئی اور پھر یہ تیزی سے دوسری انگلیوں پر بھی دکھائی دینے لگی۔ چند دنوں کے اندر اس کی انگلیوں کی پہلی پوریں بالکل سفید ہو

گئیں۔ یوں محسوس ہونے لگا جیسے اس کی انگلیاں برص زدہ ہو گئی ہوں۔

ساحل عمر پریشان ہو کر اسے ایک ڈاکٹر کے پاس سے دوسرے ڈاکٹر کے پاس لئے گھومتا رہا۔ اس نے کوئی اچھا ڈاکٹر کوئی اچھا ہسپتال نہ چھوڑا۔ اس کے مرض کی کوئی تشخیص نہ کر سکا لیکن سارے ڈاکٹر اس بات پر متفق تھے کہ جلدی بیماری نہیں ہے۔

وہ عذرا کو لے کر حافظ موسیٰ کو دکھانے بھی پہنچا۔ ناصر مرزا اس کے ساتھ تھا مگر بار بار گھر کی گھنٹی بجانے کے باوجود کسی نے گیٹ نہ کھولا۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے گھر میں کوئی نہیں ہے۔ وہ مایوس ہو کر لوٹ آئے پھر ناصر مرزا نے اکیلے بھی حافظ موسیٰ کے گھر کے کئی چکر لگائے لیکن گھر کا کسی نے دروازہ نہ کھولا۔ اس نے سوچا ممکن ہے کال بیل خراب ہو یہ سوچ کر زور زور سے گیٹ بجایا مگر باہر کوئی نہ آیا۔ پاس پڑوس سے معلوم کیا تو وہ لوگ بھی اطمینان بخش جواب نہ دے سکے۔ کسی کو ان کے بارے میں کچھ معلوم نہ تھا۔

وقت تیزی سے کروٹ لے رہا تھا۔ اب عذرا کا پورا ہاتھ سفید ہو چکا تھا۔ اس نے دونوں ہاتھوں میں دستانے پہننے شروع کئے تھے لیکن پھر وہ ان دستانوں کو مستقل پہنے رکھنے کیلئے مجبور ہو گئی۔ اس لئے کہ اس کی انگلیاں جس نرم چیز کو بھی چھو لیتیں وہ سخت ہو جاتی۔ پتھر بن جاتی۔

ساحل عمر کیلئے یہ دن بڑے عذاب ناک تھے۔ عذرا اب اپنے بیڈ روم تک محدود ہو کر رہ گئی۔ اس کے ہاتھوں کی سفیدی اب ہاتھوں تک محدود نہ رہی تھی۔ اس نے اب پورے جسم کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا اور یہ سفیدی بڑھتی ہی جاتی تھی۔ صورتحال روز بہ روز خراب ہوتی جا رہی تھی۔

ایک شام جب وہ سرتاپا سفید ہو چکی تھی۔ اس نے ساحل عمر سے عجیب فرمائش کی۔ ''ساحل میں دلہن بننا چاہتی ہوں۔''

ساحل عمر نے اس کی یہ فرمائش فوری طور پر پوری کر دی۔ وہ جوڑا جو اس نے شادی پر پہنا تھا اسے پہنا دیا گیا۔ ساحل عمر نے اسے بہت محبت سے بہت توجہ سے دلہن بنایا۔ ایک لیڈی بیوٹیشن کو بلا کر اس کا میک اپ کروایا۔ کپڑے تبدیل کرنے سے لے کر میک اپ ہونے تک اس نے ساحل عمر کو اپنی آنکھوں سے اوجھل نہ ہونے دیا۔ وہ اسے ایک ٹک دیکھتی رہی جیسے آخری بار دیکھ رہی ہو۔

دونوں خاموش تھے۔ دونوں کے دلوں میں طوفان اٹھ رہے تھے۔ بہت کچھ تھا کہنے کو، بہت کچھ تھا سننے کو...... مگر کوئی نہیں بول رہا تھا۔ لفظ زبان پر آ کر جیسے دھواں بن جاتے۔ بس دونوں کے منہ سے ایک آہ نکلتی تھی۔

جب عذرا کے جسم میں جھٹکے سے لگنے لگے۔ اس کی آنکھیں ان جھٹکوں سے بند ہونے لگیں تو عذرا نے ساحل سے کہا۔ ''ساحل اپنے سٹوڈیو کا دروازہ کھول دو۔ میں وہاں جانا چاہتی ہوں۔''

''دروازہ کھلا ہے آؤ۔'' ساحل عمر نے سہارا دینے کیلئے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

اس کے سٹوڈیو میں پہنچ کر وہ کمرے کے بیچ سٹول ڈال کر بیٹھ گئی اور حتی الامکان مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے بولی۔ ''میری تصویر نہیں بناؤ گے؟'' عذرا کی آواز میں ایک عجیب درد تھا۔ جیسے اس نے اپنے آنسوؤں کو روکنے کی بھرپور کوشش کی ہو۔

"ہاں کیوں نہیں۔" ساحل عمر نے جلدی سے ایک بورڈ پر پنوں سے کاغذ کی شیٹ لگائی اور اس سے ذرا فاصلے پر بیٹھ کر اسے سکیچ کرنے لگا۔ پنسل سے کاغذ پر اس کے نقش ابھارنے لگا۔

وہ بار بار اسے دیکھتا جاتا تھا اور اسکیچ کرتا جاتا تھا۔ جب اس کی صورت کاغذ پر ابھرنے لگی تو اچانک اسے احساس ہوا کہ عذرا بہت دیر سے ساکت بیٹھی ہے۔ وہ ذرا سا بھی نہیں ہلی تھی۔ تب اس نے اس کی آنکھوں میں دیکھا پھر دیکھتا رہا۔ وہ اسے کئی منٹ تک دیکھتا رہا۔ عذرا اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ وہ بغیر پلکیں جھپکائے اسے دیکھے جا رہی تھی۔

وہ بورڈ اور پنسل ایک طرف پھینکتے ہوئے چیخا۔ "عذرا"

اس کی چیخ سننے کے باوجود عذرا ٹس سے مس نہ ہوئی۔ اس کی کھلی آنکھوں میں بھی کوئی حرکت نہ ہوئی۔ وہ اسے ساکت بیٹھی کھلی آنکھوں سے گھورتی رہی۔ وہ بیٹھے بیٹھے پتھر ہو گئی تھی۔

عذرا نے ساحل کے نام ایک خط لکھا تھا۔ یہ خط اس نے مرجینا کے حوالے کرتے ہوئے ہدایت کی تھی کہ وہ صبح ساحل عمر کو دے دے...... ساحل عمر سٹوڈیو میں موجود تھا۔ وہ پوری رات یونہی بیٹھا رہا تھا۔ وہ بس ایک ٹک عذرا کو دیکھے جاتا تھا۔ تب مرجینا نے دھیرے سے وہ گلابی رنگ کا بند لفافہ ساحل عمر کے سامنے کر دیا۔ ساحل عمر نے لفافہ چاک کر کے خط پڑھا لکھا تھا۔ "میری زندگی...... میرے ساحل...... میں وقت کا کھلونا ہوں، جس طرح کسی بولنے والی گڑیا کے سیل ختم ہونے پر وہ بولنا چھوڑ دیتی ہے کچھ ایسا ہی میرے ساتھ ہوا ہے۔ یوں سمجھ لو کہ میرے جسم میں لگے سیل بھی اب ختم ہو گئے ہیں۔ اور میں بے جان ہو گئی ہوں۔ میرے والدین مجھے لینے آئے تھے، وہ چاہتے تھے کہ میں ان کے ساتھ اپنی بستی میں چلی جاؤں اور اپنی زندگی بچا لوں لیکن ساحل میں نے ان کے ساتھ جانے سے انکار کر دیا۔ میں سب کچھ چھوڑ سکتی ہوں تمہیں نہیں چھوڑ سکتی۔ تمہاری خاطر میں نے اپنی زندگی ہار دی ہے لیکن یہ خوشی میرے لئے کیا کم ہے کہ میں ہر وقت تمہارے سامنے رہوں گی۔ تم مجھے دیکھو گے تو مجھے یوں محسوس ہو گا جیسے میں تمہیں دیکھ رہی ہوں۔ میں پتھر بن گئی ہوں لیکن ہوں تو تمہارے پاس، تمہارے گھر میں...... میں تمہارا شاہکار ہوں۔ ایک انوکھا مجسمہ...... ایسا انوکھا مجسمہ کسی نے آج تک کہاں تراشا ہو گا۔"

خط پڑھتے پڑھتے اس کے لفظ دھندلانے لگے۔ پھر خط اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر عذرا کے قدموں میں جا گرا۔

☆......☆......☆

کئی روز سے مسلسل ایسا ہو رہا تھا۔ وہ آتی...... بیل بجاتی...... مرجینا دروازہ کھولتی تو وہ آنکھیں اٹھا کر چند لمحے خاموشی سے اسے دیکھتی۔ پھر بڑے کرب آمیز لہجے میں کہتی۔ "پیاسی ہوں۔"

"اچھا ٹھہرو...... میں پانی لاتی ہوں۔"

جب مرجینا پانی سے بھرا گلاس لے کر دروازے پر جاتی تو وہ جا چکی ہوتی اور اگر کبھی ٹھہری بھی ہوئی ہوتی تو چند لمحے خالی نگاہوں سے گلاس کو دیکھتی اور بغیر کچھ کہے ایک طرف کو چل دیتی۔ مرجینا اسے حیرت سے دیکھتی رہ جاتی۔

جب کئی روز تک ایسا ہوتا رہا تو مرجینا نے اس انوکھی فقیرنی کے بارے میں ساحل عمر کو بتایا اور کہا۔ "صاحب جی پہلے تو وہ کبھی کبھی آتی تھی مگر اب تو وہ کئی دن سے روز آ رہی ہے۔"

"اچھا اب آئے تو مجھے بتانا۔" ساحل عمر نے اسے ہدایت کی۔

پھر اگلے دن گھنٹی بجی۔ مرجینا دوڑی ہوئی دروازے پر گئی۔ وہ دروازے پر موجود تھی۔ اس نے اسی کربناک لہجے میں کہا۔ "میں پیاسی ہوں۔"

"پانی لاتی ہوں...... تم ٹھہرو، دیکھو چلی مت جانا۔" مرجینا نے اسے تاکید کی۔

گھر میں آ کر مرجینا نے ساحل عمر کو بتایا کہ وہ دروازے پر موجود ہے۔ مرجینا نے ساحل عمر کے ہاتھ میں پانی سے بھرا گلاس دے دیا۔

ساحل عمر گلاس لے کر دروازے پر پہنچا۔ کالے کپڑے پہنے ایک عورت سر جھکائے کھڑی تھی۔ اس کے بال بے ترتیب تھے جیسے مہینوں سے نہ سنوارے گئے ہوں۔ کالا لباس سفید ہو رہا تھا جیسے ایک لمبے عرصے نہ دھویا گیا ہو۔ اچانک اس نے اپنا چہرہ اٹھایا۔ اس کے چہرے پر وحشت برس رہی تھی۔

ساحل عمر نے اسے غور سے دیکھا تو اندر ہی اندر لرز اٹھا۔ یہ وہ چہرہ تھا جسے کوئی ایک بار دیکھ لیتا تھا تو پھر پلکیں جھپکانا بھول جاتا تھا اور اب اسے ایک نظر دیکھنا مشکل تھا۔ وہ ورشا تھی......

"میرے رانجھن......" اس کے کانوں میں ایک آواز گونجی۔

ساحل عمر کو دیکھتے ہی وہ چیل کی طرح جھپٹی۔ اس کے دونوں ہاتھ پکڑ کر گلاس کو ذرا سا ٹیڑھا کر کے اسے اپنے ہونٹوں سے لگا لیا۔ اس نے بڑی بے قراری سے پانی پیا۔

پھر اس کی آنکھوں میں چمک آ گئی۔ اس کی آنکھوں کے دیئے ایک دم جگمگا اٹھے۔ وہ اسے ٹکٹکی باندھے دیکھتی رہی جیسے اپنی آنکھوں میں اس کی تصویر اتار لینا چاہتی ہو۔ پھر وہ ایک جھٹکے سے مڑی اور سڑک پر دوڑتی چلی گئی۔ ساحل عمر نے دیکھا وہ ننگے پاؤں تھی۔

وہ ورشا کو جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔

☆......☆......☆

اب اس واقعہ کو گزرے تین برس ہو چکے ہیں۔ عذرا کا مجسمہ اس کے سٹوڈیو میں اسی جگہ جوں کا توں موجود ہے۔

وہ آج بھی اس مجسمے کے سامنے بیٹھا اس کی تصویر بناتا رہتا ہے لیکن یہ تصویر آج تک مکمل نہیں ہوئی۔ تصویر مکمل کیسے ہو؟ وہ ادھوری تصویر بورڈ سے اتار کر جو ایک طرف ڈال دیتا تھا اور نیا کاغذ لگا کر پھر نئے سرے سے تصویر بنانے لگتا تھا۔

ناصر مرزا روز شام کو اس کے پاس آتا ہے۔ مسعود آفاقی بھی آتا رہتا ہے لیکن اپنی مصروفیت کی وجہ سے روز نہیں آ پاتا۔ وہ دونوں اسے اسٹوڈیو سے نکال لاتے ہیں اور زبردستی باہر لے جاتے ہیں۔

مرجینا اس گھر میں بدستور موجود ہے۔ اس کا باپ کئی بار اسے لینے آ چکا ہے۔ وہ اس کی

شادی کرنا چاہتا ہے لیکن مرجینا نے ساحل عمر کا گھر چھوڑنے سے انکار کر دیا ہے۔ وہ کہتی ہے کہ اگر میں بھی اس کے گھر سے چلی گئی تو صاحب جی جو پہلے ہی مرے ہوئے ہیں اکیلے کتنے دن زندہ رہیں گے۔ میں صاحب جی کو اکیلا نہیں چھوڑ سکتی۔ میں انہیں مرنے نہیں دوں گی۔

ناصر مرزا اور مسعود آفاقی نے کتنی مرتبہ کوشش کی ہے کہ وہ عذرا کے اس مجسمے کو یہاں سے ہٹانے کیلئے راضی ہو جائے۔ اسے زمین کے سپرد کرنے پر آمادہ ہو جائے...... لیکن وہ اس طرح کے ذکر پر بھی زور سے چیخ پڑتا ہے۔

"نہیں۔ میری عذرا کو مجھ سے کوئی جدا نہیں کر سکتا۔"

شاید اسے امید ہے کہ یہ موم کی گڑیا ایک دن خود بخود بول اٹھے گی۔

Urdufans.com

ختم شد

copied from web

copied from web

copied from web

the

end